ڈاکٹر منور حسین فلاحی

حیات و خدمات

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیاتِ نو دہلی

مدیر مسئول : سید راشد حامدی　　مدیر اعزازی : ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

مدیر معاون : محمد اسعد فلاحی

جلد۔۵ ، شمارہ ۔ ۱۱۔۱۲ | نومبر۔دسمبر ۲۰۲۰ء | ربیع الثانی۔جمادی الاولیٰ ۱۴۴۲ھ

ادارتی امور کے لیے رابطہ کریں: 9927206518,8287025094

ای میل: jareedahayatenau@gmail.com

فی شمارہ	:	اندرون ملک	۳۰/روپے
		بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
خصوصی شمارہ	:		۱۰۰روپے
سالانہ زر تعاون	:	اندرون ملک	۳۰۰/روپے
		بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	:	اندرون ملک	۵۰۰۰/روپے
		بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

مجلس ادارت

۱۔مولانا ظفر احمد اثری فلاحی، لندن
۲۔ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی، علی گڑھ
۳۔مولانا انعام اللہ فلاحی، دہلی
۴۔مولانا عبدالبر اثری فلاحی، ممبئی
۵۔مولانا انیس احمد فلاحی مدنی، جامعۃ الفلاح
۶۔امتیاز وحید فلاحی، کولکاتا
۷۔محمد انس فلاحی مدنی، ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی

ہمارے نمائندے

۱۔رضوان احمد فلاحی، لندن
۲۔موسیٰ کلیم فلاحی، متحدہ عرب امارات
۳۔حسن حبیب فلاحی، نیپال
۴۔فیاض احمد فلاحی، قطر
۵۔محمد سموئیل فلاحی، کویت
۶۔ڈاکٹر انعام اللہ فلاحی، سعودی عرب
۷۔ذوالقرنین حیدر فلاحی، ملیشیا

★ رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگوانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔

★ مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Hamdi ,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025.
Printed at: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Ziauddin Falahi**

نقوشِ حیات

عرض اولیں	ضیاء الدین ملک فلاحی	۷

تأثراتی مضامین اور علمی مقالات

ڈاکٹر منور حسین فلاحی: ایک جوان رفیق جوار رحمت میں پہنچا	سید جلال الدین عمری	۱۴
ڈاکٹر منور حسین: میرے استاد بھی اور شاگرد بھی	عبدالرحیم قدوائی	۱۸
وقت نے کس شبیہ کو خواب وخیال کر دیا	حسن رضا	۲۱
ڈاکٹر منور حسین فلاحی: ادارۂ تحقیق کے رفیق اور تحقیقات اسلامی کے معاون مدیر کی حیثیت سے	محمد رضی الاسلام ندوی	۲۵
اردو میں علمی نثر-ایک مطالعہ	ابوسفیان اصلاحی	۳۲
اردو میں علمی نثر کا مسئلہ	امتیاز احمد	۴۳
ڈاکٹر منور حسین کی کتاب 'اردو میں علمی نثر' پر ایک نظر	ظفر دارک قاسمی	۴۹
ڈاکٹر منور حسین فلاحی۔ ایک غم خوار رفیق، مہربان بھائی	ایاز احمد اصلاحی	۵۷
کل من علیھا فان	خالد حیدر	۷۶
حسرت ان غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے	جمشید احمد ندوی	۸۸
ڈاکٹر منور حسین فلاحی مرحوم	ظفر احمد اثری	۱۰۰
ڈاکٹر منور حسین فلاحی۔ چند تأثرات	رضوان احمد فلاحی	۱۰۳
ڈاکٹر منور حسین فلاحی۔ چند یادیں	انعام اللہ فلاحی	۱۰۶

منور بھائی۔ کچھ یادیں	اشہد رفیق ندوی	۱۱۱
میرے منور بھائی!	محمد عرفان	۱۱۴
منور حسین فلاحی۔ چند یادیں چند باتیں	عبدالحق فلاحی	۱۱۷
ڈاکٹر منور حسین فلاحی: یادوں کی بہاریں	محمد اسماعیل فلاحی	۱۳۸
ڈاکٹر منور حسین فلاحی مرحوم	محمد نہال الدین فلاحی	۱۴۹
مولوی چراغ علی کی بازیافت	امتیاز وحید	۱۵۸
مولوی چراغ علی کی علمی خدمات: از ڈاکٹر منور حسین فلاحی	محمد غطریف شہباز ندوی	۱۶۷
یادوں کے نقوش: منور حسین فلاحی	شفیق الرحمٰن	۱۷۳
ڈاکٹر منور حسین۔ چند باتیں، چند یادیں	جاوید اختر علی آبادی	۱۷۷
علی گڑھ میگزین (۸۶-۱۹۸۵ء) کی یاد میں	سید شہاب الدین	۱۸۱
برادر اکبر منور حسین۔ رفتید و لے نہ از دل ما	نوشاد عالم فلاحی	۱۸۸
مولانا منور حسین فلاحی	سکندر علی اصلاحی	۱۹۱
ڈاکٹر منور حسین فلاحی کے بعض تراجم وتبصرے	محمد کمال اختر قاسمی	۱۹۵
ڈاکٹر منور حسین اور ان کے اداریے	عبید اقبال عاصم	۱۹۹
ماہنامہ رفیق منزل کے پہلے مدیر منور حسین فلاحی	ابوالاعلی سید سبحانی	۲۰۶
ڈاکٹر منور حسین عالم باعمل انسان تھے	محمد عمر فلاحی	۲۲۴
منور حسین فلاحی۔ ایک ملنسار اور مخلص انسان	سید عبدالرحیم قریشی	۲۲۶
ڈاکٹر منور حسین کا نقد وادب	ضیاء الدین ملک فلاحی	۲۲۸

انٹر ویو

مولانا منور حسینؒ فروتنی اور علمی وجاہت کے پیکر تھے	ارشد اجمل	۲۴۵
ڈاکٹر منور حسینؒ کو دیکھ کر میں نے جماعت کی رکنیت اختیار کی	محمد ادریس	۲۵۰

تعزیت نامے

منور حسین فلاحی کی رحلت پر صدر تنظیم کا تعزیتی بیان	سید سعادت اللہ حسینی	۲۵۵
ڈاکٹر منور حسین فلاحیؒ کا حادثہ جانکاہ	انیس احمد فلاحی مدنی	۲۵۶
تعزیتی قرارداد بموقع انتقال منور حسین	شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی	۲۵۸
خطوط و تأثرات		۲۶۰

منتخبات

[نگارشات ڈاکٹر منور حسین فلاحی کے چند نمونے]

انسان کی حقیقت	ڈاکٹر منور حسین فلاحی	۲۸۰
رشید احمد صدیقی کی تنقیدِ اقبال	ڈاکٹر منور حسین فلاحی	۲۸۷
اداریہ ماہ نامہ رفیق منزل، اگست ۱۹۸۸ء	ڈاکٹر منور حسین فلاحی	۲۹۸
لوحِ ایام: مختار مسعود	ڈاکٹر منور حسین فلاحی	۲۹۹
مجھے ہے حکمِ اذاں	ڈاکٹر منور حسین فلاحی	۳۰۵
حیات نامہ ڈاکٹر منور حسین فلاحی	ادارہ	۳۰۸

مقالہ نگاران

۱-مولانا سید جلال الدین عمری، صدر شریعہ کونسل وسابق امیر جماعت اسلامی ہند

۲- پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، پروفیسر اور ڈائرکٹر کے اے نظامی مرکز علوم القران مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۳- ڈاکٹر حسن رضا، چیرمین اسلامی اکیڈمی، نئی دہلی ورکن مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند

۴- ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، مرکزی سکریٹری شعبۂ اسلامی معاشرہ، جماعت اسلامی ہند

۵۔ پروفیسر ابوسفیان، پروفیسر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۶۔ ڈاکٹر امتیاز احمد، ایسوسی ایٹ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۷- ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی، شعبہ دینیات سنی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۸- ڈاکٹر ایاز احمد اصلاحی، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ عربی لکھنؤ یونی ورسٹی، لکھنؤ

۹- ڈاکٹر خالد حیدر، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

۱۰- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی، شعبۂ عربی، یونیورسٹی آف ممبئی ممبئی

۱۱۔ مولانا ظفر احمد اثری، اسلامک دعوہ سینٹر، یو کے اسلامک مشن، برطانیہ

۱۲- جناب رضوان احمد فلاحی، مقیم حال لندن

۱۳- مولانا انعام اللہ فلاحی، سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح وسابق صدر مدرس جامعہ مصباح العلوم

۱۴۔ مولانا اشہد رفیق ندوی، استاد عربی سید حامد سینئر سکنڈری اسکول اے ایم یو، سکریٹری ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۱۵- جناب محمد عرفان، جنرل منیجر منولی فلو کنکٹو ایم ای، دبئی، متحدہ عرب امارات

۱۶- مولانا عبدالحق فلاحی، سابق معاون مدیر ماہ نامہ زندگی نو، نئی دہلی

۱۷- مولانا محمد اسماعیل فلاحی، مقیم علی گڑھ، سابق شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح، واستاد تفسیر وادب اسلامی اکیڈمی دہلی

۱۸- ڈاکٹر محمد نہال الدین فلاحی، اردو ٹیچر عائشہ ترین موڈرن پبلک اسکول، علی گڑھ

۱۹۔ ڈاکٹر امتیاز وحید، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی، کولکاتہ

۲۰- ڈاکٹر محمد غطریف شہباز فلاحی ندوی، ریسرچ ایسوسی ایٹ مرکز فروغ تعلیم وثقافت مسلمانان ہند علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۱- جناب شفیق الرحمٰن، سابق ایڈیٹر سہ روزہ دعوت نئی دہلی
۲۲- جناب جاوید اختر علی آبادی، ایچ او ڈی نیو انڈین ماڈل اسکول، دبئی
۲۳- جناب سید شہاب الدین، چیر پرسن گلوبل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، سیوان
۲۴- ڈاکٹر نوشاد عالم فلاحی، پرنسپل پیر پور سارو جنگ کالج، متو پور اعظم گڑھ، یوپی
۲۵- ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی، مدیر سہ ماہی دعوت القرآن لکھنؤ
۲۶- مولانا محمد کمال اختر قاسمی، رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ
۲۷- جناب عبید اقبال عاصم، وادئ اسماعیل، نزد مسجد ابراہیم، دوہرا معافی، علی گڑھ
۲۸۔ ابوالاعلی سید سبحانی، سابق مدیر حیاتِ نو
۲۹- ڈاکٹر محمد عمر، عربی ٹیچر، منٹو سرکل اسکول، اے ایم یو، علی گڑھ
۳۰- جناب سید عبدالرحیم قریشی، ناظم، مدرسہ تحفیظ القرآن اورنگ آباد مہاراشٹر
۳۱- ارشد اجمل، تاسیسی صدر الخیر چیریٹیبل ٹرسٹ پٹنہ و چیف آپریٹنگ آفیسر (COO) سہولت مائکروفائنانس، دہلی
۳۲- پروفیسر محمد ادریس، سابق ڈین فیکلٹی آف انجینئرنگ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۳۳۔ انجینئر سید سعادت اللہ حسینی، امیر جماعت اسلامی ہند
۳۴۔ مولانا انیس احمد فلاحی مدنی، استاد جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی
۳۵- ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی، مدیر حیات نو، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز اے ایم یو علی گڑھ

عرضِ اولیں

جامعۃ الفلاح، بفضلہ تعالیٰ بھارت کا ایک اہم اقامتی تعلیمی وتربیتی ادارہ ہے، جس نے اپنے زمانہ قیام ہی سے قدیم وجدید نصاب ونظام تعلیم کا قابل عمل امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔شمالی ہند کا یہ دینی ادارہ علم نافع کی تلاش وپیشکش میں مسلسل سرگرداں ہے۔چنانچہ اس کی مجلس تعلیمی ومجلس انتظامیہ سال بہ سال ضروری اور معاصر ضروریات نیز جدید چیلنجز کا سامنا کرنے کی خاطر اپنی مجالس کا انعقاد کرتی رہتی ہیں۔سید حامد وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے اپنے زمانہ میں جب بھارت کی کلیدی جامعات کے دورے کیے تو جامعۃ الفلاح بھی تشریف لائے۔انہوں نے وہاں طلبہ واساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> ''جامعہ آ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔اس کے عزائم بلند ہیں۔اس ادارہ کا فلسفہ عبارت ہے وسعت نظر، کشادگی قلب، رواداری اور باہمی احترام سے، یہاں مسالک کے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔''

ایک موقع پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (سابق ناظم ندوۃ العلماء،لکھنو) نے ارشاد فرمایا:

> ''میں نے جامعۃ الفلاح کو اپنے وہم وگمان اور انداز وقیاس سے کہیں زیادہ بڑا پایا......
> مجھے امید ہے کہ یہ امت مسلمہ کے نونہالوں کو ہمیشہ خیر کثیر سے نوازتا رہے گا۔''

مدارس کے یونی ورسٹیز سے الحاق کی کوشش جس زمانہ میں سید حامد نے کی، جامعۃ الفلاح نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔جامعۃ الفلاح کی عالمیت وفضیلت کو مسلم یونی ورسٹی نے بی اے اور ایم اے کے لیے منظور کیا۔جس کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ فارغین فلاح کی ایک خاصی تعداد یہاں سے نکل کر جامعۃ الفلاح اور علی گڑھ دونوں کی سفارت کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔راقم نے حیات نو مئی ۲۰۱۷ء میں ایک تحریر اس ضمن میں لکھی تھی جس کا عنوان تھا: ''علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں تدریس سے وابستہ فارغین جامعہ''۔

ڈاکٹر منور حسین فلاحی نمبر کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ ایک فرض کفایہ کی ادائیگی کی توفیق نصیب ہوئی۔راقم کو مرحوم سے اگست ۱۹۸۸ء تا ستمبر ۲۰۰۰ء کی رفاقت رہی۔اس پورے عرصے میں انھیں اس نے ان کے کمرہ نمبر ۱۴۹/ایس ایس نارتھ مسلم یونی ورسٹی میں مہمانوں کی ضرورتوں کی تکمیل کرتے

ہوئے، مریضوں کو میڈیکل سے سہولت فراہم کرتے ہوئے، سرسید ہال مسجد میں ایس آئی او کے پروگرام میں تقریر کرتے ہوئے، بغل میں فائل دبا کر مضامین کی اصلاح اور رفیق منزل کے لیے اداریے لکھتے دیکھا ہے۔ اس نے دیکھا کہ کبھی وہ کسی غریب کے لیے شمشاد مارکیٹ میں ہوٹل کھلوانے مصروف ہیں اور خود مستقل مزاجی سے اس کے یہاں کھانا کھا کر دوسرے ساتھیوں کو بھی وہیں سے کھانا لینے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ ایس آئی او کے بڑے قومی سطح کے اجتماعات میں ٹرینوں میں اپنے رفقاء کو طارق فارقلیطؒ کے ساتھ اسٹیشنوں پر ان کے خرد و نوش کے انتظام میں منہمک ہیں۔ الغرض میرے منور بھائی بہت متاثر کن شخصیت کے مالک تھے۔ ایسے ہی رفیق اور عالم دین کی زندگی کے چند گوشے اس خاص نمبر میں ہدیۂ قارئین کیے جا رہے ہیں۔

درحقیقت زندہ قومیں، ادارے اور جماعتیں اپنے ماضی کو یاد کر کے اپنے حال کو درست کرتی ہیں اور تابناک وخوش گوار مستقبل کے لیے زادِ راہ تلاش کرتی ہیں۔ مندرجات اور تخلیق کاروں کی کاوشوں سے قارئین خود اندازہ لگائیں گے کہ گرامی مولانا منور حسین فلاحی کی شخصیت انسانیت کے لیے کس قدر مفید تھی اور آج بھی ان کی تخلیقات طلبہ، اسکالرز اور اساتذہ کے لیے معلومات کے علاوہ غور وفکر اور عمل و تائید کے لیے بے پناہ سرمایہ اپنے اندر رکھتی ہیں۔

مولانا منور حسین فلاحی علم وعمل کا پیکر تھے۔ انہیں اسلام کی تہذیبی وراثت اپنے خاندان سے ملی تھی۔ موصوف کی خوابیدہ صلاحیتوں کو نکھارنے میں جامعۃ الفلاح کے باکمال ومخلص اساتذہ کا کلیدی کردار ہے۔ دوسری طرف ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو نکھارنے میں مسلم یونی ورسٹی کی پوری فضا کو دخل ہے، جس نے مولوی منور حسین فلاحی کو ڈاکٹر منور حسین فلاحی بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دستارِ فضیلت کو انہوں نے اپنی علمی پیاس بجھانے کا زینہ قرار دیا۔ انہوں نے اپنی صلاحیت کو اپنی صالحیت سے دوآتشہ کر لیا۔ جس کی تزئین وآرائش میں ایک لمحہ بھی انھوں نے غفلت سے کام نہیں لیا۔ طالب علم کی یہ دونوں صلاحیتیں جب یکساں رفتار اور استقلال و پامردی کے ساتھ سفر کرتی ہیں تو انسان عروج کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ مومن صادق کی حیثیت سے زندگی کے ہر خانے میں رنگ بھرنے کا اہل بن جاتا ہے اور پھر اداروں کو منور حسین جیسا قابل فخر طالب علم اور قابل تقلید استاذ ملتا ہے۔ جس کی جدائی پر اداروں، جماعتوں اور عام وخواص کی زبان پر یہ آیت ازخود آ جاتی ہے:

فَمِنۡهُم مَّن قَضَىٰ نَحۡبَهُۥ وَمِنۡهُم مَّن يَنتَظِرُۖ (الاحزاب: ۲۳)

مرحوم جامعۃ الفلاح کے لائق فرزند تھے جن کی سر بلندی کے لیے ان کے اساتذہ نے اپنی آہ سحر گاہی میں انھیں یاد رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں اقبال کی زبان میں چمن کا دیدہ ور کہا جاسکتا ہے۔ 'ہونہار بروا کے چکنے چکنے پاتھ' کی مثل منور حسین پر عنفوان شباب سے پہلے ہی صادق آنا شروع ہو چکی تھی، جس کی گواہیاں گاؤں کے عام دیہاتی، مدرسہ کے ساتھی، اساتذہ، یونی ورسٹی کے ہم عصر ساتھی اور اساتذہ کرام، روم کے جونیر اور ہاسٹل کے سینئر ساتھی، تحریک کے عام رفقاء اور قائدین الغرض ہر جگہ دست یاب ہیں۔ شہادتوں کا ایک عکس منور حسین نمبر میں فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ راقم نے بحمد للہ انتہائی مختصر مدت اور کرونا کے عہد شباب میں انتہائی بے سروسامانی اور مواد کی عدم دست یابی کے عالم میں محض اپنے مولی کی خوش نودی کی خاطر اور اس کی توفیق و اذن سے منور حسین کا خاکہ اور سراپا تیار کیا ہے۔ جس میں اسے کہنہ مشق قلم کاروں، مشفق اساتذہ کرام، بزرگ دوستوں کے عطایا اور ان کے خلوص کی عطر بیزی میسر آئی۔ چند شہادتوں سے آپ بھی محظوظ ہوں:

۱۔ مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی حفظہ اللہ نے ۹ر نومبر ۱۹۷۷ء کے ایک خط میں جامعۃ الفلاح سے تحریر کیا:

> ''.... میں بحمد للہ تمہارے سلسلے میں بڑا حسن ظن رکھتا ہوں اور تم سے اتنی توقعات رکھتا ہوں، جتنی توقعات میں نے شاید ہی اپنے کسی شاگرد سے رکھی ہوں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ وہ توقعات کہاں تک پوری ہو پاتی ہیں۔ اسی لیے تمہارے سلسلے میں شروع سے ہی فکر مند رہا ہوں اور اب بھی رہتا ہوں کہ تم کسی اچھی جگہ سیٹ ہو جاؤ۔ جہاں تمہاری صلاحیتیں ابھر سکیں۔ میرا دل تم سے بہت خوش ہے اور بار بار جی چاہتا ہے کہ کس طرح تمہیں اپنے پاس بلالوں۔ (منسلکہ خط)

۲۔ منور حسین مرحوم کے انشاء کے استاد اور بورڈنگ ہاؤس جامعۃ الفلاح کے اتالیق استاذ الاساتذہ مولانا ظفر اثری حفظہ اللہ (لندن) کہتے ہیں کہ منور حسین، دستور انجمن کے شوریٰ کی پہلی میٹنگ میں شریک تھے اور بطور خصوصی مہمان مولانا ابو اللیث اصلاحیؒ بھی مدعو تھے۔ مولاناؒ نے منور حسین کو دستوری باریکیوں پر گفتگو کرتے ہوئے دیکھا اور کئی مواقع پر انہیں سراہا تھا۔ وہ کام میں لگے رہنے والوں میں سے تھے۔ میں نے بھی بورڈنگ ہاؤس کی زندگی میں کبھی کسی کو ان کی شکایت کرتے نہیں پایا۔ (منسلکہ مضمون)

۳۔ مولانا سلامت اللہ اصلاحی حفظہ اللہ نے اپنے انتہائی لائق شاگرد کو اپنے طویل خط (منسلکہ) مورخہ ۳۰ر اگست ۱۹۷۷ء جامعۃ الفلاح سے لکھا: ''تم نے جامعہ اسلامیہ جانے کی خواہش ظاہر کی ہے اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی حصول علم کے لیے مدینہ منورہ جانے کا قصد رکھتا ہو۔ جو سرزمین کہ بذات خود اپنے اندر

نا قابل بیان کشش رکھتی ہو۔ جب اس میں علم کی کشش بھی شامل ہو جائے تو اس کشش کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔اس سال تو تم رہ گئے اب آئندہ سال نہ چوکنا کوشش اور پیہم کوشش کے بعد ہی کامیابی قدم چومتی ہے۔''

۴۔سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم مولانا انصار اللہ فلاحیؒ نے ۱۸/مارچ ۱۹۷۸ء کو حیات نو کے شمارہ بھیجے جانے کی خبر سناتے ہوئے منور حسینؒ سے مشورے طلب کیے اور گزارش کی: ''آپ اپنے آرگن کے لیے کچھ نہ کچھ ارسال کرتے رہیں، چاہے وہ مقالہ کی شکل میں ہو یا ترجمہ کی شکل میں یا افسانے اور کہانیوں کی شکل میں۔'' (خط منسلکہ)

۵۔ادارہ الحسنات، رامپور سے ۱۱/اپریل ۱۹۷۶ء کو منور حسین کے ہم دم دیرینہ مولانا عبدالحی فلاحی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: ''سب سے پہلی بات تو یہ کہ میرے پچھلے خط کی مختلف عبارتوں کو نشان زد کر کے جو زبان کی انشاء کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی ہے اس کے لیے میں آپ کا احسان مند ہوں۔خدا کرے آپ اسی طرح آئندہ بھی توجہ قائم رکھیں۔تاکہ آپ کی توجہ سے دماغ کی اور دماغ کے ساتھ قلم کی آزادی اور لاپرواہی دور ہو جائے۔واللّٰہ فی عونِ عبدہ ماکان فی عون اخیہ۔

مولانا عبدالحی ایک دوسرے خط میں مولانا منور کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

> ''.....اور اس بار پھر سے اصلاح وتصحیح کا شکریہ قبول کیجیے۔میرے خیال میں میرے خط کی عبارت کے اکثر جملے اپنی غلطیوں اور بھونڈے پن کی وجہ سے آپ کی ادبی حس کے لیے گرانی کا سبب بنتے ہوں گے اور تفصیل کی زحمت سے بچنے کے لیے انہیں نظر انداز کرنا پڑتا ہوگا۔میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ویسے اگر آپ اپنے خطوط میں تصحیح اغلاط کا سلسلہ جاری رکیں تو یہ ہماری مراسلت کا مفید پہلو ہوگا۔'' (منسلکہ خط)

۱۹۸۱ء میں بھاگلپور سے تدریس کی ذمہ داری چھوڑ کر مسلم یونی ورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا قصہ بھی بڑا دلچسپ اور عبرت انگیز ہے۔جس کی داستان سابق شیخ الجامعۃ مولانا محمد اسماعیل فلاحی حفظہ اللہ نے اپنے تفصیلی مقالے میں ثبت کر دی ہے۔مطالعہ سے ایسا لگتا ہے کہ مسلم یونی ورسٹی میں منور حسین کی آمد اپنے والد گرامی کی خواہش کی محض تکمیل تھی۔اس قصہ کا یہ حصہ کافی اہم ہے کہ مونگیر سے علی گڑھ کے سفر خرچ کا انتظام مرحوم نے از خود کسی رشتے دار سے قرض لے کر کیا تھا، جس کی بھنک والد صاحب کو نہیں لگنے دی۔والد گرامی جناب محمد انوار الحقؒ اس خودداری کے واقعہ کو زندگی بھر اپنے احباب کو سناتے رہے، روتے اور رلاتے رہے۔

یہاں یہ وضاحت غیر ضروری نہیں کہ فکر اسلامی کی صحت مند تعبیر وتشریح کا بیڑہ جس طرح سید مودودی

نے انیسویں صدی میں اٹھایا اور جس کے نتیجے میں دنیا کی تمام زبانوں میں اسلام کے سچے اور حقیقی شیدائی انھیں میسر آئے، مسلم یونی ورسٹی میں بھی بانیٔ تحریک اسلامی کے افکار وخیالات کی ترسیل کا فریضہ انجام دینے والے شارحین پیدا ہوتے رہے۔ پروفیسر نجات اللہ صدیقی حفظہ اللہ، ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی حفظہ اللہ، ڈاکٹر راؤ عرفان احمدؒ اور ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحیؒ کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدیؒ نے Islamic Thought نامی انگریزی بلیٹن کی تقریباً چودہ (۱۴) قسطیں نکال کر اہم علمی وفکری کارنامہ انجام دیا، جس کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ تحدیث نعمت کے طور پر یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ تحریک اسلامی سے وابستہ اساتذہ نے دیارِ سرسید میں رہ کر اپنی دینی ودعوتی ذمہ داریوں کو بھی بحسن وخوبی انجام دیا اور یہ ذمہ داری انہوں نے یونی ورسٹی کی مفوضہ ذمہ داریوں کے Cost پر ہرگز انجام نہیں دی! بلکہ مشاہدہ اور تجزیہ بتاتا ہے کہ تحریکی حلقے نے یونی ورسٹی کے حقوق کی شناخت اور ان کی بجا آوری میں دوسروں کے بالمقابل زیادہ سنجیدگی، فعالیت، حب واحسان مندی کا مظاہرہ وثبوت پیش کیا ہے۔ ماضی قریب میں اس کی متعدد مثالیں رہی ہیں، جن میں ایک مثال ڈاکٹر منور حسین کی ہے۔ ڈاکٹر خالد حیدر، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو کے مقالے کے ذریعہ منور حسین کی تدریسی ذمہ داریوں، اساتذہ کا ان کے تئیں احساسِ فخر واطمینان اور اپنی مفوضہ ذمہ داریوں میں امانت کے تصور کا تعارف حاصل کیا جاسکتا ہے۔

تحریکِ اسلامی کے متعدد اربابِ دانش نے اپنے تحریکی رفیق کے اس خصوصی شمارہ کے لیے اپنی بعض قدیم اور اکثر جدید تحریریں فراہم کیں۔ جن کی بدولت منور حسین کا خاکہ صدق وصفا اور حقیقت وواقعیت کے رنگوں سے تیار کیا گیا ہے۔ مولانا سید جلال الدین عمری، پروفیسر محمد ادریس، ارشد اجمل، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، ڈاکٹر ایاز احمد اصلاحی، جناب شفیق الرحمٰن، مولانا اشہد رفیق ندوی، مولانا انعام اللہ فلاحی، ابوالاعلیٰ سید سبحانی، ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی اور مولانا کمال اختر قاسمی کی تحریروں نے حیات نو کو وقار بخشا ہے۔ یونی ورسٹی کے اساتذہ ومحققین میں پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈاکٹر عبید اقبال عاصم، ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی، ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی اور ڈاکٹر محمد عمر فلاحی نے اپنے قیمتی مقالات اور ذاتی مشاہدات ہمیں عطا کیے۔ لندن سے منور حسین کے استاذ گرامی مولانا ظفر اثری فلاحی کی ڈاک ہمیں بالکل ابتدا ہی میں موصول ہو چکی تھی۔ تھی تو نہایت مختصر، لیکن اس نے راقم کو بہت حوصلہ دیا۔ لندن ہی سے دوسری ڈاک مرحوم کے ہم درس وہم سبق گرامی رضوان احمد فلاحی حفظہ اللہ کی جانب سے دست یاب ہوگئی، جس نے منور حسینؒ کے اساتذہ اور کلاس

فیلوز کی فہرست مکمل کردی۔ بزرگوار مولانا عبدالحق فلاحی نے ناسازی صحت کے باوجود درجنوں اصحاب علم سے انٹرویو لیے، مواد جمع کیا، انھیں مرتب کیا اور ایک طویل مقالہ ہمیں عطا کیا۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو صحت و عافیت عطا فرمائے۔ کولکاتہ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے جواں سال فلاحی برادر عزیز ڈاکٹر امتیاز وحید نے Induction کے یک ماہی لازمی کورس کی شدید مصروفیات کے دوران ہی چراغ علی کی علمی خدمات پر توشہ عطا کر کے منور حسین اور راقم کے تئیں اپنے خلوص و وفا کا مظاہرہ کیا ہے۔ اپنے گاؤں نزہٹ (نوادہ) کے ساتھی اور شعبہ اردو میں منور حسین کے جونیر ڈاکٹر نوشاد عالم فلاحی، منور حسین کے ساتھی جاوید اختر، سید شہاب الدین، عبدالرحیم بھساولی اور منور حسین کے قریبی عزیز ڈاکٹر نہال احمد فلاحی، میں ان تمام کا ممنون ہوں، بطور خاص مؤخر الذکر کا جنھوں نے خطوط اور دیگر دستاویز فراہم کیں، جن کا حصول ان کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

اپنے فعال مدیر معاون برادر محمد اسعد فلاحی کے لیے رسمی شکریہ ناکافی ہے کہ انھوں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ لیکن جس تندہی، لگن اور خلوص کے ساتھ انھوں نے اس شمارے کو مزین و آراستہ کیا ہے، اس کے لیے وہ الگ سے شکریے کے مستحق ہیں۔ میں برادر انصر قاسمی کا بھی ممنون ہوں جن کے تعاون کے بغیر کتابت کے مسائل حل نہیں ہو سکتے تھے۔

مقالہ 'وقت نے کس شبیہ کو خواب و خیال کر دیا' جب موصول ہوا تو چیرمین اسلامی اکیڈمی دہلی کے لیے جسم کا رواں رواں پکار اٹھا کہ بفیض مودودی کیسے کیسے ادیب و ناقد آج الحمدللہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ڈاکٹر حسن رضا صاحب کو پھسلانے اور ناامیدی کو چراغ دکھانے کی خاطر راقم نے وقت آہِ سحر گاہی میں انھیں السلام علیکم کا تحفہ بھیجنا شروع کیا تو موصوف گویا ہوئے:

> ''میاں! میں تو کب کا مطمئن ہوگیا تھا کہ چلو چھٹی مل گئی۔ میری آپ سے کبھی عداوت نہیں رہی۔ کس دن کا انتقام آپ مجھ سے لے رہے ہیں۔''

پھر ایک بار اپنی نیم رضامندی ان لفظوں میں ظاہر کرتے ہیں:

ملک الموت کو ضد ہے کہ جاں لے کے ٹلوں
سر بسجدہ ہے مسیحا کہ میری بات رہے

آخری مژدہ یوں سناتے ہیں: ''آپ کے صبر کی داد دیتا ہوں۔ مجھ سے کچھ لکھوالینا آسان نہیں ہے۔ آپ جیت گئے میں ہار گیا۔ ساجد ندوی آپ کو آج شب (۲۰ر دسمبر) میں کسی وقت بھیج دیں گے۔ والسلام۔ حسن رضا۔''

حقیقت یہ ہے کہ منور حسین نمبر کے وجود میں آنے اور لانے کا باعث مرحوم کا ایک غم گسار معنوی شاگرد

اور مرید ہے، جو رفیق نادیدہ کی مانند ہزاروں کوس دور بیٹھ کر منور حسین نمبر نکالنے پر مصر تھا، جس کی خواہش کے آگے بندہ بے دام نے وعدہ کر لیا اور اس عہد کو نبھانے کی ادنیٰ سی کوشش کر ڈالی کہ **ان العھد کان مسئولا**۔ اللہ تعالیٰ اس رفیق محترم کو دین و دنیا میں کامرانیاں عطا کرے، آمین۔

دوسرا باعث پروفیسر قدوائی کے مقالہ کا حصول ہے، جس کا تذکرہ انھوں نے اپنے ایک پُر تکلف عشائیے میں کیا جو انھوں نے راقم کے شعبہ کے ایک اسکالر کی حوصلہ افزائی کے لیے منعقد کی تھی۔ دوسرے ہی دن 'ڈاکٹر منور حسین مرحوم: میرے استاد بھی اور شاگرد بھی' کے عنوان سے اپنا مضمون بھی ارسال کر دیا۔ چنانچہ اس سب سے اول اور بروقت حاصل شدہ مقالے نے مجبور کر دیا کہ اب کسی طرح رستگاری ممکن نہیں، کیوں کہ قیل و قال اور تاویل کے سارے دروازے بند ہو چکے تھے!

میں ان تمام احباب کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے صاف گوئی کی جرأت دکھائی اور جن کی بار بار زیارت سے راقم محروم رہا۔ بیش تر مقالات تو ایک ہی درخواست پر موصول ہو گئے تھے لیکن متعدد مقالات کے حصول کے لیے لہو کو جلانے کی مشق کرنا پڑی اور مولانا تقی مرحوم و مغفور کا یہ جملہ یاد کر کے صبر بھی آیا کہ:

''میاں! بڑوں سے اگر کچھ لینا ہو یا کچھ سیکھنا ہو تو ان کے کو بڑ کا خیال رکھا کرو۔''

سو الحمد للہ خوب خوب نخرے برداشت کیے۔ میں ان تمام احباب کا بھی ممنون ہوں، جو درجنوں بار مجھے دعائیہ کلمات سے نوازتے رہے، وعدے بھی کرتے رہے لیکن اپنی مصروفیات کے باعث کچھ عطا نہیں کر سکے۔

آخر میں رب کائنات کی بارگاہ میں سراپا دعا ہوں کہ مالک حقیقی جس نیک جذبے کے ساتھ حیات نو کا **منور حسین نمبر** قارئین کے ہاتھوں میں پہنچنے جا رہا ہے، اس جذبے کو قبول فرما اور علم و تحقیق سے وابستہ طلبہ و اساتذہ نیز محققین کے ساتھ دعوت دین کے مشن میں مصروف انسانوں کے لیے اس خصوصی پیشکش کو قابل مطالعہ و استفادہ بنا دے، آمین۔

امید ہے ہماری اس کوشش کو بہ نظر تحسین دیکھا جائے گا۔ ادارہ قارئین کی آراء کا منتظر ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز اے ایم یو علی گڑھ

۱۲ جمادی الاول ۱۴۴۲ھ ۲۸ دسمبر ۲۰۲۰ء

ڈاکٹر منور حسین فلاحی

(ایک جوان رفیق جوار رحمت میں پہنچا)

سید جلال الدین عمری

(مولانا منور حسین فلاحی کے انتقال کے بعد ہی مولانا سید جلال الدین عمری حفظہ اللہ نے
تعزیت فرمائی تھی۔ مولانا کا یہ تأثراتی مضمون ماہ نامہ رفیق منزل، اکتوبر ۲۰۰۰ء میں طبع ہوا تھا۔
ادارہ رفیق منزل کے شکریہ کے ساتھ اسی تحریر کو موقع کی مناسبت سے شائع کر رہا ہے۔ مدیر)

۱۸ر ستمبر ۲۰۰۰ء بروز دوشنبہ صبح ۸ بجے ہمارے ہمدرد جرنلسٹ اور صحافی محمد آصف عمر صاحب نے فون پر یہ اندوہ ناک خبر سنائی کہ برادر عزیز ڈاکٹر منور حسین فلاحی کا شب میں ایک بجے انتقال ہو گیا ہے۔ خبر سنتے ہی سکتہ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ آصف عمر صاحب بھی افسوس اور صدمہ کے اظہار کے ساتھ تعزیت کرنے لگے کہ اس وقت آپ ہی سے تعزیت کر سکتا ہوں۔ ان کے اہل خاندان اور عزیزوں سے واقف نہیں ہوں۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ آخر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کے رفقاء نے اس سانحہ کی اطلاع کیوں نہیں دی، اتنے میں جناب محمد جرجیس کریمی کا فون آیا کہ ہم دیر سے ربط قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن لائن مل نہیں رہی تھی۔ پھر اس کے بعد ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے بھی فون پر یہی افسوس ناک خبر سنائی۔ میں نے برادرم محمد جعفر صاحب قیم جماعت اسلامی ہند کو اس کی اطلاع دی تو ان کے لیے بھی خبر غیر متوقع تھی۔ مرکز جماعت میں جو احباب ان سے واقف تھے سبھی کو ایک جوان سال اور باصلاحیت رفیق کے اٹھ جانے کا سخت صدمہ ہوا۔

میں ۱۰ر ستمبر ۲۰۰۰ء کو محترم محمد شفیع مونس صاحب نائب امیر جماعت اسلامی کے ساتھ علی گڑھ گیا تھا اور ۱۱ر ستمبر کو مرکز واپسی ہوئی۔ وہاں اس قدر مصروفیت رہی کہ منور حسین صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ کیا معلوم تھا کہ ایک ہفتہ میں وہ اس دنیا ہی سے رخصت ہو جائیں گے اور اب یہاں ملاقات نہ ہو سکے گی۔ سچ ہے دنیا کی

ڈاکٹر منور حسین فلاحی: ایک جوان رفیق جوار رحمت میں پہنچا

ہر چیز فانی ہے۔ بقا اور دوام تو صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے ع

سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں

منور حسین فلاحی شمالی بہار کے ضلع کھگڑیا کے ایک گاؤں پیپرا لطیف کے ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی۔ اس کے بعد مشہور دینی درس گاہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ میں داخلہ لیا۔ یہاں سے عالمیت کی سند حاصل کی۔ معاش کے لیے تعلیم و تدریس کو ذریعہ بنایا۔ علاقہ کے بعض مکاتب میں تدریسی خدمت انجام دینے لگے۔ لیکن جلد ہی ملازمت چھوڑ کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا اور بی اے میں داخلہ لیا۔ ایم اے (اردو) میں ان کی امتیازی حیثیت رہی۔ اس پر گولڈ مڈل حاصل کیا۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی بھی علی گڑھ ہی سے کیا۔

منور حسین فلاحی شروع ہی سے دینی مزاج کے حامل تھے۔ جامعۃ الفلاح کی تعلیم اور تحریک اسلامی سے تعلق نے اس مزاج کو پختہ تر کر دیا تھا۔ وہ نوجوانوں کی طلبہ تنظیم اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا (SIO) کے تاسیسی رکن تھے۔ علی گڑھ میں تعلیم کے دوران میں وہ جولائی ۱۹۸۵ء سے اگست ۱۹۸۷ء تک SIO حلقہ اتر پردیش کے صدر رہے۔ اگست ۱۹۸۷ء سے جولائی ۱۹۸۹ء تک اس کی مرکزی مشاورتی کونسل کے رکن بھی رہے۔ ۳۲ سال کی عمر میں ۱۹۸۹ء میں SIO سے فارغ ہوئے۔ اس سے پہلے وہ جماعت اسلامی ہند کی رکنیت کی درخواست دے چکے تھے۔ ۱۵/جنوری ۱۹۸۹ء کو ان کی درخواست رکنیت منظور ہوئی۔ اس طرح تحریک اسلامی سے ان کا مسلسل ربط قائم رہا۔

ڈاکٹر منور حسین فلاحی کو اللہ تعالیٰ نے لکھنے کی صلاحیت عطا کی تھی۔ یہ اسی کا فضل ہے کہ اس صلاحیت کو کام میں لانے اور فروغ دینے کے انہیں مواقع بھی ملتے رہے۔ SIO کا ترجمان رفیق منزل دہلی سے ان ہی کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ وہ اس کے ایک ساتھ مدیر، طابع اور ناشر تھے۔ دسمبر ۱۹۸۷ء تا دسمبر ۱۹۹۰ء تین سال تک اس کے مدیر رہے۔ رفیق منزل کی ادارت کی وجہ سے ان کے تحریری ذوق کو تسکین ملی اور انہیں صحافت کا تجربہ ہوا۔ اپنی ادارت کے دوران میں انہوں نے دو خاص نمبر بھی نکالے۔ ایک کا عنوان تھا 'دعوت اسلامی اور ہندوستانی سماج' یہ مئی، جون ۱۹۸۹ء کا مشترکہ شمارہ تھا۔ دوسرا خاص نمبر مشہور ماہر تعلیم اور سابق قیم جماعت اسلامی ہند افضل حسین مرحوم کے متعلق تھا۔

ماہ نامہ اردو بک ریویو پانچ سال سے دہلی سے نکل رہا ہے۔ اس کے ادارتی بورڈ میں عرصہ تک ان کا نام

شامل رہا۔ ایم فل میں ان کا مقالہ مولوی چراغ علی پر تھا، جو سرسید کے رفیق خاص اور ان کی عقلی تحریک کے نمایاں فرد تھے۔ یہ مقالہ کتاب کی شکل میں مشرقی علوم کی معروف لائبریری 'خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری' پٹنہ نے چراغ علی: حیات اور خدمات' کے عنوان سے شائع کیا۔ اس سے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا۔ ان کی ڈاکٹریٹ کی تھیسس 'اردو میں علمی نثر' کے موضوع پر تھی۔

منور حسین فلاحی سے میرا تعلق اس وقت سے تھا جب وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ وہ مجھ سے ملاقات کے لیے کبھی کبھی آ جایا کرتے تھے۔ میں نے ان میں بعض بڑی خوبیاں دیکھیں۔ ان کی نیکی، شرافت، متانت، سنجیدگی، تواضع اور خاک ساری سے طبیعت متاثر ہوتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان میں سلامتی طبع اور راستی فکر پائی جاتی تھی۔ وہ مجھ سے جس قدر قریب ہوتے گئے اسی قدر ان کی یہ خوبیاں ابھر کر سامنے آتی رہیں۔ میں نے ان کے اندر علمی اور ادبی ذوق بھی دیکھا۔ وہ بہت سادہ، نفیس اور عمدہ اردو لکھتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ ریسرچ مکمل کرنے کے بعد ادارۂ تحقیق میں چلے آئیں اور اپنا علمی کام جاری رکھیں۔ وہ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ ریسرچ میں گو کچھ تاخیر ہوئی لیکن بہر حال وہ اسے مکمل کر کے یکم اگست ۱۹۹۱ء کو ادارہ سے وابستہ ہو گئے۔ وہ ادارہ میں مختلف خدمات انجام دیتے رہے۔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی کی ترتیب میں ان کا تعاون حاصل رہا۔ جو مضامین اشاعت کے لیے آتے ان میں سے جس مضمون کے متعلق بھی کہا جاتا اشاعت سے پہلے دیکھ کر اپنی رائے دیتے۔ کہیں زبان و بیان کی خامی ہوتی تو اسے دور کر دیتے۔ اس طرح میرا کام آسان ہو جاتا۔ تحقیقات اسلامی کے لیے انہوں نے بعض مضامین بھی لکھے۔ ترجمہ کے لیے کسی مضمون کی نشان دہی کی تو اس کا ترجمہ بھی کیا۔ کتابوں پر ان کے تبصرے بھی شائع ہوتے رہے۔ ادارہ میں زیر تربیت طلبہ کی بھی کسی حد تک نگرانی کرتے اور ان کے تحریری کام کو دیکھ کر مشورے دیتے۔ ادارہ کے انتظامی امور سے بھی وقت ضرورت دل چسپی لیتے اور انہیں انجام دینے کی کوشش کرتے۔ میں نے ان کے لیے ایک علمی موضوع 'قرآن مجید میں کفر کا استعمال اور اس کے احکام و مسائل' تجویز کیا تھا۔ اس پر انہوں نے مطالعہ شروع کیا تھا۔ ممکن ہے کچھ لکھا بھی ہو لیکن اسے وہ آگے نہ بڑھا سکے۔

دو تین سال بعد غالباً ۱۹۹۴ء کے آخر میں وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر مقرر ہو گئے اور ادارہ سے ان کا ضابطہ کا تعلق ختم ہو گیا۔ اس میں ان کے خانگی حالات اور ذاتی مجبوریوں کا بڑا دخل تھا۔ انہوں نے یونی ورسٹی کی ذمہ داریوں کے ساتھ ادارہ کو بھی وقت دینے کا وعدہ کیا تھا۔ شروع میں اس کی انہوں

نے کوشش بھی کی لیکن بہت زیادہ نباہ نہ سکے۔

منورحسین فلاحی صاحب دراز قد، دبلے پتلے اور دھان پان سے تھے۔ صحت بہت اچھی نہیں تھی لیکن کسی طرح کی تشویش کی بات بالکل نہیں تھی۔ دبلے پتلے افراد بالعموم صحت مند ہوتے ہیں۔ ادھر تقریباً دو سال سے وہ کچھ نفسیاتی الجھنوں کے شکار ہو گئے تھے۔ ہر وقت انہیں اپنے اور بال بچوں کے بارے میں خطرہ کا احساس رہنے لگا تھا۔ ڈاکٹروں، عزیزوں اور دوستوں نے سمجھایا بھی کہ ان کا یہ احساس بے بنیاد ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اسی اثنا میں وہ رکشے سے گر پڑے اور پیر میں فریکچر ہو گیا۔ پلاسٹر چڑھایا گیا اس سے صحت یاب ہو گئے۔ لیکن ان کا عدم تحفظ کا احساس باقی رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں کمی نہیں آئی۔ چند ماہ سے جگر کی خرابی کی شکایت انہیں ہو گئی تھی۔ غالباً ایک ہی ہفتہ قبل طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو جواہر لال میڈیکل کالج علی گڑھ میں ایڈمٹ کیے گئے۔ ڈاکٹروں نے انتہائی نگہداشت والے حصہ (Intensive care unit) میں رکھا۔ ۱۸ر کی ابتدائی شب میں طبیعت بظاہر بہتری کی طرف مائل تھی۔ بات چیت بھی نہایت اطمینان کے ساتھ کی۔ لیکن ایک بجے کے قریب بے چینی محسوس کی اور چند لمحوں میں روح پرواز کر گئی۔ رہے نام اللہ کا۔ والدین کے اصرار پر طویل سفر کے بعد میت وطن پہنچائی گئی۔ وہیں تدفین عمل میں آئی۔ پس ماندگان میں والدین اور عزیزوں کے علاوہ بیوی اور پانچ کم سن اور معصوم بچے بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے حفظ امان میں رکھے اور نگہداشت فرمائے۔ آمین

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ڈاکٹر منور حسین: میرے استاد بھی اور شاگرد بھی

عبدالرحیم قدوائی

ہمارے معاشرے میں استاد اور شاگرد کی روایت قدیم اور تابناک رہی ہے۔ ڈاکٹر منور حسین مرحوم سے میرا تعلق بیک وقت استاد اور شاگرد کا رہا اور منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی خوش گوار بھی۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں، جب کہ میں شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی میں انگریزی کی تدریس کے فریضے پر مامور تھا۔ بی۔اے۔ کے ایک باوقار، متشرع اور فرض شناس طالب علم میرے لیے باعث کشش ہوئے۔ اس کے پس پشت یہ خودغرضی تھی کہ اس دور میں جب کہ میں بفضلہ تعالیٰ شعبے میں مستقل ملازمت پر مقرر اور اپنی پی ایچ ڈی کی سند سے فارغ ہو چکا تھا، کلام اللہ کے مطالعے کے لیے عربی سیکھنے کا مشتاق تھا۔ مرحوم کے کوائف میری مراد کے عین مطابق: جامعۃ الفلاح کے فارغ، موقر تحقیقی ادارے، ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ سے منسلک اور علمی وتحقیقی مشاغل میں مستغرق۔ یہ مرحوم کی کمال سعادت مندی اور شرافت تھی کہ میری درخواست فوراً اور بطیّب خاطر قبول کر لی۔ تلافی بلکہ کفارے کے طور پر انگریزی تدریس کے باضابطہ اوقات کے علاوہ انفرادی سطح پر انگریزی سیکھنے میں ان کی اعانت کا میں نے وعدہ کیا۔ کئی سال چشم فلک نے یہ منظر دیکھا کہ شعبۂ انگریزی کے کلاس کے کمرے میں وہ میرے باضابطہ طالب علم ہوتے اور پھر فارغ اوقات میں شعبے میں میرے کمرے میں وہ بطور میرے استاد قدم رنجہ ہوتے۔ رفقائے شعبہ کا یہ دلچسپ سوال ہوتا کہ فی الوقت طالب کون ہے اور مطلوب کون۔ میرے پیش نظر قرآنی عربی مقصود تھی، قدرۃً ابتدا مولانا علی میاںؒ کی قصص النبین سے ہوئی، پھر القراۃ الراشدۃ، علامہ فراہیؒ کی اسباق النحو اور پھر حرفاً حرفاً مصحف۔ ۱۹۸۵ء میں اپنے اصل مضمون انگریزی میں دوسری پی ایچ ڈی کرنے کے لیے میں نے انگلستان کوچ کیا اور قیام وہاں کئی سال رہا، اس طرح استاد اور شاگرد کا یہ تعلق منقطع ہوا۔ انگلستان کا علمی نفع بہرکیف اس خسارے کا مداوا نہ کر سکا۔ عربی کی میری شد بد اور اس کے حوالے سے انگریزی تراجم قرآن مجید سے متعلق ٹوٹی پھوٹی خدمت مرحوم ہی کا صدقہ جاریہ ہے۔

اپنی ریاضت اور صلاحیت کے بدولت مرحوم نے شعبہ اردو سے بی اے، ایم اے اور پھر دکتور کی اسناد حاصل کیں۔ وہ مکمل یکسوئی سے مجلّہ تحقیقات اسلامی، اسٹوڈینٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا، مسلم یونیورسٹی میں اسلام پسند طلبہ کی تنظیم اور دیگر تحریکی سرگرمیوں میں منہمک رہتے۔ یہ خیال میرے ہی ذہن میں آیا کہ کلاسیکی ادب کے ایسے شناور کو مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے منسلک ہونا چاہیے تاکہ شعبے کے وقار میں اضافہ ہو اور طلبہ ان کے توسط سے اسلامی، عربی اور فارسی میراث سے واقف ہوں۔ اصحاب عزل ونصب سے مرحوم کا ذکر خیر کیا۔ اس مجلس انتخاب کے سب سے زیادہ بااثر بلکہ بادشاہ گر رکن جملہ عیوب شرعی میں غرق اور فسق وفجور میں ملوث تھے۔ انھوں نے یہ بلیغ جواب مجھے مرحمت کیا: " آپ کی سفارش اس شرط پر مجھے قبول ہے کہ جب میری سنگ ساری کا فتویٰ جاری ہو، مولانا منور کے اس پر دستخط نہ ہوں۔'' مرحوم کی جانب سے میں نے حامی بھر لی اور ان کا تقرر ہو گیا۔ یہ روداد عارضی آسامی پر ان کی تقرری کی ہے۔ ایک دو سال بعد مستقل ملازمت کے لیے انٹرویو ہوا۔ مرحوم کے استغنا اور عزت نفس کا یہ عالم کہ انٹرویو میں بفضلہٖ کام یاب ہونے کے بعد شام کو مجھے اطلاع دی۔ جامعات میں کیا ہر آسامی پر ملازمت کے لیے کیا کیا منصوبہ بندی اور ریشہ دوانی ہوتی ہے اس سے کون ناواقف ہے۔ یہ روایت مشہور ہے کہ موجودہ نسل کے برادران وطن کے برسر روزگار لڑکے اور لڑکی اپنی شادی کی تاریخ طے کرنے سے قبل راجستھان کے شہر کوٹہ کے کوچنگ (تربیتی) مرکز میں اپنے ہونے والے بیٹے/بیٹی کی نشست محفوظ کرا لیتے ہیں تاکہ وہ ڈاکٹر، انجینئر یا آئی اے ایس افسر بنے۔

ذکر مرحوم کی صلاحیتوں اور فرض شناسی کا تھا جلد ہی شعبہ اردو میں انھوں نے اپنا مقام بنا لیا۔ درس و تدریس کے علاوہ شعبے کی توسیعی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہتے۔ اس کا استحسان کے ساتھ ذکر شعبہ اردو کے بزرگ اساتذہ نے مجھ سے کیا۔ بحمد اللہ علی گڑھ میں علما وفضلا کم یاب نہیں۔ ۱۹۹۸ء میں جب میرے چار سالہ بیٹے عبدالصمد قدوائی کی بسم اللہ خوانی کا مرحلہ آیا میرے ذہن میں مرحوم کے سوا کسی کا خیال تک نہیں آیا اور از راہ تلطف مرحوم نے یہ زحمت گوارا کی۔ خوش عقیدگی اور کرامت وغیرہ کا میں قائل نہیں البتہ تحدیث نعمت کے طور پر عرض ہے کہ عزیزم عبدالصمد نے دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرنے کی سعادت حاصل کی اور پھر انگلستان میں ہوائی جہاز سے متعلق انجینیر نگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور بفضلہٖ تعالی وہیں اعلی منصب پر فائز ہے اور ہر شب 'دور' کے طور پر کلام اللہ کا ربع یا نصف جز ٹیلی فون پر مجھے سناتا ہے۔ یہ مبارک سلسلہ گزشتہ دس سال سے بلا ناغہ جاری ہے۔ اس ضمن میں یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ میرا چھوٹا بیٹا عبدالصبور قدوائی بھی

بحمداللہ حافظ ہے اور اپنے قاری صاحب کے علاوہ مجھے بھی دور سناتا ہے جمعہ کو تعطیل رہتی ہے ایک دن بر سبیل تذکرہ عبدالصبور کی والدہ نے ان سے کہا: 'ماشاءاللہ صمد روزانہ سناتا ہے، بشمول جمعہ'۔ عبدالصبور نے برجستہ جواب دیا: 'وہ دارالکفر کے ساکن جمعہ کے تقدس سے کیا واقف، یہ تو میں ہی ہوں کہ جمعہ کا احترام اور اکرام قائم رکھے ہوئے ہوں'۔

موسم سرما میں زائر استاد کی حیثیت سے میں انگلستان میں مقیم تھا کہ مرحوم کی علالت کی اطلاع ملی۔ مراجعت پر جب ملاقات ہوئی تو ان کی مختل ذہنی اور نفسیاتی حالت سے قلبی اذیت ہوئی۔ کوئی عام مریض ہوتا تو تلاوت، ذکر الٰہی اور درود کے ورد کی تلقین کرتا۔ مرحوم کے ضمن میں تو یہ لقمان کو حکمت کا درس دینے کے مرادف تھا۔ علاج اور دل جوئی کی حتی الامکان کوشش کی لیکن جلد ہی مرحوم جوار رحمت میں طلب کر لیے گئے۔ مرحوم کی شخصیت بے نفسی، سادگی اور زہد سے عبارت تھی۔ اتنے طویل سابقے میں ان کو سرتا پا خیر ہی پایا۔ یقین کامل ہے کہ ان شاءاللہ خیر الراحمین نے مرحوم کے ساتھ خیر ہی کا معاملہ کیا ہوگا۔

وقت نے کس شبیہ کو خواب وخیال کر دیا

(ڈاکٹر منور حسین فلاحی مرحوم)

حسن رضا

جماعت اسلامی کے ابتدائی دور میں جب کوئی شخص تحریک سے وابستہ ہوتا تو اس کے اندر مطالعہ قرآن سے ایک خاص شغف اور قرآن فہمی کا ایک مخصوص ذوق پیدا ہو جاتا تھا، جو دھیرے دھیرے پروان چڑھتا رہتا۔ پھر عربی زبان سیکھنے کا شوق بھی مچلنے لگتا۔ چناں چہ ہم لوگ جب پٹنہ میں اپنی 'طالب لاعلمی' کے دور میں جماعت اسلامی سے وابستہ ہوئے تو تھوڑے دنوں کے بعد ہی عربی زبان سیکھنے کی پیاس شروع ہوئی۔ چناں چہ جو قریبی احباب عربی جاننے والے تھے ان سے منہاج العربیہ کا درس لینے لگے لیکن بات پوری طرح بنی نہیں۔ اس عمر اور بھاگ دوڑ میں زبان سیکھنے میں بہت کسر رہ گئی، جس کی دل میں ایک کسک رہی۔

پھر جب ۱۹۷۵-۷۷ء ملک میں ایمرجنسی کے دوران جماعت اسلامی پر پابندی لگی۔ اس وقت ایک خاص مصلحت کے پیش نظر ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم کے مشورے سے میں جامعۃ الفلاح چلا گیا، تاکہ عربی زبان کی تعلیم مکمل ہو جائے اور مولانا جلیل احسن ندوی سے قرآن فہمی کے آداب بھی سیکھ لیں۔ چناں چہ وہاں جانے کے بعد نحو مولانا رحمت اللہ اثری صاحب، صرف یعنی گردان مولانا سلامت اللہ صاحب اور معلم الانشا مولانا ظفر اثری صاحب سے سیکھنے لگا۔ اس وقت مولانا اسماعیل اور مولانا اسحاق صاحبان عربی فائنل کے طالب علم تھے اور مولانا صباح الدین ملک عربی دوم میں تھے۔ وہ مدرسے میں ایک ذہین اور محنتی طالب علم کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھا۔

اسی دوران ایک دن ایک نوجوان کو جامعۃ الفلاح میں دیکھا۔ وہ کہیں باہر سے تشریف لائے تھے۔ جوانی میں پہلا قدم رکھے ہوئے دبلا پتلا، چھریرا بدن اور گندمی رنگ تھا۔ اوسط سے کچھ نکلتا ہوا قد وقامت، وضع قطع سے ایک شانِ بے نیازی، گول مسکراتے چہرے پر عینک، جو مطالعے کے شوق کا پتہ دے رہی تھی اور اس

کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی مانوس آنکھیں اس کی تائید کر رہی تھیں۔ وہ ایک فطری ادا کے ساتھ تمام اساتذہ سے علیحدہ علیحدہ مل رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ سارے اساتذہ ان سے ایک خاص انسیت، شفقت اور محبت سے مل رہے ہیں اور وہ نوجوان بھی بڑے ادب، احترام، حفظِ مراتب کا لحاظ، ایک فطری معصومیت اور لینت کے ساتھ دعائیں لے رہے ہیں۔ مزاج سے تواضع اور فروتنی جھلک رہی تھی۔ صالح نوجوانی کے بھرپور آثار یعنی چہرے پر حیا کی لکیریں ابھرتی ڈوبتی صاف نظر آ رہی تھیں۔ اتنی ساری ادائیں کسی نوجوان میں بہ یک وقت جمع ہو کر خوشبو بکھیرنے لگیں تو اس میں ایک شان دلبری پیدا ہو جاتی ہے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ نوجوان کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ جب تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ نام منور حسین ہے اور بہار کے رہنے والے ہیں۔ جامعۃ الفلاح سے ابھی فارغ ہوئے ہیں اور اپنی سرٹیفکیٹ وغیرہ لینے اور ملنے ملانے کی غرض سے آئے ہیں۔ ان سے مصافحہ ہوا تو نرم ہتھیلی لیکن گرم جوشی تھی۔ اسی کے ساتھ بھرپور خاکساری اور سراپا عاجزی۔ یاد رہے بندگی کا اصل جوہر عاجزی ہے اور یہ دولت کسی کو مل جائے تو سمجھ لیجیے کہ وہ اپنی حقیقت کو پا گیا ؎

زمیں کی طرح جس نے عاجزی و خاکساری کی
خدا کی رحمتوں نے اس کو ڈھانپا آسماں بن کر

چناں چہ اس وقت مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ وہ فضیلت کر کے رخصت ہو رہے تھے، لیکن اس ملاقات میں ایسا کچھ نہیں لگا کہ وہ عالمیت اور فضیلت کر کے جا رہے ہیں۔ علم کا اصل عرفان کیا ہے کہ بندہ سمجھ جائے کہ **لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا** جو فرشتوں نے خدائی اسکیم کا راز سمجھنے کے بعد کہا تھا: **اِنَّکَ اَنتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْم** ۔ پہلے تو سوال کیا تھا: **قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ** وہ علم کا کمتر درجہ تھا۔ ہر طرح کے طرہ پر پیچ سے خالی تھے۔ معمولی لباس اور وضع قطع بھی عام دیہاتی نوجوان کی طرح۔ اس دن وہ قمیض اور پاجامہ میں تھے۔ شیروانی بھی نہیں تھی جو علی گڑھ میں ان کو دیکھا۔ ایک سادہ مزاج، سادہ دل اور پاک باز انسان کی حیثیت سے وہ میرے حافظۂ دل میں اسی دن سے محفوظ رہے۔ پھر او بہ صحرا رفت اور من در کوچہ رانجی رسوا شدم۔

ایمرجنسی ختم ہو گئی پھر تنظیمی و تحریکی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ البتہ آل انڈیا اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے قیام کی نشستیں بحثیں بھی شروع ہوئیں اور بالآخر ایس آئی او ایک آل انڈیا تنظیم ۱۹۸۲ء میں قائم ہوئی۔ میں رسمی اسٹوڈنٹ کے مرحلے سے نکل چکا تھا لیکن طلبہ میں کام کرنے کی دل چسپی برقرار تھی۔ معلوم ہوا کہ تاسیسی رکن

میں منور حسین مرحوم کا نام بھی ہے پھر دوسری میقات ۵۸۔۱۹۵۷ میں وہ یو پی زون کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ انہیں دنوں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کرنے کے بعد ایم فل کر رہے تھے، تب علی گڑھ میں ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ میں رانچی یونیورسٹی شعبہ اردو میں لیکچرر ہو چکا تھا۔ اس لیے اس ملاقات میں شعبے کے حوالے سے ایک نئے رشتے اور پیشہ ورانہ قربت کا احساس بھی تھا۔ تقریباً دس برسوں کے بعد ملاقات ہو رہی تھی لیکن ان کی کسی ادا میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا تھا۔ وہی معصومیت، عاجزی، بے تکلفی، بے ریائی، ہر تصنع و تکلف سے پاک انداز جو میں نے جامعۃ الفلاح میں دیکھا تھا بس شیروانی کا اضافہ تھا لیکن پاجامہ اور ٹوپی ویسی ہی تھی۔ یونیورسٹی سے میری قیام گاہ تک وہ سائیکل سے میرے ساتھ پیدل چلتے ہوئے زیرِ لب مسکراتے اور حال دل سناتے رہے۔ دینی درس گاہوں میں فراغت کے بعد کیریئر پلاننگ کا کوئی شعبہ نہیں ہوتا ہے۔ چناں چہ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد طالب علم ایک نئی منزل کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں جو علم کی نئی نئی منزلوں کو پار کرتے ہوئے بلندی پر پہنچتے ہیں۔ بہر حال منور حسین مرحوم نے اپنی محنت، لگن اور ہمت کے بل پر نیٹ، جے آر ایف پاس کر کے اپنے لیے پی ایچ ڈی کی راہ ہموار کی۔ لیکن اس پورے دوڑ بھاگ میں انہوں نے اپنے اصلی فطری رنگ کو ماند پڑنے نہیں دیا۔ اصل میں نقلی چیزوں کے رنگ بدل جاتے ہیں۔ سچی موتی، خالص سونا اور اصل چاندی کا رنگ نہیں بدلتا۔ منور حسین بھی کھرا سونا تھے اور اپنی اصل بناوٹ یعنی احسن تقویم پر قائم رہے۔ انسان اپنی فطرت میں کامل اور صورت میں ناقص ہے۔ اس راز کو وہ جانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی فطرت کی نگہبانی کی۔

رفیق منزل میں شائع ہونے والے ان کے مضامین کو پڑھتا رہتا تھا۔ ان کی نثر بھی سادہ اور شفاف ہوتی تھی جس میں منطقی ربط ہوتا تھا۔ اس سفر میں جب وہ اپنی پی ایچ ڈی کے مقالے کی تیاری کا حال سنا رہے تھے تو میں دل میں سوچ رہا تھا کہ خدا کرے شعبہ اردو میں ان کی تقرری کی کوئی سبیل پیدا ہو جائے ورنہ یونیورسٹی میں اتنی تکڑم بازی ہوتی ہے کہ کسی شریف اور محنتی آدمی کے لیے جو خداوندانِ شعبہ کی خوشامد سے دور رہے اور زمانہ سازی کا ہنر نہیں جانتا ہو اس کا وہاں جگہ پانا گویا محال ہے۔ بعد میں جب خبر ملی کہ ان کا تقرر یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ہو گیا ہے تو اس کو میں نے ان کی کرامت سمجھا۔ **ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔**

کیا معلوم تھا کہ پیام اجل کو لبیک کہنے میں بھی وہ اپنی اسی سادگی اور بھولے پن کا ثبوت دیں گے۔ 'کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور' بہر حال یہ ایک شاعرانہ بات ہے ورنہ موت کا وقت معین ہے اور اللہ اپنی

وقت نے کس شبیہ کو خواب و خیال کر دیا

مصلحت خود جانتا ہے۔ایس آئی او سے وابستہ دو جواں سال رفیق کی جدائی کا بہت غم رہا۔ایک محمد اقبال صاحب مرحوم گیا اور دوسرے ڈاکٹر منور حسین فلاحی علی گڑھ۔ایک انگریزی لیکچرر، دوسرے اردو ادب کے شعبے سے وابستہ۔دونوں صاحبِ قلم تھے۔اقبال صاحب کے اندر طنز و مزاح کا عنصر نمایاں تھا، منور حسین کے اندر سنجیدگی متانت کا پہلو ابھرا ہوا تھا۔ایک ثابت تھے، دوسرے سیارہ۔دونوں کے اسلوب میں بھی شخصیت کا اثر تھا۔منور حسین مرحوم کی نثر خالص علمی نثر تھی۔علمی نثر لکھنا بہت مشکل کام ہے۔کیوں کہ کام یاب علمی نثر ذہنی عمل کی صحیح اور مکمل ترجمانی کا فریضہ انجام دیتی ہے۔اس میں قطعیت کے ساتھ وضاحت ضروری ہے۔ابہام اور اجمال اس کا سب سے بڑا نقص ہے۔وہ قاری کے شعور کی منطقی جہت کی سیرابی اور تسکین کا سامان کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔اس موضوع پر ان کے پی ایچ ڈی کا مقالہ خاصے کی چیز ہے۔علمی نثر کی بہت اچھی وضاحت اور خصوصیات انہوں نے بیان کی ہے۔انہوں نے ایمان داری کے ساتھ تحقیق کے آداب کو پوری طرح بجا لایا ہے۔یہ کتاب اس موضوع پر حوالہ بننے کی اہلیت رکھتی ہے۔ویسے بھی منور حسین مرحوم کے مقالے اور دیگر مضامین کا مطالعہ کریں تو آپ گواہی دیں گے کہ مرحوم لکھنے میں سہل انگاری سے کام نہیں لیتے تھے۔اقبال صاحب تحقیق کے آدمی نہیں تھے۔ان کی تحریر میں صحافتی رنگ ابھر جاتا تھا۔وہ رپورٹنگ، سفر نامہ اور روزنامچہ اچھا لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔دونوں سے تحریک کو مستقبل کی بہت ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ اللہ مجھے معاف کرے دونوں کی موت پر غالب کے شعر کا ایک مصرعہ یاد آ گیا ؎

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

ڈاکٹر منور حسین فلاحیؒ

ادارۂ تحقیق کے رفیق اور تحقیقات اسلامی کے معاون مدیر کی حیثیت سے

محمد رضی الاسلام ندوی

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں طالب علمی کا زمانہ ڈاکٹر منور حسین فلاحی اور راقم سطور کا ایک ہے۔ انھوں نے یونی ورسٹی سے ۱۹۸۴ء میں بی۔اے آنرز (اردو)، ۱۹۸۶ء میں ایم۔اے (اردو)، ۱۹۸۸ء میں ایم فل اور ۱۹۹۲ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ راقم سطور کا داخلہ اجمل خاں طبیہ کالج میں ۱۹۸۳ء میں ہو گیا تھا۔ ۱۹۹۰ء میں اسے B.U.M.S اور ۱۹۹۴ء میں M.D کی ڈگریاں ملیں۔

منور حسین صاحب کا تعلق اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا (SIO) سے تھا۔ وہ حلقۂ اتر پردیش کی مجلس شوریٰ کے رکن اور بعد میں سکریٹری ہوئے۔ راقم سطور اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ (SIM) سے منسلک تھا۔ علی گڑھ پہنچتے ہی اس کا بنیادی ممبر (انصار) ہو گیا تھا۔ ۱۹۹۳ء میں ایک برس علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی یونٹ کا صدر بھی رہا تھا۔ یونی ورسٹی میں طلبہ برادری کے درمیان میں ہم دونوں سرگرم تھے، البتہ ہمارے میدان الگ الگ تھے۔ ادارۂ تحقیق میں دورانِ طالب علمی میں میرا بھی آنا جانا تھا اور مرحوم کا بھی۔ اس لیے کہ ادارہ علمی و تحقیقی مرکز ہونے کے ساتھ جماعت اسلامی ہند، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا دفتر بھی تھا۔ ادارہ کے ریکارڈ کے مطابق اس سے منور حسین صاحب اگست ۱۹۹۱ء میں وابستہ ہوئے۔ میری وابستگی مئی ۱۹۹۴ء میں ہوئی۔ اس کے چند ماہ بعد ہی مرحوم شعبۂ اردو، مسلم یونی ورسٹی میں لکچرر ہو گئے۔ چنانچہ ادارۂ تحقیق سے ان کا ضابطہ کا تعلق ختم ہو گیا، لیکن عملاً ادارہ سے ان کی وابستگی وفات (۱۸؍ستمبر ۲۰۰۰ء) تک جاری رہی۔

یوں تو ادارہ ۱۹۷۰ء ہی میں رام پور سے علی گڑھ آ گیا تھا اور جماعت اسلامی ہند کے ایک شعبہ (شعبۂ تصنیف) کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہا تھا۔ پان والی کوٹھی (دودھ پور) کی پشت پر واقع تین کوارٹرس اس کے لیے کرایہ پر حاصل کیے گئے تھے۔ ۱۹۸۱ء میں جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کے ایک فیصلے کے مطابق اس کی تشکیل نو ہوئی اور 'ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی' کے نام سے اسے رجسٹرڈ کرایا گیا۔ مولانا

صدر الدین اصلاحیؒ کو ادارہ کا صدر اور مولانا سید جلال الدین عمری کو سکریٹری بنایا گیا۔ مولانا اصلاحی کا قیام ان کی بیماری کی وجہ سے زیادہ تر ان کے وطن پھول پور (ضلع اعظم گڑھ) میں رہتا تھا، البتہ وہ کبھی کبھی علی گڑھ تشریف لاتے اور کچھ دن ادارہ میں قیام کرتے۔ ملک میں ایمر جنسی (۱۹۷۵ء) سے قبل مولانا سلطان احمد اصلاحی علی گڑھ آچکے تھے اور ادارۂ تحقیق میں تصنیفی تربیت کورس مکمل کرکے بحیثیت رفیق اس سے وابستہ ہوگئے تھے۔ ادارہ کی تشکیل نو کے بعد جنوری ۱۹۸۲ء سے سہ ماہی تحقیقات اسلامی کا اجرا ہوگیا تھا اور ادارہ کی اشاعتی سرگرمیاں بھی شروع ہوگئی تھیں۔ مکتبۂ تحقیق سے ابتدا میں طبع ہونے والی کتابوں میں مولانا صدر الدین اصلاحی کی 'معرکۂ اسلام و جاہلیت' (۱۹۸۳ء)، مولانا سید جلال الدین عمری کی 'مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ' (۱۹۸۶ء) اور مولانا سلطان احمد اصلاحی کی 'مذہب کا اسلامی تصور' (۱۹۸۵ء) قابل ذکر ہیں۔ ادارہ سے باہر کے اصحاب علم میں ڈاکٹر روؤفہ اقبال، سابق ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی کتاب 'عہدِ نبوی کے غزوات و سرایا' (۱۹۸۴ء) بھی مکتبۂ تحقیق سے شائع کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ادارہ کی اہم سرگرمی تصنیفی تربیت کورس کا اجرا تھا۔ اس کے تحت دینی مدارس کے فضلاء اور عصری جامعات کے پوسٹ گریجویٹس کو ادارہ میں رہائش کی سہولت فراہم کرنے کے ساتھ ضروری مصارف کے لیے اسکالرشپ دی جاتی تھی۔ انھیں دو (۲) برس ادارہ میں رکھ کر اسلامیات کے مراجع و مصادر کے مطالعہ کے ساتھ مضمون نویسی کی مشق کرائی جاتی تھی۔ پہلے برس مختصر مضامین لکھوائے جاتے تھے اور دوسرے برس کسی ایک موضوع پر مبسوط مقالہ تیار کروایا جاتا تھا۔ مولانا سید جلال الدین عمری کو، جو ان دنوں ادارہ کے سکریٹری تھے، اس کورس سے خاص دل چسپی تھی۔ وہ زیرِ تربیت طلبہ کی خود نگرانی کرتے تھے اور ان کی تحریروں کو چیک کرکے انھیں قیمتی مشورے دیتے تھے۔ اس زمانے میں ادارہ کے اس کورس سے بہت سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور بعد میں علمی دنیا میں شہرت حاصل کی، مثلاً پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی، پروفیسر اسرار احمد خاں، پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی، مولانا رفیق احمد رئیس سلفی، ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی، مولانا محمد ادریس فلاحی، مولانا محمد جرجیس کریمی، جناب ارشد اجمل، جناب جاوید علی وغیرہ۔

ادارۂ تحقیق کے بارے میں اتنی تفصیل سے لکھنے کی ضرورت اس وجہ سے محسوس کی گئی تا کہ ادارہ سے مولانا منور حسین فلاحی کی وابستگی، قیام اور خدمات کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔ مولانا عمری کو ایک ایسے معاون کی ضرورت تھی جو ادارہ کے تمام علمی اور انتظامی کاموں میں ان کا دست راست بن سکے۔ منور صاحب کی شکل میں انھیں ایسا معاون مل گیا تھا۔ ادارہ کی مجلس منتظمہ کی روداد سے بہ خوبی واضح ہوتا ہے کہ ادارہ سے

وابستگی کے زمانے میں وہ کیا کیا کام انجام دیتے تھے؟ ذیل میں ان کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے:

مرحوم منور صاحب کا اہم کام سہ ماہی تحقیقات اسلامی کی ادارت میں مولانا عمری کا تعاون کرنا تھا۔ مجلّہ میں اشاعت کے لیے جو مضامین موصول ہوتے تھے ان کی ریڈنگ کرکے وہ مدیر محترم کو رپورٹ کرتے کہ وہ قابل اشاعت ہیں یا نہیں؟ جو مضامین قابل اشاعت ہوتے انھیں بہت غور سے پڑھ کر حسبِ ضرورت ایڈٹ کرتے اور زبان و بیان درست کرکے مدیر محترم کے حوالے کرتے۔ مدیر محترم اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود لازماً خود بھی ہر مضمون کا لفظ لفظ پڑھتے (ان کا یہ معمول اب تک جاری ہے)، پھر اسے کاتب کے حوالے کردیا جاتا۔ کتابت کے بعد پروف خوانی بھی منور صاحب کے ذمہ تھی۔ وہ اردو سے پی۔ ایچ۔ ڈی تھے۔ ان کی دینی وعلمی صلاحیت اور اردو زبان و ادب سے گہری واقفیت کی وجہ سے تحقیقات اسلامی کے معیار کو بلند کرنے میں بہت مدد ملی۔

تحقیقاتِ اسلامی میں میرے مضامین ۱۹۸۷ء ہی سے شائع ہونے لگے تھے۔ ڈاکٹر منور صاحب کی معاونت کے زمانے (۱۹۹۱ء۔۲۰۰۰ء) میں میرے دس (۱۰) سے زائد مضامین اس میں شائع ہوئے۔ ظاہر ہے، ان کی ایڈیٹنگ بھی انھوں نے ضرور کی ہوگی۔ مجھے یاد ہے کہ تحقیقات اسلامی جنوری۔ مارچ ۱۹۹۵ء میں مولانا سلطان احمد اصلاحی کا مضمون 'فلسفۂ نظم قرآن: ایک متوازن نقطۂ نظر' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کا مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی نے اپنے ایک مضمون میں تنقیدی جائزہ لیا، جو تحقیقات اسلامی جولائی۔ستمبر ۱۹۹۵ء کے شمارے میں طبع ہوا۔ اس پر میں نے استدراک لکھا، جس کی اشاعت جنوری۔ مارچ ۱۹۹۶ء کے شمارے میں 'بعض قرآنی الفاظ کے مواقع استعمال' کے عنوان سے ہوئی۔ میرے اس مضمون پر مولانا عنایت اللہ سبحانی نے بڑے تیز وتند اسلوب میں استدراک لکھا۔ ان کا وہ مضمون خاصا بڑا تھا۔ مدیر محترم کی ایڈیٹنگ کے بعد وہ تحقیقات اسلامی کے بیس (۲۰) صفحات میں آیا۔ مجھے خبر ہوئی تو میں نے منور صاحب سے گزارش کی کہ مجھے بھی اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کا موقع ملنا چاہیے۔ آپ مولانا سبحانی کا مضمون شائع کریں گے، پھر اگلے شمارے میں میرے جواب کو شامل کریں گے۔ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ اسی شمارے میں، جس میں مولانا سبحانی کا مضمون شامل ہورہا ہے، میرا جواب بھی آئے۔ منور صاحب نے میری گزارش کو قبول کیا، لیکن کہا کہ اب تمام مضامین کی کتابت کے بعد صرف دو (۲) صفحات کی گنجائش ہے۔ ان میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرسکیں تو ہم اسے بھی شامل اشاعت کرلیں گے۔ میں نے حامی بھرلی۔ چنانچہ تحقیقات اسلامی اپریل۔ جون ۱۹۹۷ء میں مولانا

سجانی کا مضمون 'دوقرآنی الفاظ۔ ان کا صحیح مفہوم' اور میری مختصر تحریر 'معروضات' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس زمانے میں، میں دوسروں کے مضامین پر بے باکی سے نقد کرتا تھا۔ چنانچہ تحقیقات اسلامی میں میرے چار (۴) نقد واستدراک شائع ہوئے۔

ڈاکٹر منور صاحب نے تحقیقات اسلامی کی ادارت میں معاونت کے ساتھ خود بھی مضامین لکھے، یا دیگر زبانوں کے مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا، جن کی مجلّہ میں اشاعت ہوئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد نئی مطبوعات پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ تحقیقات اسلامی میں شائع ہونے والی ان کی تحریروں کی فہرست درج ذیل ہے:

<u>مقالہ:</u> شیوبرت لال ورمن کے بعض افکار کا جائزہ، اپریل۔ جون ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۷۔۱۲۶

<u>ترجمے:</u>

☆ سید امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام کا تنقیدی مطالعہ، مقصود احمد (انگریزی سے ترجمہ) اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۰ء، ص ۷۷۔۱۰۸

☆ اعضا کی پیوندکاری: ایک نقطۂ نظر (انگریزی سے ترجمہ) جنوری۔ مارچ ۱۹۹۵ء، ص ۱۰۹۔۱۱۶

☆ امام مالک بن انسؒ اور ان کی تصنیف الموطا۔ محمد کامل حسین (عربی سے ترجمہ)، اپریل۔ جون ۱۹۹۷ء، ص ۷۹۔۹۶

<u>تبصرے:</u>

☆ مولانا مودودیؒ کے معاشی تصورات (محمد اکرم خاں) جنوری۔ مارچ ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۹۔۱۲۰

☆Education in early Islamic period (ظفر عالم) اپریل۔ جون ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۷۔۱۲۰

☆ احسن البیان فی علوم القرآن (حسن الدین احمد) جولائی۔ ستمبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۷۔۱۲۰

☆ قرآنی مقالات (ادارۂ علوم القرآن علی گڑھ) جنوری۔ مارچ ۱۹۹۳ء، ص ۱۱۹۔۱۲۰

☆ زکوٰۃ کے مصارف (عتیق احمد قاسمی) اپریل۔ جون ۱۹۹۳ء، ص ۱۱۷۔۱۱۹

☆ راستے کی تلاش (عتیق الرحمٰن سنبھلی) جولائی۔ ستمبر ۱۹۹۴ء، ص ۱۱۸۔۱۲۰

☆ ایرانی تصوف (کبیر احمد جائسی) جنوری۔ مارچ ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۷۔۱۱۸

☆ مجھے ہے حکمِ اذاں (عتیق الرحمٰن سنبھلی) اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۴۔۱۱۶

☆ عہدِ نبوی کا نظام حکومت (محمد یٰسین مظہر صدیقی) اپریل۔ جون ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۹۔۱۲۰

☆تحدیث نعمت (محمد منظور نعمانی) اکتوبر۔دسمبر ۱۹۹۷ء، ص۱۱۴۔۱۱۶

☆عکس رموز بے خودی (عصمت جاوید) اکتوبر۔دسمبر ۱۹۹۸ء، ص۱۱۴۔۱۱۶

☆ماہ نامہ الفرقان [اشاعت خاص، بیاد بانی الفرقان حضرت مولانا محمد منظور نعمانی] (مرتب: عتیق الرحمٰن سنبھلی) اپریل۔جون ۱۹۹۹ء، ص۱۱۶۔۱۱۹

اس عرصہ میں مولانا سید جلال الدین عمری کی دو کتابوں پر ان کے تبصرے ماہ نامہ زندگی نو میں شائع ہوئے:

☆صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات، اگست ۱۹۹۴ء، ص۵۴۔۵۶

☆انسان اور اس کے مسائل، اپریل ۱۹۹۵ء، ص۵۲۔۵۳

ادارۂ تحقیق کے مکتبہ سے جو کتابیں طبع ہوتی تھیں ان کی نگرانی کرنا، کتابت کرنا، پروف ریڈنگ کرنا، تصحیح کروانا، پھر پریس کے حوالے کرنا بھی منور صاحب کے ذمہ تھا۔ یہ کام بھی انھوں نے بہ حسن خوبی انجام دیا۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی کی کتابیں 'وحدت ادیان کا نظریہ اور اسلام' (۱۹۹۵ء) اور آزادیِ فکر و عمل اور اسلام (۱۹۹۶ء)۔ راقم سطور کی کتاب 'قرآن اہلِ کتاب اور مسلمان' (۱۹۹۷ء) اور ارکان ادارہ کے علاوہ دیگر اصحاب علم میں پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کی کتاب 'عہد نبوی کا نظام حکومت' (۱۹۹۴ء)، پروفیسر عبید اللہ فراہی کی کتاب 'تصوف: ایک تجزیاتی مطالعہ' (۱۹۹۱ء) اور پروفیسر عبد العظیم اصلاحی کی کتاب 'شیئر بازار میں سرمایہ کاری: طریقۂ کار اور اسلامی نقطۂ نظر' (۱۹۹۹ء) منور صاحب کی ادارہ سے وابستگی کے زمانے میں طبع ہوئیں۔ ظاہر ہے، ان کی طباعت و اشاعت میں ان کی خدمات رہی ہوں گی۔ اس زمانے میں مولانا سید جلال الدین عمری اور مولانا سلطان احمد اصلاحی کی متعدد کتابیں مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع ہوئیں۔ ممکن ہے، ان میں سے بعض کتابوں کی پروف ریڈنگ منور صاحب سے کروائی گئی ہو۔

مولانا عمری ڈاکٹر منور صاحب سے ادارہ کے بعض انتظامی کام بھی لیتے تھے۔ ادارہ کی مجلس منتظمہ کے سالانہ اجلاسوں کی رودادوں سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً اصحابِ خیر سے رابطہ کرنا، ان کے پاس ادارہ کا تعارف بھیجنا، ان سے ادارہ کا مالی تعاون کرنے کی درخواست کرنا، ادارہ کی لائبریری کو منظم کرنا، ادارہ کے مکتبہ (Sale Depot) کی نگرانی کرنا وغیرہ۔ ادارۂ تحقیق ان دنوں پان والی کوٹھی کے کوارٹرس میں تھا۔ منور صاحب ہی کے زمانے میں ادارہ کی اپنی عمارت تعمیر کرنے کے لیے قطعۂ آراضی خریدنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یونی ورسٹی کے میڈیکل کالج کی پشت پر دوہرّا نامی علاقے میں ایک زمین فائنل کی گئی اور زمین کی خریداری کے بعد اس پر تعمیر کا آغاز کیا گیا۔ ڈاکٹر منور صاحب ان تمام کاموں میں معاونت اور نگرانی کرتے رہے۔

ڈاکٹر منور صاحب کا تقرر ادارہ میں بہ حیثیت رفیق ہوا تھا۔ ان کا اصل کام کسی متعین موضوع پر تصنیف و تالیف تھا، لیکن افسوس کہ تین برس سے کچھ زائد عرصہ ادارہ میں اس کے مستقل رکن کی حیثیت سے رہنے کے باوجود ان کا کوئی علمی کام سامنے نہ آسکا۔ ان کے لیے 'کفر اور اہلِ کفر کے معاملے میں اسلام کا رویہ' عنوان تجویز کیا گیا تھا۔ مجلس منتظمہ کے اجلاسوں کی رودادوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس پر کچھ تحریری کام نہ کر سکے۔ ۵/ اپریل ۱۹۹۲ء اجلاس کی روداد میں درج ہے: ''ڈاکٹر منور حسین اگست ۱۹۹۱ء سے ادارہ سے وابستہ ہوئے..... کفر اور اہلِ کفر کے معاملے میں اسلام کا رویہ۔ اس عنوان کے تحت انھوں نے قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا۔ اس پر ایک تفصیلی مقالہ پیش نظر ہے۔'' پھر اگلے برس ۲۷/ ستمبر ۱۹۹۳ء کو منعقد ہونے والے اجلاس میں جب سکریٹری ادارہ نے یہ رپورٹ دی کہ ''ابھی تک کسی مستقل موضوع پر وہ کام نہیں شروع کر سکے ہیں۔'' تو بہ طور فیصلہ روداد میں یہ لکھوایا گیا: ''ڈاکٹر منور حسین فلاحی اپنے موضوع 'کفر اور کافر: قرآن کی روشنی میں' پر کام نہیں شروع کر سکے ہیں۔ انھیں اس طرف متوجہ کیا جائے۔'' ٹھیک یہی بات اگلے برس ۶/ ستمبر ۱۹۹۴ء کے اجلاس منتظمہ کی روداد میں درج ہے: ''ڈاکٹر منور حسین فلاحی کی حسب سابق تحقیقات اسلامی کی ترتیب میں معاونت حاصل رہی۔ مکتبہ اور لائبریری کے سلسلے میں ان کا کافی وقت صرف ہوتا رہا۔ طلبہ کے مضامین کی اصلاح کی اور مشورے دیے۔ بعض تبصرے لکھے۔ اس کے علاوہ مستقل کوئی تحریری کام نہیں کر سکے۔'' ڈاکٹر منور صاحب کی ادارہ سے علیٰحدگی کے بعد یہ موضوع میرے حوالے کیا گیا۔ الحمدللہ میں نے اس پر کتاب تیار کردی، جو مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے 'کفر اور کافر: قرآن کی روشنی میں' کے نام سے شائع ہو رہی ہے۔

۱۹۹۴ء کے اواخر یا ۱۹۹۵ء کے اوائل میں ڈاکٹر منور صاحب کا شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں تقرر ہو جانے کی وجہ سے ادارہ سے ان کا ضابطہ کا تعلق ختم ہو گیا، لیکن ان کی جز وقتی خدمات بعد میں بھی حاصل رہیں۔ چنانچہ ادارہ کی مجلس منتظمہ کے اجلاس منعقدہ ۲/ اگست ۱۹۹۵ء میں سکریٹری ادارہ کی پیش کردہ رپورٹ میں ان کی ادارہ سے علیٰحدگی کی خبر کے ساتھ یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ وہ حسب سابق وہ تمام امور انجام دے رہے ہیں جو وابستگی کے دوران کرتے تھے۔

مسلم یونی ورسٹی میڈیکل کالج سے متصل دوہرّا نامی علاقے میں ادارۂ تحقیق کے لیے جو قطعۂ آراضی خریدا گیا تھا، اسی کے ایک کونے میں ایک کوارٹر تعمیر کر دیا گیا تھا۔ منور صاحب اس میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔ ادارہ سے علیٰحدگی کے بعد بھی وہ سکریٹری ادارہ کی اجازت سے اس میں رہتے رہے۔ ان سے کرایہ نہیں

لیا جاتا تھا۔ اس کے بدلے میں وہ اعزازی طور پر وہ تمام خدمات انجام دیتے رہے جو ادارہ سے وابستگی کے زمانے میں ان سے متعلق تھیں۔

ڈاکٹر منور صاحب آخری زمانے میں بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کی بیماری جسمانی سے زیادہ نفسیاتی تھی۔ چنانچہ میری ادارہ سے وابستگی (مئی ۱۹۹۴ء) کے کچھ عرصہ کے بعد مولانا عمری نے تحقیقات اسلامی کی ادارت میں مجھ سے تعاون لینا شروع کر دیا تھا۔ پھر جولائی ۲۰۰۲ء سے رسالہ پر باقاعدہ میرا نام معاون مدیر کی حیثیت سے چھپنے لگا۔ یہ تعلق اتنا مضبوط ہوتا گیا کہ اگست ۲۰۱۱ء میں ادارہ سے میری علیٰحدگی کے بعد بھی اب تک جاری ہے۔

ڈاکٹر منور حسین فلاحی کی ادارۂ تحقیق سے وابستگی کا زمانہ اگرچہ بہت مختصر ہے۔ (تین برس باضابطہ، پھر چھ برس جز وقتی اور اعزازی) لیکن اس عرصہ میں انھوں نے جو خدمات انجام دیں، وہ بہت اہم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا اچھا بدلہ عطا فرمائے، ان کی حسنات میں اضافہ فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین، یارب العلمین۔

اردو میں علمی نثر-ایک مطالعہ

ابوسفیان اصلاحی

شخصِ مرتاض ڈاکٹر منور حسین فلاحی کی عقیدت کے دو رخ تھے، جماعت اسلامی سے ایسی عقیدت کہ انھوں نے تمام عقیدتوں کو بالائے طاق رکھ دیا یہی ان کا فکر اور یہی ان کا محور، اکثر صبح سویرے بعد نماز فجر ان سے ملاقات رہتی، چائے پلاتے، ان کی چائے اور رہن سہن سے تصوف کی خوشبو آتی۔ علائق دنیا پر سنگ ساری کو جی چاہتا۔ درمیانِ چائے اگر مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی پر قدرے تنقیدی رویہ اختیار کرتا تو چہرے پر ناگواریوں کے نقوش اگنے لگتے، دلائل پر اتر آتے اور مولانا مودودیؒ کے تجدیدی کارناموں پر اچھی گفتگو کرتے، گفتگو سے ترشح ہوتا کہ مودودیات ان کی یادداشت میں پوری طرح موجود ہے اس کے محاسن ان کے منھ سے بہنے لگتے، اردو ادبیات پر ان کی اتنی نظر نہیں جس قدر ادبیات مودودیؒ پر، یونیورسٹی میں انھیں ترجمان مودودیؒ بھی کہا جاتا۔ یہ سچ ہے کہ مولانا مودودیؒ کو چاٹ کر انسان ایک اسکالر بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر منور صاحب مقرر تو نہیں تھے لیکن مدرس اچھے تھے شعبۂ اردو سے قلیل عرصہ وابستہ رہے، لیکن اپنی تدریسی صلاحیت کی بنا پر طلبہ میں محبوب تھے۔ اساتذہ کرام بھی انھیں قدر کی نظر سے دیکھتے۔ یہاں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ اساتذہ کرام کی ایک بڑی تعداد ہے جو یونیورسٹی سے وابستہ ہے۔ یونیورسٹی کی بنیاد پر ان کی معیشت چلتی ہے لیکن افسوس کہ یونیورسٹی پر توجہ نہ دے کر اپنے اپنے اداروں اور تنظیموں پہ توجہ دیتے ہیں۔ انھیں پر کیوں نہیں معلوم کہ علی گڑھ کی تمام رونق ادارہ سرسید کے سبب ہے۔ یہاں کے تمام ادارے ادارۂ سرسید کی بنیاد پر چلتے ہیں۔ کاش کہ ذمہ دارانِ ادارہ کی اساسی توجہ یونیورسٹی پر ہوتی۔ اگر یہ ادارۂ سرسید نہ رہا تو تمام سوتے خشک ہو جائیں گے۔ بہر کیف یہ ایک درد تھا جو درمیان میں ٹپک پڑا۔

جماعت اسلامی سے آپ کی عقیدت کو آپ نے ملاحظہ کیا۔ ڈاکٹر منور حسین فلاحی کی عقیدت کا دوسرا بڑا مظہر مولانا جلال الدین انصر عمری کی ذاتِ گرامی تھی، مولانا کی شخصیت اور فکر دونوں سے انھیں عشق تھا۔ ان کا یہی عشق مولانا کے لیے باعث التفات تھا۔ راقم سے اکثر مولانا نے ان کی صلاحیت، ان کے مطالعہ اور

جماعت کے تئیں ان کے اخلاص کا ذکر کیا۔مولا نا ان کی دین داری اور توکل کا بھی ذکر کرتے۔ یہ سچ ہے کہ چلتے پھرتے تصوف تھے، یونیورسٹی کے ماحول اور خوش نوائیوں نے ان کا کچھ نہ بگاڑا۔ ہمیشہ ٹوپی سر پر ٹکی رہتی، یہی ان کی شناخت اور کج کلاہی تھی۔شیروانی ان کا شخصی جز تھی لیکن علی گڑھ کٹ پاجامہ ان کو لبھا نہ سکا، چوڑے پائینچے کے پاجامے سے شیروانی کی زینت زنگ آلود ہوتی ہوئی نظر آتی۔ چوں کہ مولا نا عمری ان کے متقدی ومرشد تھے اس لیے انھوں نے اس میں مولا نا کی اقتداء کی۔مولا نا عمری کا چوڑا پاجامہ بھی شیروانی کے حسن پر ضرب کاری کے مترادف ہے۔ بہرکیف بتانا تو یہ ہے کہ مولا نا سے انھیں گہری عقیدت تھی اب اس کی جگہ مولا نا محمد رضی الاسلام ندوی نے لے لی ہے۔مولا نا منور کی اسی عقیدت نے انھیں ادارہ تحقیق وتصنیف میں فروکش کیا۔ وہ جماعت کے کاموں میں لگے رہتے۔مجلّہ تحقیقات اسلامی کے مضامین کا پروف پڑھتے،مولا نا عمری کو ان کی پروف ریڈنگ پر اعتماد تھا۔بعض حوالوں کے لیے انھیں یونیورسٹی دوڑاتے۔مولا نا آزاد لائبریری میں انھیں دیکھتا تو پوچھتا کہ کیا مولا نا کے حوالے تلاش کر رہے ہیں؟ جواب اثبات میں ملتا۔ یہ سچ ہے کہ ایسا تحریکی اخلاص دن بہ دن ختم ہوتا جارہا ہے۔ جماعت اسلامی قحط الرجال کا شکار ہے۔اب تو ایسا سقیم ہوچکی ہے کہ اسکالرز پیدا ہونے بند ہوگئے ہیں اس سے بڑھ کر افسوس تو یہ ہے کہ اب اس میں خدام کے برعکس آفیسرز پیدا ہورہے ہیں۔اللہ سے دعا ہے کہ اسے منور حسین فلاحی جیسے مخلص رضا کار ملیں جو جماعت کی فکری ترسیل وتوسیع کرسکیں خاکسار مولا نا عبدالغفار ندویؒ کے اخلاص اور درس قرآن سے چار سال تک مستفیض ہوتا رہا ہے،ان کے کمالات کو ایک مضمون میں قلم بند کر چکا ہوں،مولا نا ابواللیث اصلاحی ندوی کی تحریکی دردمندیوں کو دیکھ چکا ہوں، نیز انھیں لفظوں میں قید بھی کر چکا ہوں،مرزا اشفاق احمد اصلاحی اور مولا نا احمد محمود اصلاحیؒ کی جماعتی تڑپ بھی میرے سامنے ہے، دونوں مرحومین نے اپنی تمام تر توانائی جماعتی امور میں صرف کردیں۔ یہ واحد جماعت ہے جو ملت اسلامیہ کے تمام دھڑوں کی بات کرتی ہے،ان کے اتحاد واتفاق کی بات کرتی ہے۔

ڈاکٹر منور حسین فلاحی کے چند مقالات مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے پڑے ہیں،لیکن ان کی بنیاد پر ان کا علمی تعین ممکن نہیں ہے۔یہاں ان کا تحقیقی مقالہ ان کے ذہنی رخ کا پتا دیتا ہے جس کا عنوان ''اردو میں علمی نثر'' ہے۔اس مقالہ میں سائنس سے متعلقہ بہت سی تصانیف کا اندراج ہے جو خاکسار کے نزدیک عنوان سے میل نہیں کھاتی ہیں۔انگریزی کے دو لفظ Academic اور Scientific دونوں میں فرق ہے۔اکیڈمک میں صرف علمی تصانیف آئیں گے مثلاً سرسید کی تبیین الکلام،شبلی کی الفاروق،مولا نا صفی الرحمٰن مبارکپوری کی الرحیق المختوم،مولا نا مودودی کی پردہ،مولا نا علی میاں ندوی کی مسلمانوں کا عروج وزوال،خلیق احمد نظامی کی

مشائخ چشت، الطاف احمد اعظمی کی اقبال کے بنیادی افکار، پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کی عہد نبوی کی تنظیم وریاست اور رفیع الدین ہاشمی کی تصانیفِ اقبال کا تحقیقی وتوضیحی مطالعہ۳ خالصتاً علمی ہیں انھیں سائنٹفک کہنے میں مجھے تامل ہے ان کتابوں کے اسالیب کوسائنٹفک کہنا درست ہوسکتا ہے۔یعنی اسلوب کانٹے پر تلا ہوا ہو۔عبارت آرائی، تکرار اورمترادفات سے پاک ہو۔ مثلاً مولانا مودودی اور اسلوب احمد انصاری کا اسلوب سائنٹفک ہے۔مولانا آزاد مولانا ابوالحسن علی ندوی اور آل احمد سرور کا طرزِ بیان تصنع وتکلف سے پُر اور مترادفات پرمبنی ہے۔مولانا آزاد کی تحریر کے متعلق رشید احمد صدیقی کا یہ فرمانا حق بجانب ہے کہ مولانا آزاد کے یہاں مواد کم ہے اوراسٹائل زیادہ۔

ڈاکٹر منور حسین فلاحی کا یہ تحقیقی مقالہ ان کے انہاک، علمی اشتغال اور دیدہ ریزی پردال ہے۔اس کی سب سے اولین افادیت یہ ہے کہ اردو کے قدیم ذخائر کومنظر عام پرلایا گیا ہے۔اس مقالے سے اردوزبان کی علمی رفعت اورمختلف الجہات وقعت کا اندازہ ہوتا ہے۔آزادی سے قبل تیز رفتاری کے ساتھ اردوترقی کے زینوں کو طے کررہی تھی۔اردو کے مختلف مراکز تھے جن کی نمائندگی کسی نہ کسی حدتک اس کتاب میں کی گئی ہے لیکن دواہم ترین مرکز کے نام نہیں لیے گئے ہیں۔ایک توامرتسر کا کہیں اس کتاب میں نام تک نہیں لیا گیا ہے یہ اس مقالے کی بڑی کمی ہے۔۱۹۱۴ء سے قبل امرتسر چھاپے خانوں کا مرکز تھا۔اردو اخبارات، رسائل اور تصانیف کے چھپنے کی جوروایت امرتسر میں رہی ہے اس کا موازنہ کسی حدتک لاہور سے ممکن ہے لیکن کسی مرکز سے نہیں کیا جاسکتا۔مناسب تھا کہ وہاں کی علمی نثر کا جائزہ لیا جاتا۔پانی پت، قادیان اور جالندھر علوم وفنون کے منبع ومصدر تھے۔اس مقالے میں دارالمصنّفین کی زریں خدمات کوموضوع بحث بنایا گیا ہے لیکن ندوۃ المصنّفین کی علمی نثر سے اغماض برتا گیا ہے۔اسی طرح ہندوستان کے دینی مدارس اوران کے فضلاء نے سماجی علوم کے حوالے سے زبردست خدمات انجام دی ہیں بلکہ اردو کے ارتقاء میں مدارس کی کاوشیں جورہی ہیں ان کے روبرو انگریزوں کے قائم کردہ مراکز کوکرنا بڑا مشکل ہوگا۔

ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے یہ کہہ کراپنا دامن چھڑالیا کہ 'اردو میں دینیات اور مذہبیات کا ایک بڑا حصہ ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ دینی لٹریچر بالخصوص ملفوظات اورمتصوفانہ تصانیف نے اردوکوعلمی آہنگ سے قریب کرنے میں جس کردار کا اظہار کیا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔اس میں تاریخی، جغرافیائی، معاشیات اور سیاسیات پرمبنی تصانیف کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ان موضوعات نے اردوکواعتبار واستناد کا درجہ دیا ہے۔اردو کی علمی تزئین میں ریاضت کا ثبوت دیا ہے، لیکن اردو باغ کی شادابی وتوانائی کے پیچھے دینی لٹریچر کی جوتاثیر وتائید

ہے وہ کسی اور کی نہیں۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ اردو کے بیشتر ادباء ''فسانہ عجائب'' کے آہنگ پر فدا تھے۔ مترادفات کی قیادت کے زیر نگیں تھے اور عبارت کی پیشوائی پر جان چھڑکتے تھے۔لیکن دینی مصنّفین ومحققین نے اردو کو علمی وفکری زبان بنانے میں نا قابل فراموش کارنامے انجام دیئے۔ مقالات شبلی میں علامہ شبلی نے سرسید کو اردو کا محسن قرار دیا ہے۔ سرسید نے اپنی دینی تحریروں، سماجی وتعلیمی خطبات، مقالات اور تفسیری خدمات کی بنیاد پر اردو کو علمی مزاج سے ہم آہنگ کیا۔خود شبلی نے اپنی سیرۃ النبی اور دینی مقالات کے سبب اردو لٹریچر کو مدلل ومستند بنایا، مولانا مودودی نے اردو کی آرائش میں زبردست کارنامے انجام دیئے۔ اردو کے ناقدین ومبصرین کا اعتراف ہے کہ اردو کے اسلوب بیان کو علم وحکمت سے عبارت کرنے میں مثالی خدمات انجام دیں۔معروف پاکستانی اسکالر ابوالخیر کشفی اور پروفیسر خورشید احمد نے مولانا مودودیؒ کی ادبیات پر گفتگو کی ہے۔تفہیم القرآن، رسائل ومسائل،تنقیدات، پردہ اور سود ایسی تصانیف ہیں جن کی وجہ سے اردو کو دانش ورانہ انداز میسر ہوا۔اسی طرح اردو کے طرز ادا کو علم ودانش سے مربوط کرنے میں مولانا وحیدالدین خاں کی زریں اور علمی سرگرمیوں کو نظرانداز کرنا ناممکن ہے۔ وہ بے شمار تصانیف کے مصنف ہیں۔۱۸۵۷ء کے بعد کی نثر پر ان کی تحریروں کے زبردست اثرات رہے۔ان کے ذکر سے پہلوتہی برتنا مستبعد ہے۔ یہ ایک طویل داستان ہے جس کا ذکر ہونا اس مقالے میں انتہائی ناگزیر تھا۔ پر افسوس کہ طوالت کے خوف سے رأس الخزینہ کا ذکر نہ چھیڑا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔عہد حاضر کے ارباب اردو دینی تحریروں کو قابلِ اعتنا قرار نہیں دیتے ہیں جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں اس کا اعتراف واضح الفاظ میں کیا ہے کہ تراجم وتفاسیر قرآن نے اردو کو ایک مدلل اور ٹھوس زبان بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس مقالے میں ایک کمی کا مزید احساس ہوتا ہے کہ مخطوطات پر گفتگو نہیں کی گئی ہے جب کہ مخطوطات نے اردو کے استحکام واستدلال میں درخشاں اقدامات انجام دیئے ہیں اس تعلق سے مشفق خواجہ کی ترتیب کردہ ''جائزہ مخطوطات اردو'' کو دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ جائزہ ۱۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔[۱۴] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخطوطات نے اردو کے استقامت میں لائق اعتناء کارنامہ انجام دیا ہے۔اگر کچھ صفحات اس طور پر اس میں شامل ہوتے کہ اردو کی علمی نثر کی تحکیم وتنظیم میں ان کے کیا حصے رہے ہیں تو ایک بڑی چیز ہوتی۔اسی طرح یہ گوشہ بھی لائق التفات ہوتا کہ اردو رسائل واخبارات کی علمی نثر کی ترویج وترقی میں کیا کیا اجتہادی کارفرمائیاں رہی ہیں تو بہتر ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ اردو کو علمی، استدلالی اور اجتہادی رنگ دینے میں اردو صحافت کا گراں قدر حصہ رہا ہے۔اردو صحافت پر خاصہ کام ہو چکا ہے۔ یہاں سرسید کے بھائی کے ''سید الاخبار'' اور ان کے ذاتی چھاپے خانے کا ذکر ضروری تھا۔سرسید کے گھرانے نے اردو نثر کی تعریف وتشہیر میں غیر معمولی کارنامہ انجام دیا

ہے۔اگراس مقالے میں مذکورہ پہلوؤں کولائق توجہ بنایاجاتاتواس کےوقارومعیارمیں مزیداضافہ ہوتا۔

ایک دیانت دارمبصر کافریضہ ہے کہ وہ اپنے احساسات کے ساتھ خریدوفروخت کا سودانہ کرے۔اسی فریضے کی ادائیگی کے پیش نظر مذکورہ سطورترتیب دی گئی ہیں۔اب مزیدخیالات اس طرح نقل کرناچاہوں گا۔ ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ تحقیقی مقالات کا معیاردن بہ دن روبزوال ہے۔پروفیسرابوالکلام قاسمی کاتحقیقی مقالہ ''اردوتنقید پرعربی اورفارسی کااثر'' بھی خاصا معیاری رہاہے۔جس کی ستائش پروفیسرنذیراحمداوررفیع الدین ہاشمی نےکی ہےاس کاایک باب راقم کےتوسط سےمجلّہ''نقوش''لاہورمیں شائع بھی ہواہے۔عرصہ درازکے بعدایک قابل قدراورنامہ تحقیق''اردومیں علمی نثر''کےعنوان سےمنظرعام پرآیاہے۔اس کتاب کوکن محبین علم نےحلقہ علم وادب تک پہنچایاہے،راقم کےعلم میں نہیں لیکن ایک بڑاکام کیاہے۔سب سےعظیم خدمت ترسیل علم ہے۔یہی حقیقی عبادت ہےاس کےبغیرعبادت شناسی بلکہ خالق شناسی ناممکن ہے۔اسی لیےاللہ کےرسول صلی اللہ علیہ وسلم کوحکم ہواکہ افزونی علم کےلیےاس طرح دعاکیجیےکہ''رب زدنی علما''(اےمیرےرب!مجھے علم سےمملوکردے)''علماً''میں تمام علوم وفنون نافعہ شامل ہیں اس میں صرف تفسیرقرآن ہی لکھنانہیں آتابلکہ تعمیری افسانہ اورناول لکھنابھی شامل ہےاسی میں ڈاکٹرمنورحسین فلاحی کی''اردومیں علمی نثر''بھی شامل ہے اس علمی سعی کےذریعہ بہت سےعلمی افق روشن ہوتےہیں بلکہ مجھ کم علم کےسامنےعلم وفن کےنئےبام ودروا ہوتےہیں۔اس کتاب میں فورٹ ولیم کالج کااچھاتعارف پیش کیاگیاہے۔یہاں یہ بات موضوع بحث ہے کہ اس کالج سےبہت پہلےسلیس اردوکاآغازہوچکاتھا۔اس تعلق سےدونام محقق جمیل جالبی اورڈاکٹرگیان چندرجین کےنام لیےگئےہیں۔گیان چندجین کواردونےبہت کچھ دیا۔شہرت اوردولت دونوں ملیں۔لیکن جین کادل اردوکےتئیں صاف نہیں تھا۔آخری دنوں میں اپنی فرقہ وارانہ ذہنیت کےسبب اردوکومسلمانوں کی زبان قراردیااوراردوکی وکالت کرتےکرتےاردوپرتعصب اورتقسیم کرنےوالی زبان کاالزام لگایاجس کاشمس الرحمٰن فاروقی اورمرزاخلیل احمدبیگ نےمدلل جواب دیا۔اسی ذہنیت کااعادہ جین صاحب نےیہاں کیاہے:

> ''عام خیال یہ ہےکہ میرامن وہ مجتہدتھےجنھوں نےعربیت کےطلسم کوتوڑکےپہلی بارشستہ وسلیس زبان لکھی لیکن اجتہادواولیت کاجوسہراباغ وبہارکےسرباندھاجاتاہےوہ دراصل مہرچند کھتری کی داستان''نوآئین ہندی''عرف قصہ ملک محمودگیتی افروز(۱۲۰۸ھ)کاحق ہے''۔۵؎

میرامن اورمہرچندکھتری کاموازنہ کرتےہوئےکھتری کےسرپرسہرۂ افتخارباندھاگیاہےجودرست بھی ہوسکتاہےلیکن یہاں بھی جین صاحب کی مسموم ذہنیت کارفرماہےاردوکےتئیں نفرت سےان کادل لبریزتھا،

یہی حال گئو دان کے مصنف پریم چند کا تھا جنھوں نے سرسید پر اپنے تاثرات قلم بند کرتے ہوئے سرسید پر اردو زبان کے بڑھاوے کا الزام لگایا، مزید انھیں ہندی زبان کا دشمن قرار دیا جس کا ایک جائزہ راقم نے تہذیب الاخلاق میں لیا ہے۔٦

یہ بات اوپر آچکی ہے کہ اس کتاب میں اجتہادات اور معلومات کا ایک خزانہ مرقوم ہے۔ جمیل جالبی کے حوالے سے بتایا گیا کہ اردو کی پہلی کتاب تاریخ ''قصہ واحوال روہیلہ'' ہے جس کے مصنف سید رستم علی بجنوری ہیں۔ اس طرح کی بہت سے چونکا دینے والے مبادیات کو ڈاکٹر منور حسین نے اس میں جمع کیا ہے اس مقالے میں تاریخ اودھ بھی موضوع بحث ہے ضروری تھا کہ اس تعلق سے عبدالحلیم شرر کی معروف تصنیف ''پرانا لکھنؤ'' اور ''گزشتہ لکھنؤ'' کا ذکر کیا جاتا۔ لکھنؤ کی تہذیب وسکونت نیز تہذیبی تاریخ کی شناخت اس کتاب کا اہم رول ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اہل تشیع کا ایک خالصتاً علمی کتب خانہ ''ناصریہ'' لکھنؤ میں تھا جو اپنے مصادر ومراجع نیز مخطوطات کی بنا پر مخصوص اہمیت کا حامل تھا جس کی افادیت کا ذکر علامہ شبلی نے کہیں کیا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس کتاب میں اس کے اوراق پلٹے جاتے۔ یہاں یہ بات بھی یاد آرہی ہے کہ اس مقالے میں اردو نوازی بالخصوص نثر نوازی کا تجزیہ پیش کیا جاتا تو اس کا وزن بڑھ جاتا۔ اسی طرح اہل قادیان نے اپنے لٹریچر کے ذریعہ اردو زبان کو بام عروج پر پہنچایا اس کا انکشاف واہتمام لازمی تھا لیکن یہ قصہ بھی تشنہ رہا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ مقالہ نگار نے دلی کالج کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دہلی کالج اردو زبان کی ترویج میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ اس کی ایک بڑی خدمت ''تاریخ انگلستان'' ہے جسے وہاں کے اساتذہ کرام نے ترجمہ کیا ہے۔ اس تعلق سے مالک رام کا ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے جس سے کالج کی خدمات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ وہاں کے اساتذہ کرام میں امام بخش صہبائی، مولوی مملوک علی نانوتوی، ماسٹر رام چندر، منشی چندرائے بہادر، ماسٹر پیارے لال، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد، شمس العلماء منشی ذکاء اللہ، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین، میر ناصر علی ایڈیٹر صلائے عام اور مولوی کریم الدین کے اسماء گرامی آئے ہوئے ہیں۔ یہ وہ اساتذہ کرام ہیں جن کے فکر وخیال پر اردو کھڑی ہے۔ جس کے دامن پر ہندوستان کی تاریخ وتصویر ہے لیکن آج اس دلکش تصویر کا تفصیلی سلسلہ جاری ہے۔ اگر ان اساتذہ پر ایک نظر ڈالیں تو اردو کے تزئین وتحسین میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کا برابر حصہ ہے۔ یہ زبان سیکولزم کا دستاویز ہے جسے نذر آتش کیا جارہا ہے کاش مالک رام جیسے غیر متعصب اور انصاف پسند مصنف پیدا ہوتے۔ ڈاکٹر منور حسین کی یہ کتاب عصرِ حاضر

کی فرقہ واریت پر ایک طمانچہ ہے۔اس کتاب سے یہ صدائے باز گشت پیہم اٹھ رہی ہے کہ اردو کی تعظیم وتکریم میں دونوں کی مجتہدانہ کاوشیں شامل ہیں۔

دلی کالج کے حوالے سے سرسید نے بھی اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔نیز یہ وضاحت بھی کی ہے کہ اس کالج نے سرسید کے ذہن وفکر کی تشکیل میں اہم رول ادا کیا ہے اور یہاں کے اساتذہ کرام سے خاصا استفادہ کیا۔کیا ہی بہتر ہوتا کہ مقالہ نگار سرسید کے ان تاثرات سے استفادہ کرتے۔اسی کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی اٹھانا ضروری ہے کہ مصنف نے اپنی اس تحقیق کی ترتیب میں مولوی عبدالحق کی نگرانی میں ترتیب کردہ ''قاموس الکتب'' سے خوب استفادہ کیا ہے بلکہ اس کی وجہ سے مصادر کی تلاش وتتبع میں سہولت ہوئی ہوگی۔اس کی پہلی جلد میں ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء کے دوران لکھی جانے والی تصانیف ورسائل کی تعداد ۱۲۰ ہے خود مقالہ نگار کی تحقیق کا دائرہ بھی یہی ہے اس لیے یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں کہ اس قاموس نے ان کی اساسی رہنمائی کی ہے۔یہاں یہ بات مبالغہ کے طور پر نہیں بلکہ حقیقت کی عکاسی طور پر کہنا ضروری ہے کہ ادارہ سرسید کے فضلاء نے اردو کی تقویت میں نہ جانے کتنے مراحل طے کیے ہیں، اس ضمن میں یہ بتانا بھی مفید ثابت ہوگا کہ شعبہ اردو نے اپنے ایک سمینار کی روداد کو ''دانش گاہِ علی گڑھ میں اردو ادب'' کے عنوان سے شائع کیا جس سے اردو زبان وادب کے تئیں ادارۂ سرسید کے کارناموں کو سمجھا جاسکتا ہے۔سرسید کے بھائی سید احمد کے اخبار سید الاخبار، ڈیوٹی سوسائٹی، انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق نے اردو کی پال وبرداخت میں نہ جانے کتنے معرکے سر کیے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے تہذیب الاخلاق کے اثرات کو علمی انداز میں بیان کیا ہے۔[۸] یہاں یہ نکتہ بھی اٹھانا باعث انشفاع ہے کہ سرسید نے ایک ایسی انجمن کی بنیاد ڈالی تھی جس کا مفید کتابوں کا اردو میں منتقل کرنا اور وضع اصطلاحات کی ذمہ داریوں کو نبھانا تھا جس میں وحیدالدین سلیم، مولوی فیض الحسن سہارنپوری، اور مولانا فراہی وغیرہ شامل تھے۔یہاں یہ بتانا بھی باعث افادیت ہوگا کہ وحیدالدین سلیم سرسید کے علمی سکریٹری تھے۔سرسید کی علمی خدمات میں آپ کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن آج ہم اس کی تعیین سے قاصر ہیں۔مولانا فیض الحسن سہارنپوری سرسید کے استاد ہیں، مولانا فراہی کی عربی دانی میں نکھار پیدا کرنے والے یہی سہارنپوری ہیں، علامہ اقبال کو اسلامی شاعر بنانے والے یہی سہارنپوری ہیں، ہمارے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا تعلق سہارنپوری کے خانوادے سے تھا۔مولانا فراہی کی عربی دانی اور انگریزی دانی سے سرسید واقف تھے۔جب کوئی علمی مسئلہ زیر بحث ہوتا تو سرسید کی نظریں فراہی کو تلاش کرتیں۔کیا ہی مناسب ہوتا کہ مقالہ نگار اس انجمن

کا اس میں ذکر کرتے ۔سرسید نے مہم چھیڑی تھی کہ مغرب کے علمی اور سائنسی سرمایہ کو اردو میں منتقل کیا جائے ۔ مغرب کی علمی قیادت کا انھیں اندازہ ہو چلا تھا ۔ اردو کو علمی اور شعوری زبان بنانے کے تعلق سے سرسید کے انہماک واشتغال کو بالائے طاق رکھنا آسان نہیں ہے ۔ اس کتاب کا یہ پہلو ستائشی ہے کہ سرسید کی سین ٹیفک سوسائٹی کی خدمات کو حیطہ تحریر میں لایا گیا ہے ۔سوسائٹی نے ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن (Mount stuart Flphinston) کی کتاب کو ''تاریخ ہندوستان'' کے عنوان سے اردو میں منتقل کیا ہے ۔ ۱۸۶۶ء میں دو جلدوں پر مشتمل یہ کتاب زیور طباعت سے سرفراز ہوئی ۔ مصنف کو ہندوستان اور ساکنانِ ہندوستان کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ۔ مصنف کے کاندھوں پر بمبئی کی گورنمنٹ کا بھی فریضہ تھا ۔ اس کی پہلی جلد میں صرف برادر وطن کے عادات پر روشنی ڈالی گئی ہے اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ہندوؤں میں نہایت سخت بُرائی دروغ گوئی ہے ، جس میں وہ مشرق کے بھی اور قوموں سے بہت سبقت لے گئے ہیں ان پر اگر جھوٹ کا اتہام بھی لگایا جاوے تب بھی غصہ نہیں آتا ۔ جو شخص ایسی بات پر جس سے اس کے نزدیک اس کی عزت میں ذرا بھی بٹہ لگتا ہے ، خون بہانے کو موجود ہوتا ہے وہ جھوٹ کا الزام لگانے سے نرمی کے ساتھ یہ جواب دیتا ہے کہ مجھ کو جھوٹ بولنے سے کیا حاصل تھا'' ۔۹

یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ سرسید کے تمام کاموں میں مسلم اور ہندو بھائی برابر کے شریک تھے ۔ ان کے احباب میں ہندو بھائیوں کی مخصوص تعداد بھی اس کتاب سے سرسید کی غیر متعصب ذہنیت سامنے آتی ہے ۔ اس تناظر میں پروفیسر فیضان مصطفی کا مقالہ "The Composite Campus" حد درجہ اہمیت کا حامل ہے ۔ جس میں اقلیتی کردار پر مدلل بحث کی گئی ہے جو اپنے میں انفرادیت کی حامل ہے ۔۱۰ سین ٹیفک سوسائٹی کے ایک نامور مترجم گنگا پرشاد تھے ۔ کالج کے طلبہ میں برادرانِ وطن کے بچے بغیر کسی امتیاز کے پڑھتے تھے ۔ اسٹریچی ہال کی دیواروں اور یونیورسٹی کی مختلف دیواروں پر ہندو بھائیوں کے اسماء گرامی کندہ ہیں ۔ عمر کے آخری حصوں میں سرسید کو فرقہ وارانہ ذہنیت کا ڈر ہونے لگتا ہے ۔ سرسید کا مشرقی تاریخ اور تہذیب سے گہرا تعلق تھا انھیں اسلامی اندلس سے جذباتی تعلق تھا ۔ وہ اسلامی تہذیب کی ترسیل وتشہیر کے فکر مند تھے اسلامی نشاۃ ثانیہ ان کی تحریک کا ہراول تھی جس طرح وہ ملت اسلامیہ کو اسلامی تہذیب کا نمائندہ بتانے کے خواست گار تھے اسی طرح وہ اہل خانہ کے ذہن ودماغ کو اسلامی تہذیب سے بھرنے کے لیے فکر مند رہے ۔ علامہ اقبال نے راس مسعود کو ملت اسلامیہ کا قائد قرار دیا ۔ اپنی نظم میں زبردست خراج عقیدت پیش کیا ۔ یہی وجہ ہے

کہ سرسید کے بھتیجے سید احمد خاں نے میریا کالی کٹ کی انگریزی تصنیف کا ترجمہ ''تاریخ اسپین'' کے نام سے کیا۔ اس کی پہلی جلد ۸۲۵ پر مشتمل ہے۔ مترجم نے مقدمہ میں تحریر کیا کہ ہمارے بزرگ (سرسید احمد خاں) نے تمام وکمال اس کی ورق گردانی کی ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ مزید یہ بھی وضاحت کی ہے کہ یہ ترجمہ طلبہ العلوم علی گڑھ اور اہل ہند کے استفادہ کے لیے کیا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ سرسید مستقل ایسی تصانیف کو اردو میں منتقل کرنے کے خواست گار رہا کرتے تھے مولانا فراہی سے بھی اس طرح کے کام کیے۔ مترجم کا اسلامی اسپین سے جذباتی تعلق تھا۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنے دیباچہ میں یوں کیا ہے:

> ''عبدالرحمٰن نے اس مسجد کی تعمیر میں دو لاکھ سکہ طلائی سے زیادہ صرف کیا تھا اور وہ مسجد چھ فٹ طول میں اور ڈھائی سو فٹ عرض میں تھی اور شمال سے جنوب تک انیس محرابیں اور اس کے محاذی میں شرق سے غرب تک اڑتیس محرابیں تھیں ایک سو ترانوے ستون سنگ مرمر کے نہایت خوبصورت تھے اور انیس کلاں دروازے جانب جنوب کے پیتل کے ڈھلے ہوئے تھے۔ پچھّم کے دروازے میں بالکل سونے کے پتر جڑے تھے اور نو دروازے شرق اور نو دروازے غرب میں تھے اور اس مسجد کا مینار دو سو چالیس فٹ بلند تھا۔ اور تین سنہرے گولے مینار پر تھے اور گولوں پر بشکل انار مخروطی کلس طلائی تھی اور ہمیشہ شام کی نماز کے وقت چار ہزار چھ سو فیتل سوز روشن ہوتے تھے اور چوبیس ہزار پونڈ یعنی تین سو من پختہ تیل کا سالیانہ خرچ تھا اور ایک سو پونڈ یعنی ڈیڑھ من پختہ عنبر اور عود یا لوبان خوشبو کے واسطے جلتا تھا اور امام کے مقام میں سونے کا چراغ دان جلتا تھا اور اس میں نہایت درجہ کارسازی اور عمدہ صناعی ہوتی تھی''۔[۱۱]

یہ بات ابتداء میں آچکی ہے کہ اس کتاب کے دامن لولو ومرجان سے لبریز ہیں۔ مقالہ نگار کی ریاضت ومشقت مثالی ہے۔ تحقیق یکسوئی چاہتی ہے بقول رشید حسن خاں کے کہ محقق کو صوفیہ کے ترک دنیا کے نہج پر چلنے کی ضرورت ہے۔ وہ علائق دنیا سے کٹ کر راہب بن جاتا ہے۔ محقق راہب بن کر بڑے کام کر سکتا ہے۔ رشید حسن خاں نے مزید کہا ہے کہ آج کا محقق ومصنف کثیر المقاصد ہے۔ جس کی وجہ سے کسی ایک نکتے پر اس کی نظر مرکوز نہیں ہوتی ہے۔ محقق اگر موحد ہے تو مطالبات تحقیق پورے ہوں گے اور اگر محقق مشرک ہے تو تحقیقی فرائض کی ادائیگی اس کے لیے ناممکن ہے۔ تحقیق توحید کی خواہاں ہے۔ شرک کی قطعاً نہیں۔[۱۲] توحیدی تحقیق کے علمبرداروں میں مشفق خواجہ، جمیل جالبی، محمود شیرانی، معصومی، مالک رام، امتیاز علی عرشی اور نذیر احمد وغیرہ کے اسماء گرامی لیے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر منور حسین فلاحی کا یہ کام تحقیقی اعتبار سے لائق ذکر ہے۔ فلاحی صاحب

بہت جلد اللہ کو پیارے ہو گئے۔اگر ہوتے تو دنیائے تحقیق میں مزید رنگ بھرتے اپنی اس تحقیق کا ماحصل انھوں نے ان لفظوں میں پیش کیا ہے:

> ''اس مقالہ میں تقریباً دوسو مؤلفین ومترجمین کی تصانیف وتراجم کا جائزہ لیا گیا ہے۔ان میں مسلمان اہل قلم کی تعداد ۱۵۰ ہے اور غیر مسلم مصنّفین ومترجمین ۵۶ ہیں،ان میں سے چھ انگریز ہیں۔ایسے عہد میں جب کہ اردو کے خلاف غیر مسلموں کا ایک محاذ قائم ہو چکا تھا اور اس کے مقابلہ میں ہندی کو فروغ دینے اس کے ارتقاء کی تدبیریں کرنے اور اسے سرکاری زبان بنانے کی کوشش شدومد سے جاری تھیں غیر مسلموں کا اتنی بڑی تعداد میں اردو کا علمی خدمت کرنا بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو زبان ہندوستان میں اس عہد کی واحد علمی زبان بن رہی تھی۔دوسری طرف اس سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ جدید علوم کے حصول میں مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر مسلم کافی آگے تھے اور اسی بنا پر وہ حکومت کے اعلیٰ مناصب پر بھی تناسب کے اعتبار سے زیادہ تھے۔اپنی اسی امتیازی حیثیت میں حکومتی اداروں کی زیر نگرانی زیادہ تر اور بعض پرائیویٹ اداروں کی ایما پر نیز ذاتی ذوق ورجحان سے بھی انھوں نے اردو میں قابل قدر علمی سرمایہ فراہم کیا اس میں بڑی تعداد تراجم کی ہے۔اسی طرح نصابی کتابیں بھی خاطر خواہ تعداد میں ان کے ذریعہ تیار ہوئیں اس لیے کہ وہ حکومت کے قائم کردہ تعلیمی اداروں اور اسکول بک سوسائٹیز سے بھی منسلک تھے''۔[۱۳]

ڈاکٹر منور حسین فلاحی کا یہ تحقیقی مقالہ انھیں بہت دنوں تک زندہ رکھے گا،لیکن اس کی یہ کمی بار بار ستاتی رہے گی کہ قرآنیات،اسلامیات اور دینیات سے متعلق اہم علمی نثر سے صرف نظر کیا گیا۔مقالات سرسید، مقالات سید سلیمان ندوی،مقالات عبدالسلام ندوی،افادات مہدی،شاہ ولی اللہ کے بیٹوں کی خدمات،احمد رضا خاں بریلوی کی اردو تصانیف،جامعہ عثمانیہ اور دارالعلوم دیو بند کی اردو زبان میں موجود سرمایہ کو پس پشت ڈالا گیا۔اس میں کلام نہیں کہ اردو زبان کو ممتاز بنانے میں جو کردار علماء کرام،مفسرین اور مترجمین کا رہا ہے وہ کسی اور کا نہیں۔کاش ارباب اردو کو اسی طرح احساس ہوتا جس طرح جمیل جالبی کو احساس رہا ہے۔اس مقالہ کے محاسن کے ساتھ یہی ایک بڑا نقص ہے جسے خوف طوالت کا ذکر کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا گیا۔مفلوظات اور مکاتیب سے پہلو تہی بھی شاق گزرتی ہے۔مکاتیب نے ایک ایسا ادب تخلیق کیا جو تصنع وتکلف سے پاک تھا۔اس ضمن میں ''مکتوبات شیخ الاسلام'' کا ذکر کرنا انتہائی ناگزیر ہے۔جنھیں مولانا نجم الدین اصلاحی نے علمی

انداز میں ترتیب دیا ہے۔ بہرنوع اس وقیع کام پر ڈاکٹر فلاحی لائق مبارک باد ہیں اور یہی ان کے لیے سچا خراج عقیدت بھی۔

حواشی ومراجع

ا۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: اردو میں علمی نثر، ڈاکٹر منور حسین فلاحی، براؤن بک پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۲۰ء، ص: ۳۴۹-۳۵۱

۲۔ ڈاکٹر منور حسین کا ایک کتابچہ لائق مطالعہ ہے۔ دیکھیے: مولوی چراغ علی کی علمی خدمات، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۷ء، صفحات: ۵۹

۳۔ رفیع الدین ہاشمی کی کتاب ''تصانیف اقبال کا تحقیقی وتوضیحی مطالعہ'' کے لیے دیکھیے: مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتبہ: ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، آر آر پرنٹرز، لاہور، جون ۲۰۰۹ء، ص: ۱۲-۱۳

۴۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: جائزہ مخطوطات اردو، مشفق خواجہ، مرکزی اردو بورڈ لاہور، طبع اول فروری ۱۹۷۹ء، جلد اول، صفحات: ۱۲۵۶

۵۔ اردو میں علمی نثر، ۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء، ڈاکٹر منور حسین فلاحی، براؤن بک پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۲۰ء، ص: ۲۲

۶۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: پریم چند کا مضمون ''سرسید کا تحقیقی جائزہ''، تہذیب الاخلاق، اے.ایم.یو. علی گڑھ، اگست ۲۰۱۵ء، ۳۴/۸، ص: ۴۷-۴۸

۷۔ گزشتہ لکھنؤ کا انگریزی میں "The Last fase of oriental culture" کے عنوان سے ترجمہ ہو چکا ہے، جسے آکسفورڈ پریس نے شائع کیا ہے۔ عبدالحلیم شرر کے ناولوں پر پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے۔

۸۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: ''تہذیب الاخلاق'' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا نمائندہ رسالہ اور اس کی اہمیت، ڈاکٹر سید عبداللہ (فکر وآگہی، علی گڑھ تحریک-سرسید اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نمبر، جلد نمبر: ۳۰-۳۲، ۲۰۲۰ء، ص: ۷۰۱-۷۰۵

۹۔ اردو میں علمی نثر، ص: ۱۲۸

۱۰۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: The Indian Express Tuesday, December, 22, 2020, p. 7

۱۱۔ ایضاً، ص: ۲۱۷

۱۲۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، ص: ۱۵

۱۳۔ ایضاً، ص: ۳۲۳

اردو میں علمی نثر کا مسئلہ

امتیاز احمد

نثر کیا ہے؟ اور شاعری کسے کہتے ہیں؟ یہ سوال بظاہر جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہے نہیں۔ ان دونوں کی الگ الگ خصوصیات کیا ہیں؟ ان موضوعات پر علمائے ادب نے بہت تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ اردو میں بھی شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی کتاب ''شعر غیر شعر اور نثر'' میں اسی عنوان سے شامل مضمون میں اس مسئلہ پر بہت مدلل گفتگو کی ہے۔ آل احمد سرور نے بھی اپنے مضمون نثر کا اسٹائل میں اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے۔ پُرانے لوگوں میں نجم الغنی خاں رامپوری نے اپنی مشہور کتاب ''بحر الفصاحت'' میں اس مسئلے پر گفتگو کی ہے۔ آل احمد سرور نے یہ سوال بھی قائم کیا ہے کہ محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالیؔ میں سے کون بہتر نثر نگار تھے؟ یعنی اُن کا مسئلہ یہ ہے کہ اچھی نثر کیا ہوتی ہے؟ ظاہر ہے اس سوال کے مختلف جواب ہو سکتے ہیں۔ لیکن اتنی بات تو ہر سخن فہم یا باذوق آدمی سمجھ سکتا ہے (یہ الگ بات ہے کہ ہم کسے سخن فہم یا باذوق سمجھتے ہیں) کہ ایک نثر وہ ہوتی ہے جسے ہم تخلیقی یا تخیلی یا Creative اور Imaginative نثر کہتے ہیں جس کے ڈانڈے شاعری سے مل جاتے ہیں۔ دوسری نثر وہ ہوتی ہے جس میں زبان کا تخلیقی اور تخیلی استعمال نہیں ہوتا ہے۔ علمی نثر کا تعلق اس دوسری قسم سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس غیر تخلیقی اور غیر تخیلی نثر میں صحافتی نثر بھی شامل ہوتی ہے۔ لیکن علمی نثر صحافتی بھی نہیں ہوتی ہے۔ صحافتی نثر میں اصطلاحات کا اُس طرح استعمال نہیں ہوتا ہے جس طرح علمی نثر میں ہوتا ہے۔ ان دونوں قسموں میں زبان Communicative رول ادا کرتی ہے۔ لیکن صحافتی نثر میں دلائل و براہین اور نتائج کا استنباط سادہ سطح پر ہوتا ہے جب کہ علمی نثر میں امعان نظر اور فلسفیانہ انداز پایا جاتا ہے۔ یہ انداز عام بول چال کی زبان اور صحافتی نثر میں موجود نہیں ہوتا۔

ظاہر ہے زبان اور اسلوب بیان کی یہ سطح اُن کی ترقی یافتہ یا ترقی پذیر صورت حال کو ظاہر کرتی ہے جس کا تعلق زبان، ذہن، فکر اور معاشرت کی پختگی یعنی Maturity سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر منور حسین نے اپنے

مقالے ''اردو میں علمی نثر'' میں اردو زبان کی اسی پختگی کی طرف مائل صورت حال کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء کے درمیان لکھی گئی لگ بھگ دوسو ساٹھ سماجی علوم کی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتابیں جدید علوم و فنون سے متعلق ہیں اور مختلف زبانوں سے ترجمہ کی گئی ہیں یا خود تصنیف کی گئی ہیں۔ چار ابواب میں منقسم یہ کتاب بظاہر ۱۸۵۷ء کے بعد کے علمی سرمائے کے لیے مخصوص ہے لیکن مصنف نے پہلے باب میں ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کی علمی تصانیف کا بھی جائزہ لے لیا ہے۔ یوں ضمنی طور پر ہی سہی لیکن اپنے سے قبل کی تحقیقی تسامحات اور فروگذاشتوں کی تردید و تصحیح اور ان پر اضافہ بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''یہاں پر بعض اُن بیانات کی تردید ضروری معلوم ہوتی ہے جو متعدد اہل قلم کے ذریعے سامنے آئے ہیں۔ ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ رام چندر اور دہلی کالج کے اساتذہ کی کوششوں سے پہلے اردو زبان مغربی فلسفہ و علم سے قطعاً نا آشنا تھی۔ یا یہ بات کہ اردو زبان علمی زبان نہ ہونے کی وجہ سے رام چندر کے دور تک علمی الفاظ واصطلاحات اور علمی اسلوب سے محروم رہی۔ شاہان اودھ کے زیر اہتمام یا شمس الامراء کی زیر نگرانی انجام دی جانے والی علمی سرگرمیوں پر نظر والا کوئی بھی شخص ان باتوں کو تسلیم نہیں کر سکتا۔
> اسی طرح ڈاکٹر سیدہ جعفر کا یہ بیان بھی محل نظر ہے کہ ماسٹر رام چندر اردو کے پہلے مضمون نگار تھے اور ان کا رسالہ ''خیر خواہ ہند'' پہلا رسالہ تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بھی خیر خواہ ہند کو پہلا رسالہ قرار دینے میں موصوفہ کے ہم خیال ہیں'' [1]

چنانچہ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں انھوں نے دوسرے باب میں قدیم دلی کالج سے پہلے شمس الامراء کے کارنامے اور شاہان اودھ کی کوششوں کے عناوین قائم کر کے اُن کے علمی کارناموں کا ذکر کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

> ''اس معاملہ میں اولیت کا سہرا شاہان اودھ کے سر ہے'' [2]

شمس الامراء کے کارناموں کے سلسلے میں خاص بات اُن کے یہاں ملازم مترجمین میں میر امان علی دہلوی کا ذکر ہے۔ مصنف کے خیال میں یہ میر امان علی دہلوی اردو کے ممتاز نثر نگار اور باغ و بہار کے خالق میر امن دہلوی ہیں لیکن اس کے لیے انھوں نے کوئی دلیل نہیں دی ہے۔ صرف اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے:

> ''یہ امر حیران کن ہے کہ ان تراجم کی شہرت حیدر آباد سے باہر کم ہی ہوئی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میر امن کے نومطبوعہ تراجم کا ذکر تا حال ہماری کتابوں میں نہیں ملتا'' [3]

مصنف نے تاریخی ترتیب سے فورٹ ولیم کالج کا ذکر بجا طور پر سب سے پہلے کیا ہے کہ اس کی ابتداء ۱۸۰۰ء میں ہوئی۔ دوسری کوششیں ۱۸۱۴ء (شاہان اودھ)، ۱۸۲۵ء (قدیم دلی کالج) یا ۱۸۳۴ء (شمس الامراء کے کارنامے) میں شروع ہوئیں۔ لیکن جہاں اولیت کی بات کرتے ہیں وہاں فورٹ ولیم کالج کی مسلمہ اولیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ شاہان اودھ کی کوششیں غازی الدین حیدر کے زمانے میں شروع ہوتی ہیں جن کا زمانہ ۱۸۱۴ء سے ۱۸۲۷ء تک کا ہے۔

اس مسئلے سے قطع نظر فورٹ ولیم کالج کے سلسلہ میں ان کا یہ Observation بہت اہم ہے کہ:

> ''کالج کے ارباب حل وعقد کے سیاسی اغراض کے باوجود، ان کی خواہش کے علی الرغم اس کالج کے ذریعے اردو زبان وادب کو جو فائدہ پہنچا اس کا انکار مشکل ہے۔ تاہم یہ امر طے شدہ ہے کہ اردو زبان وادب کی خدمت کرنے والے افراد تمام تر ہندوستانی اہل قلم ہی تھے۔ اور اس ضمن میں جن انگریزی مصنّفین کا نام آتا ہے وہ بھی ہندوستانی اہل قلم کے تعاون کے دست نگر تھے جن کے بغیر کوئی تصنیفی کام انجام دینا اُن کے بس میں نہ تھا''۔[۴]

مقالے کا خاکہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر حسین نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

> ''اس مقالے میں تاریخ کے علاوہ جغرافیہ، معاشیات اور سیاسیات سے متعلق کتب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن تاریخی تصانیف کا پہلو غالب ہے۔ اس کی متعدد وجوہ ہیں۔ اس لیے کہ جس عہد کی علمی نثر کا جائزہ لینا مقصود ہے اس میں علوم کی تقسیم اس قدر واضح ہو کر سامنے نہیں آئی تھی جو مابعد کے دور کا حصہ ہے۔ چنانچہ سیاسیات اور معاشیات کی الگ الگ تقسیم بالکل آخری دور میں نظر آتی ہے جب کہ ابتدائی دور میں پولیٹیکل اکانومی کے تحت ان موضوعات پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح سماجیات یا Sociology کو ایک علیحدہ علم کی حیثیت سے نہیں جانا جاتا تھا۔ زیادہ تر سماجی تحریریں مذہبی موضوعات کے تحت سامنے آتی تھیں یا تہذیب وتمدن کے حوالے سے''۔

اس عہد میں روزناموں اور سفرناموں کے لکھنے کا بھی رواج رہا ہے۔ ان میں بھی خاصا علمی مواد ہوتا ہے۔ بالخصوص سفرنامے تو اپنے اندر خاصا تاریخی، معاشرتی، جغرافیائی، معاشی اور سیاسی مواد رکھتے ہیں... پھر بھی یہ جداگانہ مطالعے کا موضوع ہیں۔

> اردو میں علمی نثر کا ذکر کرتے ہوئے اُن علمی خطبات، مواعظ اور لکچر وغیرہ سے صرف نظر کیا جائے گا جن کی تعداد بے شمار ہے۔ اسی طرح اس ذیل میں اُن مکاتیب کا بھی ذکر ممکن نہیں

ہے جو علمی مباحث پر مشتمل ہیں یا موعظت کے طور پر لکھے گئے ہیں یا ان کی کوئی سماجی یا تاریخی حیثیت ہے۔ اس دائرے میں رسائل وجرائد کے اندر درج بعض علمی مضامین ومقالات کا بھی ذکر نہ ہو سکے گا۔ اور نہ ہی ایسے مجموعہ مضامین کا تعارف کرایا جائے گا جن میں بعض سماجی موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہو۔ اس لیے کہ مذکورہ بالا تمام چیزیں جداگانہ میدان ہائے تحقیق رکھتی ہیں۔ اسی طرح اس جائزہ میں مختلف اداروں، انجمنوں اور تنظیموں کی روداد یں، اجلاس کی رپورٹیں، دساتیر وغیرہ بھی شامل نہیں ہوں گی۔ اس بات کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ ان کتابوں کا تعارف بھی پیش کر دیا جائے جو ۱۸۵۷ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیانی عرصہ میں لکھی گئیں مگر کسی وجہ سے اُن کی اشاعت کی نوبت بعد میں آسکی''۔۵

یہ اقتباس ایک طرف ڈاکٹر حسین کی نثر کا خوبصورت نمونہ ہے تو دوسری طرف اُن کے Systemetic یعنی مرتب اور منظّم ذہن کو بھی پیش کرتا ہے اور تیسری طرف اُن کے مطالعے کی پختگی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

اس مقالے میں مختصر طور پر علمی نثر اور سماجی علوم کی نوعیت، انقلاب ۱۸۵۷ء کے پس منظر اور تراجم کی نوعیت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ مطالعے نسبتاً تشنہ ہیں۔ مذکورہ اقتباس میں استعمال ہونے والا جائزہ/تعارف/اس کام کی غیر تنقیدی نوعیت کو بھی واضح کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر حسین کا بنیادی مزاج جانو، مانو اور دہراؤ کا ہے۔ چیزوں کو بیان کر دینا ان کے لیے کافی ہے۔ وہ آسانی سے مطمئن ہو جاتے ہیں Critical Evaluation ان کا مزاج نہیں ہے۔ ان کے یہاں علمی ناآسودگی یا Intellectual Dissatisfaction نہیں ہے۔ ایک طرح کا سکون، اطمینان اور آسودگی ہے۔ کوئی Confusion نہیں ہے، خوب سے خوب تر کی جستجو نہیں ہے، سوالیہ نشان نہیں ہے، کش مکش نہیں ہے، کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے کی صورت حال نہیں ہے۔

دوسو ساٹھ (۲۶۰) کتابوں کے مطالعے اور تعارف کے بعد مصنف نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ اس طرح ہیں:

۱-۲۶۰ کتابوں میں سے ۱۷۴ کتابیں تصنیف وتالیف کے زمرے میں ہیں اور ۸۶ ترجمہ کے زمرے میں آتی ہیں۔

۲-اس عہد کی تصانیف میں جہاں انفرادی ذوق وجذبہ کارفرما ہے وہیں ادارہ جاتی کوششوں کو بھی دخل ہے۔

۳-اکثر کتابیں حکومت سے انعام حاصل کرنے یا حکومت کی نظر میں سرخرو ہونے کے لیے لکھی گئی ہیں۔

۴-ایک ہی نام کی متعدد کتب لکھی گئی ہیں۔

۵-ایک ہی کتاب کے ایک سے زیادہ ترجمے ہوئے ہیں۔

۶-۸۶ کتابوں میں پچاس کتابیں انگریزی سے اور بقیہ ۳۶ کتابیں دوسری زبانوں سے ترجمہ ہوئی ہیں۔

۷-ترجمہ کے سلسلے میں لفظی اور بامحاورہ دونوں طرح کے ترجموں کی مثالیں ملتی ہیں۔

۸-دو الگ الگ مصنّفین کی الگ الگ کتابوں کے ترجمے ایک ہی نام سے ہوئے ہیں۔

۹-متذکرہ دوسو مصنّفین میں ۱۵۰ مسلمان مصنّفین اور ۵۶ غیر مسلم مصنّفین ہیں۔ان میں چھ انگریز ہیں۔

۱۰-جدید علوم کے حصول میں مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم کافی آ گے تھے۔اسی لیے وہ اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے۔

۱۱-دوسو مصنّفین میں خواتین صرف تین ہیں۔

۱۲-بڑی تعداد میں مطابع کا پتہ چلتا ہے جو ملک کے دور دراز گوشوں میں پھیلے ہوئے تھے۔اُن کی تعداد کا بھی مصنف نے مطالعہ کیا ہے۔سب سے زیادہ (۱۶) مطابع لاہور میں تھے۔اس کے بعد دہلی میں (۱۴) اور لکھنؤ میں (۱۲) تھے۔کچھ جگہوں پر دو دو چار چار تھے اور ایک مطبع والی جگہیں تو بہت ہیں۔بقول ڈاکٹر حسین:

> ''مطابع کی اس تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی علمی سرگرمیاں کسی خاص خطے تک محدود نہ تھیں، بلکہ اس کی حیثیت ہندوستان گیر زبان کی تھی۔شمال میں لاہور سے آگے گوجرانوالہ اور سیالکوٹ تک جنوب میں اورنگ آباد،حیدرآباد اور مدراس تک،مشرق میں کلکتہ اور مغرب میں بمبئی تک مطابع کا پھیلا ہوا جال یہ ظاہر کرتا ہے کہ آسام اور کیرالا کو چھوڑ کر ہندو پاک کے بیشتر علاقوں میں اردو کی علمی سرگرمیاں جاری تھیں''۔[۶]

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر حسین کا یہ مطالعہ اردو کی علمی حیثیت کو مستحکم کرتا ہے اور اس کے بارے میں مشہور اور متداول اس افسانے کو رد کرتا ہے کہ اردو زبان شاعری کی زبان ہے،گل وبلبل کی زبان ہے،شیریں زبان ہے یا ایک خاص طبقے کی زبان ہے۔

اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ۱۹۱۴ء کے بعد اردو میں علمی نثر کے ارتقاء کا مطالعہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ۱۹۱۴ء یا ۱۹۴۷ء کے بعد اس میں کیا تبدیلیاں آئیں اور اس کے کیا اسباب ونتائج ہوئے۔

۱۹۱۴ء کے ٹھیک بعد کے زمانے میں دارالترجمہ عثمانیہ اورانجمن ترقی اردو ہند نے ان کاموں میں مزید اضافہ کیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں ''ترقی اردو کونسل'' اور پاکستان میں ''مقتدرہ قومی زبان'' مجلس ترقی ادب لاہور اور بعض دوسرے اداروں نے اس سلسلہ میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ اردو زوال پذیر ہے؟ کیا یہ بھی ایک فکشن ہے؟ کیا سرحد کے اس پار کی حقیقت اور اب اور اُس طرف حقیقت اور۔ ہمارے یہاں علمی اصطلاحات کی کمی کا اب بھی رونا ہے۔ اردو میں علمی کاموں کے جو ابتدائی نقوش تراجم کی شکل میں سامنے آئے تھے انھوں نے بعد کے زمانے میں تصانیف کی شکل کیوں اختیار نہیں کی؟ جوتراجم یا تصانیف Available ہیں، ان کے خریدنے اور پڑھنے والے کیوں نہیں ہیں؟ وہ قاری کیا ہوئے جو لکھنے والوں کو اردو میں علمی تصانیف لکھنے پر مجبور کرتے تھے۔ اردو میں علمی کتابوں اور ادبی کتابوں کا تناسب کیا ہے؟ کیا ادبی کتابیں، علمی کتابوں سے واقعی بازی لے گئی ہیں؟ ہندوستان کی حد تک پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر مظفر حنفی کی وضاحتی کتابیات کی بائیس جلدیں یقیناً ان سوالات کے جواب میں معاون ثابت ہوں گی۔ لیکن ایسے ہی سوالات سرحد کے اُس پار بھی ہیں۔ امید ہے آنے والے مطالعے مستقبل میں ان سوالات کے جواب فراہم کرنے کی کوشش کریں گے۔

مراجع

۱- ڈاکٹر منور حسین، اردو میں علمی نثر، براؤن بکس، علی گڑھ، ۲۰۲۰ء، ص ۲۷

۲- ایضاً، ص ۶

۳- ایضاً، ص ص ۴۵-۴۶

۴- ایضاً، ص ۳۵

۵- ایضاً، ص ۱۰۷-۱۰۸

۶- ایضاً، ص ۳۲۴

ڈاکٹر منور حسین کی کتاب 'اردو میں علمی نثر' پر ایک نظر

ظفر دارک قاسمی

ڈاکٹر منور حسین (1959-2000) اردو زبان وادب کی ایک مستند شخصیت تھی۔ انہوں نے اردو کے ان گوشوں اور پہلوؤں پر خامہ فرسائی کی جن پر عام طور پر باحثین و محققین نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ وہ ڈیڑھ درجن مقالات ومضامین کے مصنف تھے۔ مرحوم کے یہ مضامین ملک کے معتبر رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور ایک درجن کتب کے مبصر ہیں۔ تقریباً ایک درجن قومی اور بین الاقوامی سیمینار و کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ البتہ مرحوم کی ایک اہم کتاب اور اپنے موضوع پر انتہائی جامع اور مانع کتاب 'اردو میں علمی نثر' 1857-1914 (سماجی علوم کے حوالے سے) ہے۔ اس کو براؤن پبلیکیشنز نئی دہلی نے 2020 میں شائع کیا ہے۔ کتاب کی ضخامت 351 صفحات ہیں۔

کتاب کے مباحث

فاضل مصنف نے اپنی اس کتاب میں جن اہم اور اچھوتے نکات پر بحث کی ہے ان کو قارئین وناظرین کی دلچسپی کے باعث حوالہ قرطاس کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کو مصنف نے حرف آغاز اور چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ آخر میں خلاصہ بحث کو حاصل مطالعہ کا عنوان دیا گیا ہے۔ باب اول کے مضامین علمی نثر کیا ہے؟ باب دوم کے مضامین۔ اردو میں علمی نثر کی روایت، فورٹ ولیم کالج، شاہان اودھ کی کوششیں، شمس الامراء کے کارنامے، قدیم دلی کالج، متفرق کوششیں۔ باب سوم کے مضامین: سماجی علوم کیا ہیں، جائزے کے موضوعات، تراجم کی نوعیت، 1857 کا پس منظر۔ باب چہارم کے مضامین: تاریخی تصانیف، جغرافیہ کی کتابیں، معاشیات کی کتابیں، سیاسیات کی کتابیں اور حاصل مطالعہ۔ مباحث کتاب پر سرسری نظر ڈالنے سے جہاں کتاب کی اہمیت وافادیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے وہیں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ اس موضوع پر اتنی شرح وبسط کے ساتھ لکھی گئی واحد کتاب ہے۔

سببِ تالیف

مصنف نے حرفِ آغاز میں سببِ تصنیف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

’’اردو زبان کی خالص ادبی جہت پر، بہت زیادہ تصنیفی و تحقیقی کام انجام پائے ہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے اس کی علمی ماہیت، اہمیت اور حیثیت کی طرف توجہ کی جانے لگی ہے۔ چونکہ اس پہلو سے جو مختصر سا کام ہوا ہے، وہ بھی عام طور پر اردو حلقوں میں متعارف نہیں ہے۔ اس لیے اپنے تحقیقی کام کے لئے اسی میدان کا انتخاب کیا گیا۔

اردو میں علمی نثر کے جائزے کے موضوع پر باضابطہ دو تصانیف میرے علم میں ہیں۔ ایک خواجہ حمید الدین شاہد کی کتاب ’اردو میں سائنسی ادب‘ مطبوعہ 1969 اور دوسری ڈاکٹر محمد شکیل خاں کی تصنیف ’اُردو میں سائنسی و تکنیکی ادب‘ مطبوعہ 1988 اردو زبان میں جتنا عظیم الشان علمی کام اس کے دورِ عروج میں انجام پایا ہے اس کا تقاضا تھا کہ علم کے متنوع پہلوؤں اور موضوعات کے اعتبار سے اردو کے سرمائے کا جائزہ لیا جاتا۔ اردو کے علمی سرمائے کی اہمیت کا ایک اجمالی اندازہ کتابوں کی ان فہرستوں کے سرسری مطالعہ سے بھی ہوسکتا ہے، جو متعدد اوقات میں مختلف اداروں سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ تخلیقی نثر کی بجائے علمی نثر کو بھی موضوع بنانے کی ایک اہم وجہ استادِ محترم پروفیسر منظر عباس نقوی کے لفظوں میں یہ بھی ہے:

’’یقیناً یہ نثر (تخلیقی نثر) شعری عناصر کے امتزاج کی وجہ سے خالص نثر کے مقابلے میں زیادہ بامزہ اور زیادہ بالیدہ ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آج اُردو زبان کے فروغ اور اس کے وزن و وقار میں اضافے کے لیے ہمیں جس نثر کی ضرورت ہے وہ بس وہی ہے جس کو ہم نے خالص نثر سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی علمی نثر‘‘۔

مذکورہ اقتباس اس بات پر شاہد عدل ہے کہ اردو زبان میں علمی نثر پر وقیع کام کرنے کی نہایت سخت ضرورت ہے۔ اس کتاب میں اس موضوع کا بہت حد تک احاطہ کیا ہے۔ موصوف کا یہ کارنامہ اس حیثیت سے قابلِ مطالعہ اور لائق داد و تحسین ہے۔ اسی بات کی طرف اشارہ پروفیسر منظر عباس نقوی نے بھی کیا ہے کہ اردو میں علمی نثر پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

علمی نثر کا تعارف

کتاب کا پہلا باب علمی نثر پر مشتمل ہے۔ اس باب میں مصنف نے نثر کی اہمیت، افادیت اور اس کی

اقسام وانواع پر انتہائی علمی گفتگو کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''اردو نثر کی ایک معروف تقسیم افسانوی اور غیر افسانوی نثر کی ہے۔، افسانوی نثر تمام تر تخلیقی ہوتی ہے جبکہ غیر افسانوی نثر میں تخلیقی و غیر تخلیقی دونوں طرح کی نثر شامل ہے۔'' اسی طرح نثر کی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے حوالے سے نثر کی درج ذیل اقسام کا ذکر کیا ہے۔ اردو میں نثر کی اقسام یہ ہیں: کلامی، توضیحی، وصفیہ یا بیانیہ، انا نیتی یا شخصی، تاثراتی، رومانی، شاعرانہ، خطیبانہ اور علمی و استدلالی وغیرہ۔ پھر ان میں سے ہر ایک کا جامع تعارف کرایا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ایک مضمون 'اردو کا بنیادی اسلوب' مطبوعہ فکر ونظر علی گڑھ جنوری 1960 صفحہ 94 کے حوالے سے نثر کے متعلق مصنف نے انتہائی اہم اقتباس نقل کیا ہے ذیل میں اس کو نقل کرنا مناسب ہوگا:

> ''اس کا دروبست منطقیانہ اور براہ راست و بے کم وکاست سوچنے اور اظہار مطالب کا وسیلہ ہو، جو کچھ بیان کیا گیا ہو وہ کانٹے پر تلا ہو، جیسے اور جتنے اور کو لفظ آئے، ہوں وہی اور اتنے ہی معنی ہوں نہ کم نہ بیش۔ ٹھنڈے دل سے سارے نشیب وفراز پر نظر رکھی گئی ہو، ذاتی ردعمل سے پاک ہو، جامد نہ ہو، متحرک ہو، بے ساختہ ہو، شعر وشاعری کی مانند ہو، اس بات کو خاص طور پر ملحوظ نظر رکھنا چاہیے کہ نظم میں توازن کا معیار اسالیب کی تکرار پر ہوتا ہے، نثر میں اسالیب کے تنوع پر، نظم میں الفاظ سے جذبات کو ابھارنے کا کام لیا جاتا ہے، نثر میں ان کا مقصد مطالب کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے، نثر میں جذبات کی گنجائش سطح کے نیچے ہوسکتی ہے لیکن ان کو فکر سلیم کی گرفت سے باہر نہ ہونے دینا چاہیئے اس سے نثر کی حیثیت اور اس کے مالہ وماعلیہ پر روشنی پڑتی ہے۔ علمی نثر کا جو مقصد ومفہوم ہے وہ بھی بخوبی واضح ہوجاتا ہے۔''

اردو میں علمی نثر کی ابتدا

اس بابت مصنف نے اپنی کتاب میں انتہائی علمی مواد فراہم کیا ہے۔ اور اردو میں علمی نثر کی ابتدا کے متعلق تاریخی عبارتیں نقل کی ہیں۔ چنانچہ فاضل مصنف تحریر کرتے ہیں:

> ''اردو میں علمی نثر کی ابتدا خود نثر کی ابتداء کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس بات پر تمام محققین کا اتفاق ہے کہ اردو کا ابتدائی نثری سرمایہ صوفیا کرام کے ارشادات اور ان کی تحریروں پر مبنی ہے یا مذہبی موضوعات پر لکھی گئی کتابوں پر۔ حکایتوں اور داستانوں کی تصنیف نسبتاً بعد کی چیزیں ہیں۔ ان مذہبی تصانیف کے مخاطب چونکہ عوام الناس تھے اس لیے اسلوب کو عام فہم بنانے کی شعوری کوشش ناگزیر تھی۔ ابتدائی مذہبی تحریروں کی ادبیت سے چاہے جس قدر انکار کیا جائے

اس بات کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ عام لوگوں کی زبان میں تحریروں کی ابتدا ان سے ہوتی ہے اور زبان کی طرح اردو کو بھی عام فہم بنانے کا نقطۂ آغاز وہی ہیں۔ خود قرآن کریم کے ابتدائی تراجم بھی اسی غرض وغایت کی نشاندہی کرتے ہیں گرچہ بعض ترجموں میں احتیاط کا پہلو اس قدر مدنظر رہا ہے کہ اس زمانے کی نثری عبارتوں کے سامنے وہ ترجمے بے کیف اور اظہار مطلب کے لحاظ سے کسی قدر عاجز نظر آتے ہیں، لیکن اس دور کے تہذیبی ولسانی حالات اگر پیش نظر ہوں تو یہ کوشش بھی بروقت اور بسا غنیمت نظر آتی ہے، جب کہ قرآن کا ترجمہ کرنا ہی خلاف اسلام سمجھا جاتا تھا۔''

درج بالا اقتباس اس بات پر بین ثبوت ہے کہ اردو نثر کی ابتدا اور اس کی نشو ونما اردو میں مذہبی اور سماجی وتاریخی کتب سے ہوتی ہے۔ جو کتابیں اردو میں اولاً منصۂ شہود پر آئیں ان کا اردو نثر کی ابتدا میں بنیادی کردار ہے۔

اُردو نثر کے متعلق فورٹ ولیم کالج کی خدمات

10 /جولائی 1800 کو فورٹ ولیم کالج کا افتتاح ہوا، اس کالج کے ہندوستانی شعبہ کی نصابی ضروریات کے لیے آسان زبان میں کتابیں تالیف وترجمہ کرائی گئیں۔ ان تالیفات وتراجم میں داستانیں، حکایتوں، لغات وقواعد کے علاوہ علمی موضوعات پر بھی کتابیں شامل ہیں۔ لیکن یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ علمی موضوعات پر خصوصاً سماجی علوم وسائنسی علوم پر کتابوں کی تالیف کا نقطۂ آغاز فورٹ ولیم کالج ہی ہے۔ اٹھارویں صدی کے اخیر میں سید رستم علی بجنوری نے 'قصہ واحوال روہیلہ' کے نام سے ایک تاریخی کتاب لکھی جس میں معاصر واقعات آسان زبان میں قلم بند کیے گئے ہیں۔ یہ تصنیف بھی کسی انگریز دوست کی خواہش پر عمل میں آئی کہ اردو سیکھنے والوں کو اس سے فائدہ ہو۔ (صفحہ 23)

فورٹ ولیم کالج کے حوالے سے تاریخ کی جن کتابوں پر کام ہوا ہے۔ مصنف نے ان پر انتہائی دلچسپ اور قابل مطالعہ تجزیہ کیا ہے۔ مناسب ہے کہ ان کتب کے نام پیش کر دیے جائیں: 1- خلیل احمد اشک کی انتخاب عالم، 2- واقعات اکبر، یہ دراصل ابوالفضل کی فارسی کتاب 'اکبر نامہ' کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ اشک نے 1809 میں مکمل کیا۔ 3- تاریخ نادری، منشی محمد مہدی کی فارسی تصنیف 'تاریخ جہاں گیر مادری' کا اردو ترجمہ حیدر بخش حیدری نے 1809 میں کیا۔ 4- تاریخ شیر شاہی۔ عباس خاں کھور سروانی کی فارسی کتاب 'تحفہ اکبر شاہی' کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ مظہر علی ولا نے 1705 میں کیا۔ 5- جہاں گیر شاہی، یہ ترجمہ ہے فارسی

تصنیف 'اقبال نامہ جہاں گیری' کا اس کو بھی مظہر علی ولا نے 1809 میں کیا ہے۔ 6- آرائش محفل، یہ منشی سویاں رائے بھنڈاری کی فارسی تصنیف 'خلاصۃ التواریخ' کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ میر شیر علی افسوس نے 1808 میں کیا۔ 7۔ تاریخ آسام، بہادر علی حسینی نے 1805 میں شہاب الدین طالش ابن ولی محمد کی فارسی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ 8- شہ نامہ ہندی، توکل بیگم کی فارسی تالیف 'شمشیر خانی' کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ 1811 میں کیا۔ 9- ترجمہ سیر المتاخرین، مصنف نے تحریر کیا ہے کہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے مطابق منشی غلام حسین کی فارسی تصنیف کے ایک حصہ کا ترجمہ سید بخشش علی نے کیا۔ 10- حسن اختلاط، یہ میر ابوالقاسم خاں نے 1803 میں تصنیف کیا۔ 11- تذکرہ گلشن ہند، میرزا علی لطف نے 1801 میں اس تذکرہ کو مرتب کیا، 12- تاریخ بہمنی، کاظم علی خاں نے 'تاریخ فرشتہ' سے سلاطین بہمنی کے ذکر سے متعلق ایک حصہ کا ترجمہ 1807 میں کیا۔ 13- جہاں گیر نامہ، گارساںدتاسی کے بقول مظہر علی خاں 'علامت تزک جہانگیر' کے ایک حصہ کا ترجمہ اس نام سے کیا۔ 14- تاریخ بنگالہ، غلام اکبر نے تین سو صفحات کی یہ کتاب 1803 سے قبل تصنیف کی۔ 15- تواریخ السلاطین، غلام شاہ بھیک نے یہ کتاب 1803 تک لکھ لی تھی۔ 16- تواریخ عالم گیری، محمد عمر نے یہ کتاب اسی زمانہ میں لکھی۔ 17۔ تواریخ تیموری، تصدق حسین نے اسی زمانہ میں یہ کتاب تحریر کی۔

راقم نے بالائی سطروں میں صرف ان کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جن کا ذکر مصنف نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ مذکورہ کتب کے علاوہ بھی فورٹ ولیم کالج میں اردو نثر کو تدوین وتصنیف اور تالیف وترتیب کے ساتھ ترجمہ وتحشیہ کے زیور سے مزین کیا گیا ہوگا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں فارسی کتب کے اردو تراجم پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ اسی طرح مصنف نے اپنی اس کتاب میں شاہان اودھ، شمس الامراء اور قدیم دلی کالج کی اردو میں سماجی علوم کے حوالے سے خدمات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

اردو نثر میں سماجی علوم

مصنف کا اصل مدعا یہ بتانا ہے کہ اردو نثر میں سماجی علوم کی ترویج واشاعت، اس بابت انہوں نے کتب تواریخ، کتب معاشیات، کتب جغرافیہ اور کتب سیاسیات کو شامل کیا ہے۔ انہوں نے ایک کتاب نظم الممالک یہ کتاب اردو ترجمہ ہے سید خیر الدین احمد وزیر سلطنت (تونس) کی عربی تصنیف 'اقوام المسالک فی معرفۃ احوال الممالک' کا اس کا ترجمہ محمد اسماعیل نے کیا ہے۔ کتاب کی غرض وغایت کا ذکر دیباچہ میں اس طرح کیا ہے: ''پس جہاں تک ہوسکا میں نے اپنے ارادہ کے موافق اس کتاب میں ان سب باتوں کو جمع کیا جوانہوں

نے (مغربی اقوام) تدابیر ممالک کے متعلق بغرض نظم ونسق مملکت کے ایجاد کی ہیں۔ اوران جدید باتوں کے ضمن میں، میں نے ان باتوں پر ایماء کردیا جو زمانہ سابق یعنی عہد قدیم میں ان کے یہاں رائج تھیں۔ اوران طریقوں کو بھی بیان کیا ہے جن کی بدولت اس قوم نے سیاست مدن میں ایسی ترقی حاصل کی ہے جس کے سبب سے وہ گویا ترقی کی حد پر پہنچ گئے ہیں اوراسی طرح میں نے اس کتاب میں امت اسلامیہ کے ان قدیمی حالات کو بیان کیا ہے جن سے اقوام کے کمالات اور فضائل کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ جو اس زمانہ میں تھی، جبکہ احکام شرع اپنے موقع پر جاری تھے اور جملہ معاملات اپنے اپنے طریقے سے برتے جاتے تھے۔ اور یورپ کی قوموں کے تمام معاملات نظم ونسق اور طریقہ سیاست اور تمدن کو میں نے اس غرض سے بیان کیا ہے کہ مسلمان لوگ بھی ان میں سے جن باتوں کو اپنے حسب حال اور اپنے حق میں بہتر دیکھیں ان کو اختیار کرلیں اور جو باتیں ہماری شریعت کے مخالف نہیں ہیں بلکہ مساعد ہیں ان کو اپنے برتاؤ میں داخل کریں۔ تاکہ شاید وہ اس تدبیر سے پھر اپنے کمالات کو حاصل کرلیں جو کسی زمانے میں ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے ہیں اور شاید اس ذریعے سے اپنے ہاں کے اس تفریط کے گرداب سے نجات پاویں جو کہ ہم لوگوں میں پھیل رہی ہے۔ اور علاوہ ان باتوں کے بہت سی عقلی اور نقلی باتیں اس کتاب میں ایسی ہیں جن کو دیکھنے والا نہایت شوق سے دیکھے گا۔''

گویا یہ کہنا مناسب ہے کہ سید خیرالدین احمد کی یہ کتاب اس معنی کر بھی بڑی اہم ہے کہ اس میں علم سیاست کے ساتھ ساتھ مغربی طریقہ سیاست پر تنقید وتعریف کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ امت مسلمہ کو اس بات کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ اگر کوئی چیز لائق اتباع ہے اسے اختیار کرنے میں کوئی گریز نہیں ہے۔

مصنف نے لکھا ہے کہ'' تاریخ نویسی کا آغاز مغرب میں 5 ویں صدی قبل مسیح سے مانا گیا ہے۔ تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل یونان میں تاریخ ضبط تحریر میں آنا شروع ہوئی۔ ہونان کے ہیروڈوٹس کو علماء مغرب پدر تاریخ کہتے ہیں۔ اس نے متعدد ممالک کی سیاحت کی تھی اور اپنے چشم دید حالات قلم بند کئے تھے۔ عربوں نے اس فن میں کافی اہم مقام پیدا کیا۔ ابن رشد، طبری، ابن خلدون عرب مورخین میں ممتاز مقام کے حامل ہیں، تاریخی تصانیف میں مصنف نے سرسید احمد خاں کی اسباب بغاوت ہند، محمد وجاہت علی خاں کی آئینۂ ہند، پنڈت کنہیالال کی اسباب بغاوت ہند جیسی اہم اور بنیادی کتب کو شامل کیا ہے۔ جغرافیہ کے حوالے سے بھی مصنف نے کافی اہم کتابوں کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کریم الدین کی کتاب 'مفتاح الارض' کے حوالے سے پوری دنیا کا جغرافیہ قلم بند کیا ہے۔ زمین کی گردش کے متعلق درج ذیل اقتباس نقل کیا ہے۔'' زمین

میں حرکت روزانہ کے سوا ایک اور حرکت بھی ہے۔ یعنی وہ آفتاب کے گرد بھی پھرتی ہے اور اسی حرکت کو حرکت سالانہ بھی کہتے ہیں اور اس سے موسموں کا تغیر و تبدل پیدا ہوتا ہے۔ زمین آفتاب کے گرد اپنی حرکت سے ایک دائرہ بناتی ہے اور اس دائرہ کا نام مدار ارضی ہے۔ چونکہ زمین آفتاب سے 95000000 میل کے فاصلے پر ہوجاتی ہے تو ماہ جون میں اس مقام سے جہاں کہ دسمبر میں تھی 19000000 کے فاصلے پر ہوجاتی ہے۔ 365 دن 5 گھنٹہ 48 منٹ 48 سکنڈ کا ایک سال ہوتا ہے۔ لیکن ان گھنٹوں اور منٹ وغیرہ کو 3 برس تک حساب میں نہیں لاتے اور چوتھے سال فروری میں ایک دن ان کے عوض زیادہ کر دیتے ہیں۔'' اس کے علاوہ منشی سداسکھ لال کی جغرافیہ ہند، مولوی عبدالمسیح کی نیا جغرافیہ، وغیرہ وغیرہ کتب کو شامل کیا ہے۔

حاصل بحث

فاضل مصنف نے کتاب کے آخر میں جو خلاصہ رقم کیا ہے وہ انتہائی اہم ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''اس مقالے میں تقریباً دوسو مؤلفین و مترجمین کی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں مسلمان اہل قلم کی تعداد 150 ہے اور غیر مسلم مؤلفین و مترجمین کی تعداد 56 ہے۔ ان میں سے چھ انگریز ہیں۔ ایسے عہد میں جب کہ اردو کے خلاف غیر مسلموں کا ایک محاذ قائم ہو چکا تھا اور اس کے مقابلے میں ہندی کو فروغ دینے، اس کے ارتقا کی تدبیریں کرنے اور اسے سرکاری زبان بنانے کی کوششیں شد و مد سے جاری تھیں غیر مسلموں کی اتنی بڑی تعداد میں اردو کی علمی خدمت کرنا بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو زبان ہندوستان میں اس عہد کی واحد علمی زبان بن رہی تھی۔ دوسری طرف اس سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ جدید علوم کے حصول میں مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم کافی آگے تھے۔ اور اسی بنا پر وہ حکومت کے اعلیٰ مناصب پر تناسب کے اعتبار سے زیادہ تھے۔ اپنی اسی امتیازی حیثیت میں حکومتی اداروں کی زیر نگرانی زیادہ تر اور بعض پرائیویٹ اداروں کی ایما پر نیز ذاتی ذوق و رجحان سے بھی انہوں نے اُردو میں قابل قدر علمی سرمایہ فراہم کیا۔ اس میں بڑی تعداد تراجم کی ہے۔ اسی طرح نصابی کتابیں بھی ان کے ذریعہ کافی تعداد میں تیار ہوئیں۔''

آخر میں راقم یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہے کہ ڈاکٹر منور حسین کی یہ تصنیف کئی اعتبار سے اہم اور قابل مطالعہ ہے۔ نیز کتاب کا ہر لفظ اور ہر جملہ علمی نکات سے مملو ہے۔ کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں اردو کی علمی نثر کے متعلق انتہائی سیر حاصل اور مفید معلومات کو شامل کیا گیا ہے۔ جو مواد اس کتاب میں شامل ہے وہ سیکڑوں کتابیں پڑھنے کے بعد بھی مشکل سے حاصل ہو پاتا ہے۔ اسی طرح مصنف کا توسع بھی اس کتاب کے

مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جہاں مسلم مؤلفین ومترجمین کی کتابوں کا تجزیہ کیا گیا ہے وہیں اس دور کے غیر مسلم مصنفین ومترجمین کی سماجی علوم کے حوالے سے لکھی گئی کتب کا بھی اسی قدر اور عظمت واحترام سے جائزہ لیا گیا۔ اس کتاب سے قارئین وناظرین کو جہاں علمی فائدہ حاصل ہوگا وہیں قومی یکجہتی کا بھی سبق ملے گا۔ نیز اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اردو ہماری مشترکہ تہذیب وثقافت کی آئینہ دار ہے۔ اس کے فروغ میں ہندو مسلم دونوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ لہٰذا اردو کو کسی بھی خاص کمیونٹی سے جوڑنا سراسر ناانصافی اور ہماری مشترکہ اقدار کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہے۔

●◘●

''اللہ تعالیٰ کی بندگی کی دعوت تمام انسانوں کو دینا مسلمانوں کا مقصد زندگی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ مسلمان سماج ہی اس قدر بگڑا ہوا ہے کہ اس صلاح کا کام ہی ضروری اور مقدم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کا معاشرہ بھی بگاڑ میں غیر مسلموں کے برابر تک چلا گیا ہے۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم ایک ایسے اہم کام کو اختیار کر کے جو ہماری وجہ سے اہمیت اختیار کر گیا ہے اس کام کو مؤخر کردیں جو ہمارا مقصد وجود اور غایت اصلی ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہاں ایسا ہی ہونا چاہیے۔ آیئے ہم اس سے آگے بڑھ کر سوچیں۔ کیا کوئی اور ضروری کام نہیں جو ہمیں ابتدائی قدم کے طور پر کرنا چاہیے۔ ہم اگر کرنے کے کام کی فہرست بنائیں تو شاید سب سے پہلے اس کو جگہ دی جانی چاہیے کہ ہم پہلے اپنی اصلاح کریں۔ اپنے ایمان وعمل کو درست کریں، پھر مسلم معاشرہ کی اصلاح کا کام کیا جائے گا اور پھر غیر مسلموں میں دعوت کا کام کیا جائے گا۔''

(**ڈاکٹر منور حسین فلاحی**، اداریہ ماہنامہ رفیق منزل، فروری ۱۹۸۸ء)

ڈاکٹر منور حسین فلاحی ۔ایک غم خوار رفیق،مہربان بھائی

ایاز احمد اصلاحی

ڈاکٹر منور حسین فلاحی (جولائی ۱۹۵۹ء-ستمبر ۲۰۰۰ء) ایک اچھے انسان، ایک بھر پور اسکالر، ایک باصلاحیت استاذ اور ایک باعمل مسلمان تھے۔اس کے علاوہ جامعۃ الفلاح سے علم دین کے حصول نے انھیں اپنے فریضۂ منصبی کا بھی گہرا شعور بخشا تھا،جس کا سب سے بڑا ثبوت تحریک اسلامی سے تادم آخر ان کی وابستگی تھی۔ وہ اولاً طلبہ تنظیم، ایس آئی او آف انڈیا سے وابستہ ہوئے اور اس سے ریٹائرمنٹ کے بعد جماعت اسلامی کے ایک سرگرم و مخلص رکن کے طور سے اقامت دین کے قافلے کا حصہ بنے اور پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، بلکہ پوری یکسوئی اور اخلاص و دل بستگی کے ساتھ اپنا سب کچھ اسی مقصد میں لگا دیا۔

تحریک اسلامی سے ڈاکٹر منور حسین فلاحی مرحوم و مغفور کا تعلق ہندوستان میں مسلم طلبہ اور نوجوانوں کی سب سے بڑی اور منظم تنظیم اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا (ایس آئی او) کے واسطہ سے ہوا۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کے ساتھ میرے تعلق کی بنیاد بھی یہی تنظیم بنی، جب میں حصول تعلیم کے لیے 1987 میں دہلی پہنچا اور وہاں ایس آئی او میں باقاعدہ شامل ہوا تو بہت سے پرانے ساتھی اور ہم درس پہلے سے اس بزم میں موجود تھے۔ یہ وہ افراد تھے جن سے میں پہلے سے آشنا تھا، بلکہ یہاں تو مجھے میرے بعض ہمدم دیرینہ بھی مل گئے۔ ان شناسا ساتھیوں میں اولین نام میرے دوست و ہم درس مرحوم ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی سابق پروفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ،(متوفی، 18 ر فروری 2017) کا ہے جو مدرسۃ الاصلاح میں دوران تعلیم میرے ہم درس اور قریب ترین دوستوں میں تھے۔ یہاں سے فراغت کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے انھوں نے علی گڑھ کا اور میں نے دیوبند ہوتے ہوئے دلی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کا رخ کیا۔لیکن تنظیم میں شمولیت کے بعد میرے احباب اور ہم فکر و ہم مزاج ساتھیوں میں بعض ایسے مخلص و غم گسار رفقاء کا بھی اضافہ ہوا جن سے اس پلیٹ فارم کے توسط سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ یہاں ایک قسم ان رفقاء کی تھی جن سے میرے

تعلق کی اصل وجہ گو کہ اسلامی تحریکی رشتہ تھا جو دوسرے تمام رشتوں سے زیادہ معتبر و پاکیزہ ہوتا ہے، تاہم اصلاح وفلاح کی تعلیمی ونصابی وفکری مناسبتوں کے سبب یہ تعلق وقت کے ساتھ زیادہ بے تکلف اور خاص ہوتا چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بے غرض رشتے میں دیگر مناسبتوں کے ساتھ تعلیمی و درسی رفاقت یا مماثلت کی مناسبتیں بھی جڑ جائیں تو باہمی تعلق کو گہرا ہونے اور رابطہ کو مخلصانہ رشتہ میں بدلنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ میرے ایسے ساتھیوں میں جن شخصیات کو میں اپنی فہرست میں سرفہرست رکھتا ہوں ان میں دو ایسے نام بھی ہیں جنھیں میں اپنے منفرد دوست، مخلص بھائی، سچا رفیق اور بے مثال و بے لوث ساتھی اور ہم درد و ہم دم، مرحوم صفدر سلطان اصلاحی کی طرح اب کھو چکا ہوں، میری مراد مرحوم طارق فارقلیط فلاحی (متوفی: 28 جولائی، 2014) اور مرحوم منور حسین فلاحی سے ہے۔ میرے یہ تینوں رفیق نہ صرف تحریک اسلامی کے مخلص و بے لوث کارکن تھے بلکہ مختلف سطح پر تحریکی وتنظیمی ذمہ داریاں بھی ادا کرتے رہے ہیں۔ جو شخص بھی ان سے واقف ہے وہ اس حقیقت کا منکر نہیں ہوسکتا کہ ان رفقاء کی سب سے بڑی شناخت تحریک اسلامی اور ان کی زندگی کا سب سے بڑا ہدف دین حق کی سربلندی تھی۔

بھائی صفدر اور میرے درمیان جو گہری اور دیرینہ دوستی تھی اس سے آپ میں سے بہت سے واقف ہوں گے۔ 12 ردسمبر 2016 کو شریک حیات (رحمہا اللہ) کو کھویا تو ایسا لگا زندگی سے روح جدا ہوگئی، اس کے چالیس دن بعد 2017ء میں جب ماں (رحمہا اللہ) کی رحلت نے غم جاں کو فزوں تر کر دیا تو ایسا لگا کہ میری اپنی دنیا بے رونق ہوگئی ہے، اس کے چند ہی مہینوں بعد 2017ء میں ہی جب اپنے اس دوست (رحمہ اللہ) سے محروم ہوا جو میرا ایک بازو تھا تو محسوس ہوا جیسے کسی نے میری کمر توڑ دی ہو، سچ یہ ہے کہ ہم دونوں صرف ایک دوست ہی نہیں تھے بلکہ ایک دوسرے کے ہم راز و غم خوار بھی تھے۔ لیکن تحریکی کارواں میں شامل ہونے کے بعد منور بھائی رحمہ اللہ اور طارق بھائی رحمہ اللہ سے بھی میرا تعلق بہت خاص ہوگیا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ فکر و مزاج کی ہم آہنگی تھی۔ ان مخلص رفیقوں کی سادگی، صاف گوئی اور علم وقلم سے ان کا گہرا تعلق بھی ہمیں ایک دوسرے سے قریب کرنے کا اہم سبب تھا۔

جب میں ایس آئی او کا ممبر بنا اس وقت دلی اور علی گڑھ ایک یونٹ کی شکل میں یوپی زون کے ماتحت تھے اور سابق مدیر 'حیات نو' طارق فارقلیط فلاحی صاحب یوپی زون کے صدر تھے۔ صوبہ کے تربیتی اور دوسرے پروگراموں میں ہم سب ایک ساتھ شریک ہوتے اور اپنے اپنے حصے کا کام کرتے۔ بعد میں جب دلی کو یوپی

سے الگ کر کے ایک مستقل ڈویژن اور اس کے بعد ایک مکمل زون کا درجہ دیا گیا تو دونوں صورتوں میں، میں اس کا پہلا صدر منتخب ہوا، اس طرح جیسے جیسے تنظیمی ذمہ داریاں اور سرگرمیاں بڑھتی گئیں اور ان رفقاء سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی بڑھتا گیا، ویسے ویسے ان دونوں احباب سے ابتدائی تعارف خصوصی تعلق میں بدلتا چلا گیا۔ یہ دونوں مجھ سے عمر میں بڑے تھے اس لیے ایس آئی او کے صوبائی اور مرکزی پروگراموں اور شوریٰ کی نشستوں میں بھی مجھے ان سے کافی کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔مختلف سطح کے تنظیمی جلسوں میں میری کوشش ہوتی کہ میں دوسرے سینئر ارکان تنظیم کی طرح ان دونوں کے تحریکی تجربات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کروں، اس لیے جب بھی موقع ملتا ان کے ساتھ کچھ دیر الگ سے ملنے اور تبادلہ خیال کرنے کو میں ہر بار ترجیح دیتا اور ان دونوں نے بھی مجھے کبھی مایوس نہیں کیا اور نہ ہی مجھے ایک برادر خورد اور عام ممبر سمجھ کر کبھی نظر انداز کیا، بلکہ میری خصوصی توجہ ودلچسپی دیکھ کر انھوں نے اپنی خصوصی عنایتوں سے مجھے ہمیشہ نوازا۔

اوصاف وکردار

رفیق منزل کی ادارت ہو (جس کا ذکر آگے آرہا ہے) یا طلبہ تنظیم میں ان کی رفاقت،تحریکی سفر میں منور بھائی کے ساتھ بتائے ہوئے لمحات میرے لیے نقش جاوداں اور ایک خوشگوار تجربہ کی طرح ہیں جنھیں نہ تو ذہن سے فراموش کیا جا سکتا اور نہ دل سے مٹایا جا سکتا ہے۔ان احباب کے ساتھ زندگی کے ان مخصوص دنوں میں، جو اب محض یادوں کی ڈائری میں محفوظ ہیں، جو وقت گزرا ہے اس میں بے خودی بھی ہے اور آگاہی بھی، اس میں سرمستی بھی ہے اور دل سوزی بھی، اس میں شیشہ گری بھی ہے اور سفال سازی بھی، اس میں نوائے شوق بھی سنائی دیتی ہے اور آہنگ انقلاب بھی، اس میں صحبت شاہین بھی ہے اور شعلہ سینائی بھی۔۔۔ان کے ساتھ دور و نزدیک کا سفر کرنے کی سعادت بھی ملی، ایک ساتھ قیام کرنے کے مواقع بھی ملے اور غیر رسمی مجالس میں گھنٹوں تبادلہ خیال کرنے کا وقت بھی ملا۔حالات جیسے بھی رہے ہوں اور ہم جہاں بھی اور جن مصروفیات میں بھی مبتلا رہے ہوں، میں نے اپنے اس بڑے بھائی جسے منور حسین فلاحی کہتے ہیں کو ہمیشہ دل نواز خوبیوں اور پرسوز برتاؤ والا شخص پایا۔وہ ایک حد درجہ متواضع ومنکسر المزاج،معتدل ومتوازن،سادہ وپرکار،معاون ومددگار، بے نیاز و خوددار اور ایک خاموش ومطمئن کردار والے انسان تھے۔وہ سکھانے سے زیادہ ہر آن سیکھنے میں منہمک رہنے والے، کہنے سے زیادہ سننے والے اور بولنے سے زیادہ غور کرنے والے شخص تھے۔لیکن وہ جہاں بھی رہے اور جس درجے میں رہے، اپنے ساتھیوں اور خلق خدا کے لیے نہایت مفید بن کر رہے۔تحریک اسلامی، اقامت

دین اور حق کی سربلندی کے لیے ہونے والی جدو جہد میں تن من دھن سے شامل ہوکر جینا اور جینے کا درس دینا ان کی زندگی کی اولین ترجیح تھی۔ یہی ان کی متاع حیات اور اصل شناخت تھی جو ان کی سادہ زندگی کے ہر زاویے سے ہویدا تھی۔

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر
اسی سے فقیری میں میں ہوں امیر

یہ چیز بھی ان کی شخصیت کا ایک نمایاں عنصر تھی کہ جہاں بہت ضروری ہوتا، منور صاحب وہیں لب کشائی کرتے ورنہ تنظیمی نشست ہو یا احباب کی محفلیں ہر جگہ خاموشی کو زیب تن کیے رہنا ان کی عادت تھی۔ احباب کی محفلوں میں کبھی کبھار حسب موقع مسکرانا اور اپنے مختصر جملوں سے شریک محفل رہنے کا احساس دلاتے رہنا بھی ان کی عادتوں میں شامل تھا۔ میں نے انھیں مبتذلانہ یا غیر سنجیدہ باتیں کرتے یا 'تفریح وظرافت' کے نام سے احباب پر طعنہ کشی کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ سنجیدہ تھے، لیکن خشک مزاج نہیں۔ وہ اصول پسند تھے، لیکن تنگ دل اور بد اخلاق نہیں۔ وہ ایک توانا و طاقت ور جسم کے مالک نہیں تھے، لیکن مجھے کمزور اور غیر متحرک کبھی نظر نہیں آئے۔ وہ ایک علمی و تحقیقی مزاج رکھتے تھے، لیکن علم و تحقیق کے ظاہری رعب و رتبہ والے جبہ و دستار سے انھوں نے خود کو سجانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ وہ دوستوں کے ساتھ قہقہے ضرور لگاتے، لیکن تہذیب کا دامن ہاتھ سے کبھی جانے نہیں دیتے۔ وہ رفقاء و احباب سے اختلاف کرتے لیکن سلیقہ مندی سے کبھی دور نہ ہوتے۔ وہ ہمیں مشورے دیتے لیکن اس میں تحکمانہ انداز کبھی نہ ہوتا، وہ بزرگوں کی صحبت میں وقت گزارتے، ان سے باتیں کرتے اور ضرورت پڑنے پر ان سے سوالات بھی کرتے لیکن حد ادب کو ازحد ملحوظ رکھتے۔

گوکہ وہ ایک بڑی طلبہ تنظیم کے ایک نمایاں ممبر تھے اور اس کی ذمہ داریاں جو انھیں دی گئیں انھیں نبھانے میں کبھی کسی کوتاہی یا تساہلی کا مظاہرہ نہیں کیا، اور وہ ایس آئی او کی رکنیت کے دوران ایک حلقے کے سکریٹری بھی رہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ میدانی قیادت یا سماجی و اجتماعی قیادت کے لیے، سختی، گھن گرج اور رواں دواں رہنے والی جو خصوصیات چاہیے وہ ان میں کبھی نہیں دکھیں، یا یوں کہیں کہ وہ سرے سے اس میدان کے آدمی نہیں تھے۔ ہاں مطالعہ و تحقیق ان کا اصل میدان تھا، ان کی انھیں خصوصیات کو نظر میں رکھ کر انھیں ایس آئی او کے ترجمان، معروف رسالہ ماہنامہ رفیق منزل، دلی کی ادارت سونپی گئی، جس کے وہ تین سال، ستمبر 1987 تا دسمبر 1990 مدیر رہے۔ جب وہ اس ذمہ داری سے سبک دوش ہوئے اور جماعت کے رکن بنے تو انھیں

جماعت کی طرف سے ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کے تحقیقی مجلّہ سہ ماہی 'تحقیقات اسلامی' علی گڑھ کا نائب مدیر مقرر کیا گیا۔

ان تین رفقاء میں سے پہلے دو، یعنی بھائی صفدر اور منور صاحب میری طرح یونیورسٹی میں پیشۂ تدریس سے وابستہ ہوئے اور مصلحت خداوندی دیکھیے کہ دونوں ہی اپنی سروس کے دوران فوت ہوئے اور اس فریب گاہ ارضی کو بہت جلد الوداع کہہ گئے ۔منور بھائی اور طارق بھائی رفیق منزل کے ایڈیٹر رہے ہیں اور دونوں کے زمانہ ادارت میں یہ رسالہ اپنا ایک الگ معیار بنانے میں کامیاب ہوا۔منور صاحب کے دور میں، مجھے اس کا نائب مدیر ہونے کا شرف حاصل ہے۔منور صاحب کے بعد طارق صاحب تقریباً ایک سال تک اس کے مدیر رہے اور اس کے بعد تنظیم کی طرف سے مجھ پر بحیثیت مدیر اس کی ذمہ داری سونپی گئی اور تقریباً چھ سالوں تک (1992-1997) میں اس کا مدیر رہا۔ یہ واقعات و اتفاقات بھی کہیں نہ کہیں ان مخلص رفقائے تحریک سے، جو اپنے حصے کا کام بحسن و خوبی کرکے اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، میری گونا گوں نسبتوں اور مناسبتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو

منور حسین فلاحی جب تک ایس آئی او میں تھے اس کے ایک سرگرم کارکن رہے اور جب وہ اس کی سرپرست تنظیم جماعت اسلامی کے رکن بنے تو اس میں بھی وہ ہمیشہ متحرک و فعال رہے۔ان کے ساتھ تحریک اسلامی کے بہت سے پروگراموں اور مجالس میں شرکت کرنے کی وجہ سے انھیں قریب سے جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔وہ جہاں رہے ہر جگہ تحریک اسلامی کے ایک سچے اور وفادار سپاہی بن کر رہے۔ وہیں تحریک سے باہر کے عام لوگوں کے ساتھ حتی الامکان رواداری اور اعتدال سے پیش آنا اور تحریک/ جماعت کے تعلق سے دوسروں کے نقطۂ نظر کو بھی وسیع القلبی سے برداشت کرنا ان کے مزاج کا حصہ تھا۔

ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ (وامی) کی طرف سے ایک عالمی تربیتی پروگرام (غالبًا) 1989ء میں علی گڑھ میں منعقد ہوا تھا، جس میں ایس آئی او کے ایک نمائندہ کے طور پر میں بھی شریک تھا، اس میں شرکت کے لیے ایس آئی او ہیڈ کوارٹر سے جو وفد تشکیل پایا اس میں بعض دیگر رفقاء کے علاوہ میں، بھائی صفدر سلطان اور منور بھائی بھی شامل تھے۔ بلکہ منور بھائی ہی اس وفد کے کوآرڈینیٹر تھے۔ اس پروگرام میں ایس آئی ایم اور ہندوستان کی بعض دیگر اسلامی طلبہ تنظیموں کے نمائندے بھی شریک تھے۔اس کا نظم اصلاً سیمی کے بعض قدیم

ممبران کے ذمہ تھا۔اس میں مرحوم راؤعرفان صاحب،احمد اللہ صدیقی صاحب اور بعض دوسرے مقررین کو بیرون ہند سے بطور خاص بلایا گیا تھا۔اس پانچ روزہ کیمپ میں ہوئی کچھ تقریروں میں جماعت اسلامی کے روایتی طریقہ کار پر سخت نقد وتبصرہ کا عنصر غالب تھا اور ساتھ ہی اصلاحات کی کچھ نئی تجویزیں بھی بعض اطراف سے سامنے آئیں اور سوال و جواب کے وقفوں میں شدید نوک جھونک بھی ہوتی رہی۔الغرض اس کیمپ میں تحریک اسلامی کے مسائل اور ترجیحات کو لے کر گرما گرم بحث ومباحثہ دیکھنے کو ملا۔مجھے اچھی طرح یاد ہے میرے بعض سوالات پر راؤصاحب اور بعض دیگر مقررین نے قدرے جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا اور غصے کے ساتھ جواب دیا،لیکن دوران مباحثہ کسی ردعمل سے ماحول کبھی ایسا ناخوش گوار نہیں ہوا کہ بات بگڑ جائے اور پھر بنائے نہ بنے۔اس اجتماع کے مختلف اجلاسوں میں خوشگواری کو باقی رکھنے میں منور صاحب کا بڑااہم رول تھا،میں اس وقت ایک کم عمر نوجوان تھا،اپنے محدود علم ومطالعہ کی مدد سے وقفہ سوالات میں جوسوالات،یا اضافہ کرتا اس پر منور بھائی اور دیگر ساتھیوں نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی،لیکن انھوں نے شاید چوتھے یا پانچویں دن مجھے الگ سے ایک طرف لے جا کر جانے کیوں یہ مشورہ دیا کہ اب میں اپنے سوالات کا سلسلہ ختم (یا کم) کردوں۔اس کے بعد میں تقریباً خاموش ہوگیا،اس فرق کو بعض شرکاء نے محسوس بھی کیا اور مجھ سے اس اچانک خاموشی کی وجہ بھی پوچھی اور میرے سوالات اور خیالات پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اس سلسلے کو قائم رکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی،لیکن میں نے اطاعت امیر کو ترجیح دی جس سے منور صاحب کافی مطمئن نظر آئے۔شایداس سے ان کا مقصد ماحول کو غیر ضروری کشیدگی یا کسی قسم کی بدگمانی سے بچانا تھا،تاکہ یہ تاثر نہ عام ہو کہ یہاں ایس آئی او اور ایس آئی ایم میں فکری معرکہ آرائی ہورہی ہے یا ہم قصداً مقررین کو پریشان کررہے ہیں۔یہ سچ ہے کہ صحیح ترین نقطۂ نظر تک پہنچنے کے لیے اختلاف فکر کو تحریک اسلامی نے نہ صرف ہمیشہ انگیز کیا ہے بلکہ آگے بڑھ کر داخلی وخارجی دونوں سطح پر اس کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے اور اس روش نے اس کی فکری جڑوں کو کمزور کرنے کی بجائے کچھ اور مضبوط کرنے کا کام کیا ہے،لیکن یہ بھی سچ ہے کہ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی صبر وتحمل خود اپنے آپ میں ایک موثر اقدام بن جاتا ہے اور اس کے نتائج بعد میں زیادہ خوش نما شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔

بہر حال اس تجربے نے مجھ پر واضح کردیا کہ وہ ایک انتہائی متوازن اور خاموش کردار کے انسان تھے۔ بوئے گل کی طرح خاموشی سے اپنا کام کرتے رہنا اور اپنے اخلاق وعمل دونوں سے اپنے ساتھیوں کے مشام جاں کو معطر کرتے رہنا ان کی فطرت تھی۔وہ علی گڑھ میں مقیم تھے،جب کہ میں اور میری طرح وفد کے دوسرے

ممبران دلی اور کچھ دوسرے شہروں سے وہاں پہنچے تھے۔انھوں نے نہ صرف امیر وفد کی ذمہ داری دوران پروگرام بڑی تن دہی سے ادا کی بلکہ ہمارے قیام وطعام کو بہتر سے بہتر کرنے پر بھی پوری توجہ دی۔

اس پروگرام کے دوران ایک خاص بات یہ بھی ہوئی کہ جب ہمیں یہ محسوس ہوا کہ اس کیمپ میں جماعت اسلامی ہند کے خلاف خود تحریکی پس منظر رکھنے والے بعض اصحاب ایک پہلے سے بنی بنائی منفی سوچ بہ تکرار پیش کررہے ہیں اور اس سے تحریک کی شبیہ مجروح ہورہی ہے تو ہم نے اپنا یہ تاثر، مدیر تحقیقات اسلامی و رکن شوریٰ جماعت اسلامی ہند، مولانا جلال الدین عمری صاحب تک پہنچانے کا فیصلہ کیا، جو اس کیمپ کے اہم ریسورس پرسنز (مقررین) میں شامل تھے، ہمارے اس وفد کی قیادت جس میں بیشتر ایس آئی او کے رفقاء تھے، بھی منور صاحب نے ہی کی۔ہم نے مولانا عمری صاحب کے گھر جاکر پروگرام میں ابتدا سے چل رہی ایک خاص انداز کی تقریروں کی نوعیت اور اس کی پوری تفصیل بتائی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے دوسرے دن کے آخری سیشن میں ہوئی اپنی تقریر میں اس مخصوص رجحان کا بھر پور جائزہ لیا، بلکہ کہنا چاہیے نوجوان مقررین و منتظمین پر جم کر برسے اور ان کے رویے پر اپنی سخت ناراضگی کا اظہار کیا، جسے تمام شرکائے کیمپ نے محسوس کیا۔اپنی گفتگو میں انھوں جو کچھ کہا تھا اس کا ایک حصہ مجھے آج بھی یاد ہے۔انھوں نے کہا:''حال یہ ہے کہ آپ لوگ تو ہندو بیرون ہند اپنا شان دار مستقبل بنانے میں مشغول رہیں، لیکن تحریک کے اس بوڑھے ہوتے کیڈر سے جن کی ہڈیوں میں گودے تک نہیں بچے ہیں، انقلاب واصلاح کی آس لگا کر اور ان پر تنقید وتبصرہ کرکے خود کو مطمئن کیے رہیں، یہ طرزِ عمل نہ تو عملی ہے اور نہ حقیقی۔''

یہاں اس مثال کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مجھے اس سے اور اس طرح کے بعض دوسرے واقعات سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوا کہ منور بھائی نرم خو اور اعتدال پسند ضرور تھے، لیکن تحریک اسلامی اور اس کی روایات سے ان کی وفاداری بے لچک اور بے آمیز تھی اور اس سلسلے میں تحریک کے اندر یا اس کے باہر کوئی انھیں ٹس سے مس نہیں کرسکتا تھا۔یہ ہر اس شخص کی پہچان ہوتی ہے جو ایک باضمیر اور اصول پسند انسان ہوتا ہے۔

وہ نرم مزاج وروادار ضرور تھے لیکن میں نے انھیں اسلام وتحریک اسلامی کے تقاضوں کے خلاف سمجھوتہ کرتے کبھی نہیں دیکھا۔6/دسمبر 1992ء کو ہندوتخریب پسندوں اور ہندوتوا دہشت گردوں کے ہاتھوں بابری مسجد کو شہید کیے جانے کے بعد دنیا کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی طرح ان کا شیشہ دل بھی بری طرح ٹوٹا تھا، انھیں ذاتی نشستوں اور باہمی ملاقاتوں میں اس واقعے پر حسب موقع اپنا درد بڑے ہی دل سوز وغم ناک

انداز میں بیان کرتے دیکھا گیا۔اس واقعے کے بعد کانگریس کی نرسمہا راؤ حکومت کی طرف سے جماعت اسلامی اور آر ایس ایس سمیت ملک کی پانچ بڑی مذہبی تنظیموں پر 10 ردسمبر 1992ء کو پابندی لگائی گئی، جب کہ جماعت پر لگی پابندی کو سپریم کورٹ نے 18 رمارچ 1994ء کو کالعدم قرار دیا تھا۔اس وقت مسلمانوں، خصوصاً جماعتی حلقوں میں اس پابندی کے خلاف لکھے گئے تجزیوں اور مضامین میں ایک بات بالعموم مشترک طور سے دہرائی گئی تھی جو یہ تھی کہ اس واقعے کو لے کر جماعت اسلامی پر پابندی کا کوئی قانونی واخلاقی جواز حکومت کے پاس نہیں تھا لیکن اس نے بابری مسجد کے انہدام اور اس کے نتیجے میں پورے ملک میں پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ فسادات میں براہ راست ملوث رہنے والی ہندو جماعتوں کے ساتھ دو مسلم جماعتوں پر پابندی لگانے کا فیصلہ محض توازن کی پالیسی کے تحت کیا ہے، تاکہ انتہا پسند ہندو گروہوں کو اعتراض کا موقع نہ ملے۔'توازن کی پالیسی' والی بات خود میں نے بھی ضمناً اپنے اداریے میں دہرائی تھی اور اس وقت کی مرکزی حکومت کے اس نامعقول رویے کے پیچھے کارفرما اسباب کو بیان کرتے ہوئے یہ لکھا تھا: ''اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ حکومت بابری مسجد کے مجرموں کو قرار واقعی سزا دے کر ہندوؤں کو ناراض کرنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی، اس لیے انھیں سزا دینے کی بجائے اس نے آر ایس ایس و بجرنگ دل سمیت تین ہندو جماعتوں اور جماعت اسلامی سمیت دو مسلم جماعتوں پر پابندی لگا کر بس ایک ڈرامہ رچا جس کا مقصد اصل مسئلے سے فرار اور اکثریتی فرقے کو ناراض نہ کرنے سے بچنا ہے، اسی لیے جماعت کو بغیر کسی وجہ کے اس میں گھسیٹ لیا گیا تاکہ سیاسی پلڑے کو متوازن رکھا جا سکے۔'' (رفیق منزل، اپریل 1994) ظاہر ہے یہ اس فیصلے کے پیچھے کے اسباب وعوامل کا ایک جز تو ہو سکتا ہے لیکن اسے ہی اس کا اصل سبب مان کر اس پر تجزیے کی بنیاد رکھنا ایک طرح سے حکومت کی بدنیتی اور اس کے ناقابل معافی گناہوں پر پردہ ڈالنے جیسا تھا۔منور صاحب کو توازن والی بات سے اختلاف تھا جس کا اظہار انھوں نے ہم لوگوں سے بڑی شدت سے کیا اور وہی بات دہرائی کہ حکومت کے ایک انتہائی شرم ناک اقدام کا اتنا معمولی سبب بیان کرنا اس کے گناہوں کو ہلکا کرنے جیسا ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ نرسمہا راؤ حکومت کا یہ اقدام بھی اس کی مسلم دشمن سوچ کی غمازی کرتا ہے۔اپنے اس نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لیے منور بھائی نے مجھے ایک مراسلہ بھی بھیجا تھا، جسے میں نے رفیق منزل، مئی 1994 کے شمارہ میں شائع کیا تھا۔ یہ مثال اس بات کا ایک بیّن ثبوت ہے کہ ان کے مزاج میں نرمی و رواداری ضرور تھی، لیکن جب بات اسلام، اسلامی اصولوں اور حق وانصاف کی آجاتی تو ان کی دینی غیرت اور ملی حس پوری طرح بیدار ہو جاتی اور اس راہ میں وہ کسی قسم کی مداہنت کے روادار نہ ہوتے۔

اختلاف رائے کو خوش آمدید کہنے والا

وہ نہ تو تحزب پسند تھے اور نہ ان کے اندر جماعتی تعصب وتنگ نظری کا کوئی اثر تھا، بلکہ توسع پسندی و کشادہ دلی کا سکھایا ہوا تحریک کا پرانا سبق انھیں اچھی طرح یاد تھا۔اختلاف رائے ان کے مسلک میں حرام نہیں تھا، بلکہ اسے برداشت کرنا اور آگے بڑھ کر اسے خوش آمدید کہنا ان کے اخلاق میں شامل تھا۔اس کی ایک بڑی مثال یہ ہے کہ انھوں نے رفیق منزل کے افضل حسین نمبر میں اسرار عالم صاحب کا ایک ایسا مضمون بھی شائع کیا جس کا مخصوص شمارہ کے موضوع سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے اور المیہ یہ ہے کہ اس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے فکر پر تقریباً اسی انداز سے تنقید کی گئی ہے اور ان پر اسی طرح شکوک وشبہات کی گرد اڑائی گئی ہے جس طرح تحریک کے ابتدائی دنوں میں اس کے روایتی مخالفین اور مولانا مودودی اور ان کے فکر سے عناد رکھنے والے بعض گروہ ان کے خلاف لکھتے اور بولتے ہوئے کرتے رہے ہیں اور آج بھی جماعت وسید مودودی سے عناد رکھنے والے ایسا کرتے جارہے ہیں اور وہ تحریک و بانی تحریک کے خلاف ہر روز نیا طوفان کھڑا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔مذکورہ مضمون میں مولانا مودودی کے تصور امامت و قیادت کے تعلق سے اس قسم کے جملے بھی شامل ہیں:''مولانا مودودی نے امامت و قیادت کا جو مفہوم لیا ہے، وہ مذکورہ قرآنی مفہوم سے الگ کوئی شے ہے''۔ایک دوسری جگہ یہ لکھا ہے:''بادی النظر میں یہ نظریہ نہایت وقیع معلوم ہوتا ہے،لیکن تجزیہ کرنے کے بعد صورت حال بدل جاتی ہے اور بظاہر اس کا قرآن وسنت کے مطابق ہونا بھی مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔'' (رفیق منزل، افضل حسین نمبر، ستمبر ۱۹۹۰ء) ظاہر ہے اس وقت اس مضمون پر تبصرے کی بالکل گنجائش نہیں ہے،بس یہاں مجھے یہ کہنا ہے کہ جو شخص بھی تعلیم اور امامت وخلافت کے تعلق سے مولانا مودودی کے جامع نظریات کے سیاق وسباق سے پوری طرح آگاہ ہے وہ ان کی کسی ایک عبارت کا تجزیہ کرکے یہ ناقص نتیجہ نکالنے کی غلطی کبھی نہیں کرے گا جو اس عبارت میں موجود ہے۔

جس وقت یہ مضمون شائع ہوا میں اس رسالہ کا معاون مدیر بھی تھا اور مجھے خود اس کی اشاعت پر سخت تعجب تھا۔واضح رہے یہ اسی سید مودودی کے ایک مضمون پر تبصرہ ہے جو'خلافت وملوکیت' جیسے عظیم شاہ کار کا مصنف ہے اور جس کی حیثیت اسلامی تصور امامت وسیاست کی تحقیق وتفہیم میں ایک سنگ میل کی طرح ہے۔ جی ہاں یہ اسی اسلامی مفکر پر تبصرہ ہے جس کے نزدیک اسلامی خلافت و امامت 'نبوت کا دوسرا نام' ہے۔ (خلافت وملوکیت:۹۶) جس نے واضح لفظوں میں لکھا ہے کہ تحریک اسلامی کی ''جدوجہد کا آخری مقصد

انقلاب امامت ہے، یعنی دنیا میں فساق و فجار کی امامت ختم ہوکر امامت صالحہ کا نظام قائم ہو'۔ اور جس کے ان الفاظ سے پوری دنیا واقف ہے: ''حکومت اور اس کے اختیارات اور اموال، خدا اور مسلمانوں کی امانت ہیں جنھیں خدا ترس، ایمان دار اور عادل لوگوں (ائمہ وحکام) کے سپرد کیا جانا چاہیے۔۔۔۔۔ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤدُّواْ الأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا ... (خلافت وملوکیت: ۵۵)۔ مولانا مودودی کی کتابوں میں ایسی درجنوں عبارتیں پائی جاتی ہیں جن میں قرآن وسنت میں موجود اسلامی تصور امامت کی روح کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی ہے، لیکن کسی کو اپنی کوتاہ نظری کے سبب یہ روشن حقیقت نہ نظر آئے اور وہ سیاق وسباق سے قطع نظر محض کسی ایک مضمون کی بعض عبارتوں سے اپنے تئیں یہ نتیجہ نکال لے کہ مولانا مودودیؒ کا تصور امامت قرآن وسنت سے مختلف یا مغربی فکر سے متاثر ہے اور داستان کو بلا وجہ دراز کر کے بزعم خویش یہ مان لے کہ اس نے تحقیق کا بہت بڑا میدان سر کر کے مولانا مودودی کو رائج مغربی فکر سے متاثر ثابت کر دیا ہے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے نہ کہ مولانا مودودی کا۔

لیکن بہر حال منور صاحب نے محض اس وجہ سے رفیق منزل میں اس مضمون کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا کہ اسی بہانے اس موضوع پر اس میں اچھے مضامین کا سلسلہ شروع ہوسکتا ہے اور یہ بحث مثبت نتائج کی حامل بن سکتی ہے۔ انھوں نے جس نوٹ کے ساتھ اسے شائع کیا اس کی یہ عبارت اسی بات کا ثبوت ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''اس خیال سے (صاحب مضمون کے خیال سے) اختلاف بھی ممکن ہے، یہ مضمون اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ زیر بحث افکار کی بہتر تفہیم کے لیے ایک نقطہ آغاز فراہم کرتا ہے، اہل علم ونظر کو اظہار خیال کی دعوت ہے۔'' مولانا مودودی کے فکر پر اسرار صاحب کا تبصرہ دیکھ کر کسی بھی صاحب علم ونظر کو اس کے بے سر و پا اور لا طائل ہونے میں شاید ہی کوئی شک ہو لیکن یہ منور صاحب کی ہی وسیع القلبی اور تحریک اسلامی کی تربیت تھی کہ اسے انھوں نے جماعت اسلامی کی طلبہ تنظیم کے رسالہ کے ایک خاص نمبر میں جگہ دی۔

ان مثالوں سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ منور صاحب ایک انتہائی وسیع النظر اور وسیع الظرف انسان تھے، لیکن جیسا کہ بتایا گیا، اس رواداری سے کسی کو یہ شبہ ہرگز نہ ہو کہ وہ رشتوں کو نبھانے میں اصولوں کو نظر انداز کر دیتے تھے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ جس طرح درون خانہ تحریک کے وفادار بن کر رہتے اسی طرح وہ ہر محاذ پر اس کے وفادار کارکن کا کردار ادا کرتے اور اس کے فکر ونظر کا دفاع کرنا وہ اپنا پہلا فرض سمجھتے۔ حق یہ ہے کہ کسی بھی موقع پر جماعتی کام، جماعتی فکر اور جماعتی مفادات کو نظر انداز کرنا انھیں گوارا نہیں تھا۔

زبان وبیان کا اداشناس

منور صاحب ایک پختہ قلم کے مالک اور زبان وبیان کے ایک معتبر اداشناس تھے۔اردوادب ان کا خاص میدان تھا اور اس کے مبادی ومناہج اور اس کی جدید وقدیم جہتوں اور شعری و بلاغتی نفاستوں سے وہ پوری طرح آگاہ تھے۔زبان کے معاملے میں وہ ماحول کی نزاکت کا ہمیشہ خیال رکھتے،لفظوں کو تول کر استعمال کرتے،کہاں کس ماحول میں،کسے اور کیسے مخاطب کرنا ہے اس سے وہ خوب واقف تھے۔زبان و بیان اور ادبی نزاکتیں چونکہ ان کی دلچسپی کا موضوع تھیں اس لیے جہاں ضرورت ہوتی بڑے ہی لطیف اور مہذب طریقے سے دخل دینے سے بھی نہیں چوکتے۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ وامی یعنی مسلم نوجوانوں کی عالمی تنظیم WAMY(الندوة العالمية للشباب لاسلامی)کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر مانع حماد محمد الجہنی (1942-2002)رحمہ اللہ نے اپنے دورۂ ہند کے دوران ایس آئی او کے ہیڈکوارٹر کا بھی دورہ کیا، یہاں ان کے اعزاز میں بعض پروگرام بھی رکھے گئے۔ دوسرے دن جب وہ یہاں سے رخصت ہونے کے لیے تیار ہوئے تو ہم دو چار لوگ آگے بڑھے،پھر ہوا یہ کہ ہم انھیں چھوڑنے کے لیے تنظیم کے اس وقت کے ہیڈکوارٹر کے دروازے پر کھڑے تھے جو ایس آئی او کے موجودہ دفتر کے سامنے ایک دو کمروں کے مکان میں سمٹا ہوا تھا اور جس میں بعد میں سابق قیم جماعت مولانا محمد جعفر صاحب بہت دنوں تک رہائش پذیر تھے۔مہمان کے ساتھ اس وقت دوسرے رفقاء کے علاوہ منور صاحب بھی کھڑے تھے،اس دوران تنظیم کے ایک اہم ذمہ دار،جن کی انگریزی شاید بہت کمزور تھی،نے چلتے چلتے جہنی صاحب سے پوچھا:’آفٹر وی‘؟(After we)مہمان کی سمجھ میں نہیں آیا۔انھوں نے پوچھا’کیا‘؟ ہمارے رفیق محترم نے تین بار اپنا سوال دہرایا،لیکن مہمان معظم سمجھنے سے قاصر رہے،موقع کی نزاکت محسوس کر کے منور صاحب نے دھیرے سے کہا:آفٹر اس،(After us)۔اب مہمان سوال کا مقصد سمجھ گئے، دراصل وہ صاحب پوچھنا چاہ رہے تھے کہ یہاں کے بعد ان کا کیا پروگرام ہے،لیکن بولنے میں قواعد کی غلطی کر رہے تھے،منور صاحب نے محض ایک لفظ بدل کر بڑی خوبصورتی سے دونوں کی پریشانی دور کردی اور کسی کو اندازہ بھی نہیں ہوا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔میں نے اپنی تقریر کو مزین کرنے کے لیے مدرسی تعلیم کے ابتدائی دنوں میں ہی اقبال کی کلیات سے چند اشعار اپنی پسند کے یاد کر لیے تھے جو میرے قد سے زیادہ وزندار تھے۔ان اشعار میں سے ایک شعر یہ تھا:

تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خم دار کی نمائش، مریز و کج دار کی نمائش

یہ شعر اقبال کی ایک مختصر نظم ’ کارل مارکس کی آواز‘ کا حصہ ہے اور اس میں شاعر مشرق نے قدیم و جدید معاشی نظریات کو نشانہ بنایا ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ میرے ذہن میں اس شعر کا ایک لفظ ’مریز‘ جو کہ فارسی کا مرکب ہے جانے کب عربی لفظ ’مریج‘ کی صورت اختیار کر گیا تھا،اب میں جب بھی اسے پڑھتا ’مریج‘ ہی پڑھتا، پڑھتے وقت بسا اوقات ذہن الجھتا کہ آخر یہاں مریج کیوں آیا ہے اور کیا یہ اردو میں مستعمل ہے۔ایک دو بار کلیات سے رجوع کرنے کا بھی خیال آیا لیکن زندگی کی مصروفیات میں گم ہو کر رجوع کرنا اور یہ معلوم کرنا بھول جاتا کہ یہ مریج ہے یا کچھ اور چوں کہ میری عربی زبان و ادب سے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہے اس لیے ذہن نے اپنے آپ یہ تاویل کر لی کہ اس سے اقبال کا مقصد مشکوک و متذبذب فکر و خیال ہوگا۔کیوں کہ عربی میں ’مریج‘ مشکوک، ملتبس، مختلط گڈ مڈ اور کنفیوزن میں ڈالنے والی بات کے معنی میں مستعمل ہے۔یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ذہن جب کسی چیز کی از خود تاویل کر کے مطمئن ہو لے تو اس میں مزید سوچنے یا جستجو کرنے کی گنجائش کم ہی بچتی ہے۔ایک بار منور صاحب سے جدید معاشی افکار کے پیچ و خم پر گفتگو ہو رہی تھی کہ اس اثنا میں میں نے اپنا یہ پسندیدہ شعر اپنے تصرف کے ساتھ دہرایا۔منور صاحب اردو ادب کے آدمی تھے،سن کر چونکے اور پوچھا یہ ’مریج‘ کیا ہے؟ میں نے کہا یہ: عربی لفظ ہے جس کا مفہوم ہے مشتبہ و مشکوک۔وہ ہنسے اور کہا آپ نے اقبال کے شعر میں یہ تصرف کیوں کر لیا، جب کہ اصل شعر میں ’مریز‘ ہے، میں بھی ہوش میں آ گیا، پھر بغیر کسی لمبی تشریح و وضاحت اور طولانی بحث و تکرار کے انھوں نے برجستہ فارسی کا درج ذیل شعر سنا کر پوچھا کہ اس شعر کا مفہوم تو آپ کو معلوم ہی ہوگا۔شعر یہ تھا:

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

میں نے کہا: ہاں،اور مجھے ایک ہی جھٹکے میں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور ساتھ ہی میرے چودہ طبق بھی روشن ہو گئے۔میں نے استغفر اللہ پڑھ کر خود سے پوچھا آخر تم نے مریز (Ma,raiz) کو کس کی مرضی سے ’مریج‘ کر کے شعر کے مفہوم کا تیہ پانچا کر دیا تھا۔آخر فارسی کا یہ مفہوم میرے ذہن میں کیوں نہیں سمایا؟ بہر کیف میں نے غلطی تسلیم کی اور دل سے برادر محترم کا شکریہ ادا کیا۔آپ کو یہ مثال شاید معمولی محسوس ہو لیکن

میرے لیے یہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یہ ایک ساتھ مرحوم کی بہت ساری خوبیوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ منور صاحب کی اپنے موضوع پر گرفت اور پیش کش (Communication) پر حیرت انگیز قدرت جو کہ علم و تحقیق کی اساس ہے، کو بھر پور طریقے سے نمایاں کرتی ہے۔ آپ یقین کریں محض اس ایک اصلاح اور اس کے خوب صورت انداز سے آج بھی ایک شاگرد کی طرح میرا دل ان کے لیے شکر و سپاس کے احساس سے لبریز ہے، کیوں کہ میرے نزدیک کسی کا علمی احسان فراموش کرنا سب سے بڑی احسان فراموشی ہے۔

ایک کشادہ دل رفیق

دوسروں کو آگے بڑھنے کی حوصلہ افزائی کرنا اور خود کو سمیٹ کر رکھنا اور اظہار و نمائش سے دور رکھنا ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ اس کا بھر پور تجربہ مجھے اس وقت ہوا جب میں ان کی ادارت کے زمانے میں رفیق منزل کا مدیر معاون بنا۔ جب رسالہ کے ادارتی امور میں معاونت کے لیے مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی اس وقت میں جامعہ میں بی اے کا طالب علم تھا، وہ علی گڑھ میں رہتے تھے اور میں دلی میں مقیم تھا،لیکن ہفتے دو ہفتے کے وقفے سے وہ دلی آتے رہتے تھے،کبھی تنظیم کے کسی پروگرام میں شرکت کے لیے تو کبھی کسی اور کام سے، جب میں معاون مدیر بنا تو ان کا آنا کم ہوتا چلا گیا اور دھیرے دھیرے ان کا اعتماد مجھ پر اتنا بڑھ گیا کہ تقریباً ادارت کی پوری ذمہ داری مجھ پر آن پڑی، یہاں تک کہ ہر نئے شمارے کا اداریہ لکھنے کی ذمہ داری بھی میرے کمزور کاندھوں پر آ گئی۔ شروع میں تو میرے اصرار پر ایک دو بار انھوں نے کچھ لکھا،لیکن بعد میں مجھ سے اور تنظیم کے ذمہ داروں سے صاف کہ دیا کہ اب اداریہ بھی وہی (یعنی میں) لکھیں گے کیونکہ وہ اس کے اہل ہیں۔ جب میں اداریے کے لیے فون کرتا تو کہتے ،اب تم ہو تو میں بے فکر ہو گیا ہوں،اب انتظار کیسا،خود اداریہ لکھ کر رسالہ پریس میں بھجوا دیا کرو۔اس طرح ان کی ادارت کے آخری ایک سال تک تقریباً یہی سلسلہ چلتا رہا، مدیر وہ تھے لیکن اداریہ میں لکھتا تھا،اس سے نہ صرف میری بھر پور حوصلہ افزائی ہوئی بلکہ کم عمری میں ایک قومی سطح کے مجلّہ میں اداریہ لکھنے سے میرے اندر ایک نئی خود اعتمادی بھی پیدا ہوئی۔اس بیچ کبھی کبھی میرے اداریوں اور مضامین پر ان کی طرف سے جو تحسین و آفریں کے کلمات سامنے آئے اس نے مجھے مزید اعتماد بخشا۔اس آزاد ماحول میں کام کرنے کی وجہ سے جہاں ایک طرف میرے فکر کو پختگی ملی وہیں میرے قلم میں مزید روانی پیدا ہوئی۔ یاد آتا ہے انھوں نے صرف ایک بار میرے مضمون کی ایک سرخی پر ہنستے ہوئے سوال کیا تھا، جو یہ تھی 'آگ اور خون کے سمندر میں تیرتا ہندوستان' یہ فی الواقع میرٹھ و ملیانہ فساد پر لکھے گئے میرے ایک تجزیہ کی

ہیڈنگ تھی، انھوں نے کہا ’آگ‘ پر کوئی چیز کیسے تیر سکتی ہے؟ میں نے مسکرا کر جواب دیا: وہاں ’خون‘ بھی تو ہے۔ جب ’آگ کا دریا‘ پہلے سے ہے تو اس میں ہندوستان کا تیرنا کیوں کر بعید از عقل ہے۔ میرے جواب پر وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے اور کہا: ٹھیک ہے۔ ان کے ساتھ (بلکہ ان کے ماتحت) کام کرتے ہوئے نہ تو کبھی کسی دھونس کا سامنا کرنا پڑا، نہ سینیئر اور صاحب اختیار ہونے کا ان کے یہاں کوئی رعب نظر آیا اور نہ کوئی چیز مجھ پر مسلط کی گئی۔ اتنے خوش گوار ماحول میں اور ایسے شفیق و مہربان رفیق کے ساتھ کام کرنے کا مجھے جو موقع ملا اسے بھی میں اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں۔ شاید منور صاحب کے اس حوصلہ افزا طرز عمل کی وجہ سے اس مختصر مدت میں مجھے حاصل ہونے والی خود اعتمادی اور اس کا عملی نتیجہ ہی تھا کہ ادارت سے ان کی سبک دوشی کے تقریباً ایک سال بعد رفیق منزل کے مدیر کی ذمہ داری کے لیے تنظیم کے ارباب حل وعقد کی نظر مجھ پر پڑی۔ بے شک جب بھی منور بھائی جیسے خوش اخلاق، خوش مزاج، قابل اور کشادہ دل اصحاب علم وفکر کے ساتھ مجھ جیسے خوردوں کو کام کرنے کا موقع ملتا ہے اس سے نہ صرف ان کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ ان کی صلاحیتوں کو نئے انداز سے جلا ملتی ہے۔ ہر وہ مسلم تنظیم جو انقلاب زمانہ کے لیے اٹھی ہے اسے نسل نو کے لیے اپنے گرد وپیش ایسا ہی کشادہ و حوصلہ بخش ماحول پیدا کرنا پڑتا ہے، تاکہ اس میں ہر جوہر قابل کے چمکنے اور ہر سطح پر قیادت کی سکنڈ لائن کے ابھرنے میں کوئی چیز حارج نہ ہو۔

علم وتحقیق

جہاں تک ان کی علمی وتحریکی خدمات کا معاملہ ہے تو شروع سے علی گڑھ ہی ان کی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے، وہ جماعت میں شمولیت سے پہلے ایس آئی او، یو پی کے رکن شوریٰ اور کچھ مدت تک سکریٹری حلقہ بھی رہے ہیں، بحیثیت رکن جماعت وہ علی گڑھ میں مقامی سطح پر ہمیشہ سرگرم رہے ہیں۔ یہاں خاص طور سے جماعت کے ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی سے وہ باقاعدہ وابستہ تھے اور مولانا جلال الدین عمری صاحب کو ان کا خصوصی تعاون حاصل تھا، جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ وہ مولانا عمری کی زیر ادارت اس ادارہ سے نکلنے والے موقر مجلّہ سہ ماہی ’تحقیقات اسلامی‘ کے نائب مدیر بھی تھے۔ ان کی صلاحیتوں کا اظہار صحافت اور تحقیق وتصنیف کے میدان میں بطور خاص ہوا، علم وتحقیق کا میدان ہی ان کا اصل میدان تھا اور اس میدان میں بھی ادبیات یعنی زبان وبیان سے تعلق رکھنے والے مباحث اور اسلامیات سے انھیں خصوصی دلچسپی تھی۔ ہندوستان میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سندیں لینا اب کوئی بڑی بات نہیں رہی، لیکن جوہر قابل تو بہرحال جوہر قابل ہی ہوتا ہے۔ وہ

جہاں بھی ہوا اپنا کچھ نیا رنگ لے کر ظاہر ہوتا ہے اور اپنی مسلسل سعی وجستجو سے اپنے میدان میں نئی چھاپ چھوڑتا ہے۔منور حسین فلاحی صاحب میں کچھ ایسا ہی جوہر قابل تھا،ان کا ایم فل کا مقالہ 'مولوی چراغ علی کی علمی خدمات' پر ہے۔یہ مقالہ اس موضوع پر ایک بہت ہی عمدہ اور معتبر کام کا درجہ رکھتا ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا کہ اسے خدابخش لائبریری، پٹنہ جیسے اہم ادارے نے اسے اپنے اہتمام میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ان کی پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ 'اردو میں علمی نثر' جیسے اہم عنوان پر لکھا گیا ہے،اور یہ کام بھی اس خاص میدان میں ایک اضافہ ہے اور امید ہے اسے بھی اشاعت کے بعد اہل علم کے درمیان خاص قبولیت حاصل ہوگی۔ان کے دیگر اہم مقالات ومضامین میں بعض جو خصوصی ذکر کے مستحق ہیں وہ یہ ہیں: 'مغربی علوم سے اردو میں تراجم کا مسئلہ' (ضیا میگزین،علی گڑھ ۱۹۹۱ء)، 'جوش کی شاعری میں ترقی پسند عناصر' (آہنگ سر سید،علی گڑھ،۱۹۸۸ء)، 'اردو زبان منفی رجحانات کے زیر سایہ' (حیات نو،۱۹۹۵ء)، 'اقبال کی نظم،سرگذشت آدم ایک مطالعہ' (فکر ونظر،علی گڑھ ۱۹۹۵ء)، 'رشید احمد صدیقی کی تنقید اقبال' (فکر ونظر،علی گڑھ ۱۹۹۶ء)، 'موجودہ نظام تعلیم، مقصد ومنہاج' (تہذیب الاخلاق،علی گڑھ ۱۹۹۶ء)، 'سر سید کی معنویت' (تہذیب الاخلاق،علی گڑھ ۱۹۹۶ء)، 'بیسویں صدی میں اردو نثر کے اہم رجحانات' (قومی آواز،۲۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء)۔ ان کے قلم سے تحقیقات اسلامی میں علمی تالیفات پر جو تبصرے ہوئے ہیں وہ بھی بہت وقیع اور فکر انگیز ہیں اور صاحب تبصرہ کے علمی مرتبے کو اجاگر کرتے ہیں۔

فی الواقع منور صاحب ایک محنتی، ذہین اور ایمان دار اسکالر تھے۔ان کا تعلق لکھنے والوں کے اس بے مصرف گروہ سے نہیں تھا جو صرف لکھنے کے لیے یا کام چلانے کے لیے لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں، بلکہ ان کا تعلق اسکالرز اور محققین کے اس گروہ سے تھا جو اپنی انقلاب آفرین جستجو اور بالیدہ صلاحیتوں سے نہ صرف اپنے میدان میں اپنا استحقاق ثابت کرتے ہیں، بلکہ اپنی فکر وتحقیق کو علمی دنیا کے لیے زیادہ سے زیادہ سودمند بنانے میں محو رہتے ہیں۔ظاہر ہے یہ سہل پسندوں کی نہیں بلکہ مشکل پسندوں کی راہ ہے۔ایک بار کا واقعہ ہے کہ وہ دوپہر کے کھانے کے بعد ایس آئی او دفتر، ابوالفضل میں ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے،شام کو انھیں ایک ٹرین سے علی گڑھ واپس جانا تھا اس لیے پوری تیاری کر کے بیٹھے تھے،اس بیچ وہ تاریخ آزادی ہند پر انگریز مصنف کی لکھی ایک قدرے ضخیم اور معروف کتاب پڑھنے میں منہمک ہو گئے،ٹرین کا وقت جب بالکل قریب آ گیا بلکہ نکلنے لگا تو کسی نے یاد دلایا جناب آپ کو واپس جانا ہے،انھوں نے کہا: 'میں بعد کی کسی اور ٹرین سے

چلا جاؤں گا، یہ کتاب بہت اچھی اور معلوماتی ہے، پھر پڑھنے کو ملے نہ ملے، اب تو میں اسے ختم کر کے ہی جاؤں گا'۔ واہ واہ، کسی طالب و محقق کا یہ انہماک و استغراق اس کے ایک اچھا اور خالص اسکالر ہونے کی شہادت ہے۔

ایک صاحب نظر اسکالر

علم و ادب کی دنیا میں ایک صاحب قلم کا کیا مرتبہ ہے، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دقیق ادبی و علمی موضوع پر اظہار خیال کرتا ہے، اس کے اپنے قد کو ناپنے کے بہت سے پیمانے ہیں، میرے نزدیک ان میں یہ دو باتیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں، ایک یہ کہ اس کی تحقیق محض نقل اقوال و تلخیص افکار پر منحصر نہ ہو بلکہ اس کی چھیڑی ہوئی بحث میں اس کا تنقیدی شعور بھی پوری طرح متحرک نظر آئے، اور جہاں موقع و محل کا تقاضا ہو وہاں وہ دلائل کے ساتھ تنقید و تبصرہ کا فریضہ ادا کرنے سے فرار نہ اختیار کرے۔ دوسرے یہ کہ کسی فکر کی ترجمانی کے وقت اس کے اپنے کلمات و بیانات کتنے جاندار اور نقطہ سنج ہوتے ہیں یہ بھی صاحب قلم کی اس حیثیت پر روشنی ڈالتے ہیں کہ وہ خود کتنا صاحب نظر ہے، اور اس کا اپنا اسلوب بیان کتنا محکم ہے اور وہ پر تاثیر اظہار و ترسیل پر کس حد تک قادر ہے۔ میں نے ان کے جو علمی مضامین دیکھے ہیں ان کی بنیاد پر میں یہ بات پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ منور صاحب کی تحقیقی کاوشوں میں یہ دونوں عناصر بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ طوالت سے بچتے ہوئے محض ان کے ایک مضمون 'رشید احمد صدیقی کی تنقید نگاری' سے ایسی دو مثالیں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن سے ان کی تحریروں میں موجود ان دونوں خصوصیات کی تصدیق ہوتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کے ادبی مضامین میں اقبال شناسی کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ اقبال ان کے نزدیک اردو کا سب سے عظیم شاعر ہے اور جن شاعروں نے اردو کے اس عظیم نقاد کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اور جنھیں ان کی نظر میں پایہ اعتبار حاصل ہے ان میں سب سے اعلیٰ مقام پر جو شاعر متمکن ہے وہ کوئی اور نہیں بلکہ اقبال ہی ہیں، یہاں تک کہ وہ علمی و فکری مباحث اور حیات انسانی کے فلسفیانہ مسائل کو لافانی و فکر انگیز شعری اسلوب میں پیش کرنے والی زبان و بیان اور افکار و موضوعات کی بلند پروازی کے لحاظ سے اقبال کو غالب پر بھی فوقیت دیتے ہیں، ان کا نظریہ ہے کہ اقبال صرف ایک شاعر ہی نہیں ہے بلکہ ایک عظیم مفکر و فلسفی بھی ہے، اور ایک 'مفکر و رہبر کی حیثیت' میں اقبال کو جو درجہ حاصل ہوا وہ آج تک کسی مسلمان شاعر و ادیب کے نصیب میں نہیں آیا۔ وہ اقبال کے عظیم و اعلیٰ فکر کا ماخذ 'عظیم تصور اسلامی' کو مانتے ہیں۔ اقبال کی نظم شکوہ اور ان کے دیگر اشعار کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے فکر و شعر میں موجود بے مثال رفعت و بلندی انھیں اس مقام پر

پہنچا دیتی ہے جہاں وہ تقدیر اور مشیت ایزدی سے بھی ٹکرانے لگتے ہیں، رشید احمد صدیقی اقبال کی شاعری کے اس پہلو کو بھی ان کے ان بڑے امتیازات میں تصور کرتے ہیں جن میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ لکھتے ہیں" غالب اور اقبال دونوں مشیت کی اصلاح کے درپے تھے یا اس سے بغاوت کرتے تھے۔۔۔"

رشید احمد صدیقی کے اس خیال سے منور حسین فلاحی کو اتفاق نہیں ہے، اس پر جچے تلے لفظوں میں انھوں نے جو مختصر اور ناقدانہ تبصرہ کیا ہے اس نے میری نظر میں اس مضمون کی وقعت کو کافی بڑھا دیا ہے، جو شخص اقبال کو اسلامی تصور حیات کی عظمت کا نگہبان مانتا ہو وہی انھیں غالب کی طرح مشیت الٰہی کا 'باغی' بھی مانے، یہ نظریہ، خواہ اس کے پیچھے کیسی ہی نیک نیتی ہو، بادیٔ النظر میں غلط اور فکری تضاد کا حامل محسوس ہوتا ہے۔ اس خیال کے تعلق سے منور صاحب کی رائے یہ ہے:

''کوئی بھی صاحب نظر سرسری مطالعے میں اسے نکتے کی بات تصور کر سکتا ہے، مگر دراصل مذکورہ بالا بیان اور اقبال سے متعلق (رشید صدیقی کے) دیگر بیانات میں جو تضاد ہے اس کا ذکر محتاج تفصیل نہیں ہے۔ البتہ موضوع کا تقاضا اور موقع و محل کی رعایت کا مقتضا یہ ہے کہ اسے ایک وقتی جذبہ ہمدردی کے تحت دیے گئے فیصلے سے زیادہ اور کچھ نہ سمجھا جائے۔''

(رشید احمد صدیقی کی تنقید اقبال: تنقید اقبال: فکر و نظر، علی گڑھ 1996)۔

دیکھیے انھوں نے کتنے ایجاز کے ساتھ اپنی درج بالا عبارت میں اس عظیم ادیب پر نقد کیا ہے جس کی طرف داری انھوں نے پورے مضمون میں کی ہے۔ اگر چہ یہ ایک مدلل نقد نہیں ہے، لیکن ایک بڑے ادیب و نقاد کی تضاد بیانی کی طرف اشارہ کر کے صاحب مضمون نے اس کے کمزور پہلو سے آگاہ رہنے اور اسے مثبت زاویے سے دیکھنے کی بات جس خوبصورتی سے کی ہے وہ اس کے صاحب نظر ہونے کی دلیل ہے۔

رشید احمد صدیقی کے یہاں اقبال کا شعری فکر و فلسفہ عام شاعروں کی طرح محض ایک شاعرانہ خیال نہیں ہے جو منتشر و غیر مربوط ہو، بلکہ ان کے شعر و فلسفہ میں ایک منطقی ربط پایا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا فلسفہ ایک عظیم اسلامی عقیدے کا تابع ہے جسے رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ ''عالمی عقیدہ رحمت'' کا نام دیا ہے۔ منور صاحب نے رشید صاحب کے فکر کی وضاحت کے بعد ان کی اس بات کی تصدیق و تائید میں اپنی جو رائے اپنے الفاظ میں پیش کی ہے وہ فکری پختگی اور زبان و بیان پر قدرت کے ساتھ اپنے موضوع پر ان کی مضبوط گرفت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے، وہ لکھتے ہیں:''ان کے خیال میں بڑی شاعری کی سرحدیں فرقہ پرستی سے نہیں بلکہ انسانیت سے ملی ہوتی ہیں، اقبال پر فرقہ پرستی کا اتھام رکھنے والوں کی یہ تنگ نظری ہے کہ وہ

کسی شاعری کو جو ماورائی و آفاقی ہے کسی مخصوص خطے یا قوم کے لیے محدود کردینا چاہتے ہیں۔جس طرح انسانیت ایک عالم گیر حقیقت ہے، وہ کسی طبقے یا خطے میں محصور نہیں، اسی طرح وہی شاعری عظیم ہوسکتی ہے جو چین وعرب، دہلی واصفہان، سمرقند و بخارا، مصر وحجاز، فارس وشام اور کوفہ و بغداد کے حدود میں مقید نہ ہو۔ سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاقی۔'' (نفس مصدر)۔

آپ اوپر دی گئی چند مثالوں سے بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ انھوں نے لکھنے کے لیے بھی ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جو کسی نہ پہلو سے خاص اور قابل توجہ ہیں۔روایتی موضوعات سے ہٹ کر اہم موضوعات کا انتخاب وہی کرتا ہے جس کا علم وتحقیق سے حقیقی معنوں میں رشتہ ہو اور وہ ساتھ ہی کچھ مشکل پسند بھی ہو اور حق تحقیق ادا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔منور صاحب کے درج بالا مطبوعہ مضامین و مقالات بھی اس بات کے شاہد ہیں کہ ایک اسکالر کے طور سے ان میں یہ خصوصیات بھرپور طریقے سے موجود تھیں، اور اگر انھیں زندگی سے کچھ مزید مہلت عمل مل ہوتی تو شاید ہم ان سے منسوب ایک بڑے اور وقیع علمی ذخیرہ سے مستفید ہوتے۔ لیکن تقدیر کے آگے کس کی چلی ہے؟

بالآخر چراغ بجھ گیا

جب میں 1995 میں لکھنؤ یونیورسٹی میں تدریسی ذمہ داری پر فائز ہوا اور دلی سے لکھنؤ منتقل ہوگیا تو جہاں ایک طرف منور صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ تقریباً ختم ہوگیا وہیں طارق صاحب سے ملنے جلنے کا زیادہ موقع ملا جو یہاں برسوں تک جماعت اسلامی کے سکریٹری حلقہ تھے اور انتقال سے پہلے تک وہ یہ ذمہ داری بحسن وخوبی ادا کرتے رہے۔دوسری طرف منور حسین فلاحی ایس آئی او سے ریٹائرمنٹ کے بعد جماعت میں شامل ہوگئے، انھوں نے جامعۃ الفلاح سے فراغت کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی سند لے کر بالآخر اسی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں تدریسی خدمات ادا کی، یہاں بحیثیت لیکچرر (اسسٹنٹ پروفیسر) ان کا تقرر ہوا تھا اور انتقال کے وقت بھی وہ اسی پوزیشن پر تھے۔ جب میں دلی میں تھا تو ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ برابر قائم تھا لیکن جب میں لکھنؤ منتقل ہوگیا تو یہ سلسلہ تقریباً ختم ہوگیا، بعد میں ادارہ علوم القرآن کی میٹنگوں اور سیمیناروں میں شرکت اور بعض دوسری وجہوں سے علی گڑھ بارہا جانا ہوا مگر اب یہ علی گڑھ میرے اس مہربان بھائی کے بغیر تھا جسے قسام ازل نے بہت جلد اس دار فانی سے اپنے پاس بلا لیا اور ہم جیسے ساتھی جو ان کی دھیمی مسکراہٹوں کی روشنی اور ان کے حسن اخلاق کی دل کشی و دل آویزی پر

فدا تھے اور ان کے علم و قابلیت سے بہت کچھ آس لگائے بیٹھے تھے تڑپ کر رہ گئے۔ان کے پاس زمانے کو دینے کے لیے بہت کچھ تھا،وہ قوم کا قیمتی سرمایہ تھے،ان کی شخصیت میں بڑی روشنی تھی،ایسی چمک تھی جو کہیں بھی اندھیروں میں امید کی کرن بن سکتی تھی لیکن وہ تو بجلی کی طرح چمک کر ہماری نظروں سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئے اور ۱۸ر ستمبر ۲۰۰۰ء کو ہمارا ایک اور روشن چراغ بجھ گیا۔یہی زندگی ہے اور اس کے عناصر ترکیبی کی یہی حقیقت ہے۔دعا ہے وہ جہاں بھی ہوں رحمت ایزدی ان کی روح پر ہر آن سایہ فگن رہے۔

''اسلامی ادب، اسلامی عقیدۂ توحید سے کسب فیض کرتا ہے۔اس لیے اس کا بنیادی فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس توحیدی شعور کو تقویت پہنچائے۔یہ وہ ادب ہے جو ایک مسلمان کے تصور کائنات کے زیر اثر وجود پاتا ہے۔اس لیے جو ادب بھی اس تصور کائنات سے متصادم ہوگا وہ اسلامی ادب نہیں ہوسکتا۔اسلامی ادب مسلمان کی اخلاقی قدروں اور روحانی شخصیت کو جلا بخشتا ہے۔تحسین وقدر شناسی اس ادب کا مقصد نہیں ہوتا بلکہ وہ تدبر وتفکر کے عناصر بھی اپنے دامن میں رکھتا ہے۔یہ سفلی جذبات کو اپیل نہیں کرتا بلکہ انسان کی بلندترین روحانی منزل کی تسکین کا سامان کرتا ہے۔یہ ادب اسلامی بصیرت کی روشنی میں عصر حاضر کے مسائل کی ترجمانی کرتا ہے اور اس غرض کے لیے ہر عہد میں رائج نئی ادبی ہیئتوں کو استعمال کرتا ہے۔اس کا میدان کائنات کی طرح وسیع ہے۔یہ ادب اس دنیا کے علاوہ آخرت کی زندگی سے بھی بحث کرتا ہے۔مختصر یہ کہ یہ ادب ہر زمانہ اور ہر مقام کے لیے خدائی تصورات پر مبنی ادب ہے۔''

(مترجم: **ڈاکٹر منور حسین فلاحی**،سہ ماہی 'اسلامک اسٹڈیز' اسلام آباد جلد ۳۱،شمارہ ۴)

کل من علیھا فان

خالد حیدر

بیس برس، جی ہاں بیس برس سے زاید کا عرصہ گزر چکا ہے جب ہم سب نے منور بھائی مرحوم کے جسد خاکی کو علی گڑھ سے ان کے وطن عزیز پیر الطیف یعنی بہار کے ضلع کھگڑیا روانہ کیا تھا۔ اور یہ جان لیا تھا کہ وہ اب کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ منور بھائی لوٹ کر تو نہیں آئے نہ آ سکتے تھے کہ دار فانی سے کوچ کے بعد کون لوٹ سکا ہے، لیکن وہ ہماری بزم خیال میں بار بار آتے رہے اور آج بھی آتے ہیں۔ ان کی یہی آمد ان سطروں کے ضبط تحریر میں آنے کا سبب ہیں۔

دسمبر ۱۹۸۸ء میں میرا داخلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بحیثیت پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر ہوا۔ اس وقت یونیورسٹی میں ریسرچ میں داخلے کچھ لوگوں کے براہ راست پی ایچ ڈی میں ہوتے تھے اور کچھ کے صرف ایم فل میں، لیکن ایم فل کا کورس اور مقالہ سب کے لیے لازم تھا۔ کسی سبب سے ہم لوگوں سے قبل کا جو بیچ تھا اس کی ایم فل کی کلاسز نہیں ہوئی تھیں اس لیے دو مشترکہ بیچ کی کلاسیز ساتھ ساتھ ہوئیں اور اسی وجہ سے میری قربت جاوید بھائی سے ہوئی۔ منور بھائی ان سے بھی سینئر تھے۔ منور بھائی سے میری پہلی ملاقات کب اور کس کے توسط سے ہوئی، مجھے یاد نہیں ممکن ہے کہ جاوید بھائی نے تعارف کرایا ہو، منور بھائی مرحوم علی گڑھ کے سینئر جونیر کے روایتی پیمانے سے الگ، اپنے پیمانے رکھتے تھے اس لیے یہ تعارف محض تعارف ہی رہا۔

۱۹۸۹ء کے اواخر میں مولانا آزاد پر جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس نے اس تعارف کو قربت میں تو تبدیل کیا لیکن بے تکلفی کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوسکتا تھا۔ ۱۹۹۰ء میں پروفیسر منظر عباس نقوی کی صدارت کے آغاز میں ہی شعبہ میں صیغۂ تحقیق (Research Division) کا قیام عمل میں آیا۔ منظر عباس صاحب منور بھائی کے سپروائزر تھے، ممکن ہے کہ ان کی کچھ ہدایت خاص ہو، اب منور بھائی مرحوم مولانا آزاد لائبریری کے اردو سیکشن کے علاوہ ریسرچ ڈویژن میں بھی تشریف فرما ہوتے اور اپنے مطالعے کے انہماک سے صیغۂ تحقیق کی بے تکلف فضا کو ایک مخصوص سنجیدگی میں تبدیل کر دیتے۔

صیغۂ تحقیق کے قیام سے تمام ریسرچ اسکالرس کو نہ صرف یکجا ہونے کا موقع ملا بلکہ ان میں اجتماعیت کا احساس بھی پیدا ہوا۔ اس سے قبل ریسرچ اسکالرس کا تعلق اپنے اپنے نگران کار سے تھا وہ ان کی اجازت سے ان کے ہی کمرے میں بیٹھتے، کبھی کبھی سیمینار لائبریری میں جگہ مل گئی تو وہاں بھی ایک آدھ گھنٹہ ہی کی نشست ممکن تھی کہ ایم اے کی کلاسز کے لڑکے لڑکیوں کے آنے جانے کا سلسلہ رہتا۔ عام طور پر صرف ایسی کتابوں کے مطالعہ کے لیے بیٹھنا پڑتا جن کے سمینار سے لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ ریسرچ ڈویژن میں خاص طرح کی میزیں آئی تھیں جن میں ان میزوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور اس پر چار اسکالرس یکسوئی کے ساتھ کام کر سکتے تھے۔ لاکرس کا انتظام بھی تھا، جن میں لائبریری اور سمینار سے اجراء کی گئی کتابوں کے علاوہ ذاتی کتابیں بھی رکھی جا سکتی تھیں۔ اس طرح طلبا سنجیدگی کے ساتھ بیٹھ کر اپنے وقت کا مثبت استعمال کر سکتے تھے۔ صیغۂ تحقیق کی الماریوں میں بھی کتابوں کا خاصہ ذخیرہ تھا، جس کی ترتیب و اجرا کی ذمہ داری محترمہ نسرین پر تھی۔

ریسرچ اسکالرس کے لیے اس انتظام کے بعد بھی یہ ممکن نہ تھا کہ تمام لوگوں کو بیٹھنے کی جگہ مل جائے۔ تمام ریسرچ اسکالرس مستقل بیٹھتے بھی نہ تھے۔ اشاریہ سازی والے اکثر ریسرچ اسکالرس لائبریری میں ہی ہوتے پھر بھی ریسرچ ڈویژن سے مستقل استفادہ کرنے والے لوگوں میں منور بھائی مرحوم کے علاوہ راقم الحروف، امتیاز احمد، مہتاب عزیز رزاقی، جاوید اختر (جاوید بھائی اور جاوید اختر ایک ہی نام ہیں۔ اس وقت دہلی میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔)، جمال اویسی، نثار احمد، پروین جہاں، حنا کمال، پروین اقبال، محمد نعمت، سید ظفر امام، عبدالرشید صدیقی، شگفتہ جبیں، رخسانہ عابدی، شمشاد احمد انصاری، عبدالمعبود عثمانی، شیریں ناز، عثمانہ ناہید، نوشاد عالم وغیرہ کے نام شمار کیے جا سکتے ہیں۔

شعبہ میں 'ریسرچ ایسوسی ایشن' کے نام سے ریسرچ اسکالرس کی ایک انجمن قائم تھی جس کے جلسے سال میں دو تین بار ہو جاتے، جن میں ریسرچ اسکالرس اپنی تحریریں پیش کرتے جو عموماً ان کے موضوع سے تعلق رکھتی تھیں، منور بھائی، جاوید بھائی، امتیاز احمد وغیرہ اور راقم کو ایسوسی ایشن کی اتنی محدود سرگرمیاں ناکافی معلوم ہوئیں تو ہم لوگوں نے ایک تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا کہ جس کی میٹنگز تواتر کے ساتھ ہو سکیں۔

ہم لوگوں نے آپس میں تبادلۂ خیال کر کے اس کا دستور بنایا اس کے اصول وضوابط مرتب کیے، اس کا دائرہ کار متعین کیا اور پھر اس تنظیم کا قیام عمل میں آیا، جس کا نام ''انجمن اردو ریسرچ اسکالرس'' رکھا گیا۔ منور بھائی مرحوم کو اس کا صدر بنایا گیا۔ جاوید بھائی اس کے سکریٹری اور مجھے نائب صدر کی ذمہ داری دی گئی۔ ایک عہدہ خازن کا تھا جسے معتمد برائے اطلاعات کی ذمہ داری بھی ادا کرنی تھی۔ اس کی ذمہ داری برادرم امتیاز

کل من علیہا فان

احمد کو سونپی گئی۔

طلبہ کی یونین کے لیے لنگدوہ کمیٹی کی سفارشات تو ۲۰۰۵ء کے بعد کی بات ہے ہم لوگوں نے انجمن کے صدر اور سکریٹری کے عہدوں کے لیے ان شرائط کو لازمی قرار دیا کہ وہ ایم فل کر چکا ہو اور اس نے اپنا کام وقت پر مکمل کیا ہو، اس کا کوئی مضمون Back log نہ ہوا ہو، اس کی حاضری بھی کم نہ ہوئی ہو اور اس میں قیادت کی صلاحیت ہو۔

اس انجمن کی کارکردگی کی تفصیلات بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں لیکن تنظیم نے تحقیق کے کام کے سلسلے میں جو دائرہ کار متعین کیا تھا، اس کے چند نکات کے بیان سے منور بھائی اور ان کے رفقاء کی افتادِ طبع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۱) موضوع سے متعلق مواد کی فراہمی کے مسائل کا حل۔

(۲) اگر کسی موضوع پر مواد ناکافی ہو یا بالکل نہ ہو، اس مسئلے کا حل۔

(۳) کسی موضوع کی وسعت کے سبب اس کا احاطہ ممکن نہ ہو، تو اس کا حل۔

(۴) مواد کے لیے اگر ریسرچ اسکالر کو کسی سفر پر جانا ہو اس سے متعلق مسائل کا حل، مثلاً رعایتی ٹکٹ کا حصول، اس شہر میں قیام وطعام کے مسائل کا حل، خاتون ریسرچ اسکالر ہو تو ان کے لیے گروپ کا قیام تاکہ ان کو تنہا سفر نہ کرنا پڑے وغیرہ اور مقامی سطح پر جو مسائل تھے وہ سب اس تنظیم کے دائرہ کار میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ ادبی سرگرمیوں کا معقول نظم تو تھا ہی۔

لیکن جیسا کہ ہماری جذباتی قوم کی حالت ہے، یہ تنظیم بھی اس کا شکار رہوئی۔ اس وقت شعبۂ اردو میں ریسرچ میں داخلے دو سطح پر ہوتے تھے۔ ایک تو براہ راست پی ایچ ڈی میں اور ایم فل کے لیے بعد میں ان کا موضوع متعین کیا جاتا۔ دوسرے صرف ایم فل میں اور پھر ایم فل کی کارکردگی کی بنیاد پر بعد میں پی ایچ ڈی میں داخلہ ہوتا۔ ایسے ریسرچ اسکالرس یقینی طور پر ایک احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہوں گے اور چوں کہ اس تنظیم میں ان لوگوں کی نمائندگی نہ تھی تو ایسے ہی عناصر نے اس تنظیم کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ صرف لڑکیوں کو متاثر کرنے کے لیے بنائی گئی ہے چوں کہ لڑکیوں کی تعداد اس دور میں بھی کافی تھی اور ان میں سے اکثر سنجیدگی سے کام کرنا چاہتی تھیں، اس لیے فطری طور پر یہ تنظیم ان کے لیے مفید تھی لیکن راقم الحروف کو اس قسم کی لغو باتوں کی برداشت نہ تھی۔ اس لیے تنظیم سے ۶ / اگست ۱۹۹۱ء کو استعفیٰ دے دیا۔ منور بھائی جو اس وقت کم

از کم تین بچوں کے والد تھے، اور جو، ان کا مزاج تھا اس نے ان کو بھی بددل کیا اور اس طرح بہت جلد یہ تنظیم غیر فعال ہوگئی البتہ اس تنظیم کی بدولت جو قربت تنظیم کے عہدے داروں اور ایکزیکیٹو ممبروں کے درمیان ہوئی وہ باقی رہی اور بہت حد تک آج بھی باقی ہے۔ ہم لوگوں کو اپنے موضوع پر مواد کی تلاش کرتے ہوئے اگر اپنے رفقاء کے موضوع سے متعلق کوئی چیز نظر آتی تو ہم اس کی نشاندہی کر کے ایک دوسرے کے لیے سہولت فراہم کرتے۔

میرا خیال ہے کہ منور بھائی نے ۱۹۹۳ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے تمام مراحل طے کر لیے۔ اس لیے کہ شعبۂ اردو کے ترجمان ''رفتار'' کے ۱۹۹۴ء کے شمارے میں اس برس ڈگری حاصل کرنے والوں میں منور بھائی کا نام بھی شامل ہے۔ دسمبر ۱۹۹۴ء میں شعبہ کی لوکل سلیکشن کمیٹی ہوئی، جس میں شرف النہار بیگم، امتیاز احمد اور محمد علی جوہر کے ساتھ ساتھ منور بھائی کی تقرری خود ان کے نگراں منظر عباس نقوی کی سبکدوشی سے خالی ہوئی جگہ پر کی گئی۔ منور بھائی کی تقرری پر بہت سے لوگوں کو حیرت بھی ہوئی کہ اس وقت شعبہ کے سربراہ پروفیسر نعیم احمد تھے جو کمیونسٹ پارٹی کے کارڈ ہولڈر تھے۔ اس تقرری میں جہاں منور بھائی مرحوم کی صلاحیتوں کا دخل تھا وہیں نعیم صاحب کے اصولوں کا بھی، نعیم صاحب اس وقت آرٹس فیکلٹی کے ڈین بھی تھے لیکن نعیم صاحب کے علاوہ یونیورسٹی کے کسی ورکنگ پروفیسر کو لائین میں لگ کر اپنے ٹیلی فون کا بل جمع کرتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا۔

ہمارے شعبہ کی روایت ہے کہ نئی تقرریاں جب عمل میں آتی ہیں تو نومنتخب استاد کو لازمی اردو کے نصابات پڑھانے کے لیے دیے جاتے ہیں جو یونیورسٹی کی پانچ غیر پیشہ ورفیکلٹیز کے گریجویشن سال اول کے طلبہ کو پڑھنا ہوتا ہے لیکن شعبہ کے سینئر اساتذہ نے منور بھائی مرحوم کی صلاحیتوں کا اس طرح اعتراف کیا کہ انھیں سبسڈیری اردو کا کورس U-104 اردو نظم ۱۹۲۰ء تک (سوشل سائنس گروپ) تدریس کے لیے دیا گیا، جسے بورڈ آف اسٹڈیز نے جناب الطاف حسین ندوی کے لیے مختص کیا تھا۔ یہ پرچہ منور بھائی کے پاس (سوائے ۱۹۹۹ء کے جب یہ ڈاکٹر اسعد بدایونی کو دیا گیا تھا) ان کی حیات تک رہا۔

فروری ۱۹۹۷ء کی جنرل سلیکشن کمیٹی تک کئی لوکل سلیکشن کمیٹیاں ہوئیں، جن میں نئے نئے اساتذہ کی تقرریاں ہوتی رہیں لیکن یہ چاروں اساتذہ اپنی جگہ برقرار رہے۔ نعیم صاحب کے اچانک انتقال کے بعد پروفیسر شہریار چند مہینوں کے لیے صدر شعبہ ہوئے، اس دور میں بھی یہ تقرری اپنی جگہ رہی بلکہ نعیم صاحب کا انتقال ہی دراصل تقرری کے فوراً بعد برین ہیمبرج سے ہوا تھا۔ مسلم یونیورسٹی سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ

عارضی تقرریاں ایک سال کے لیے ہوتی ہیں اوران کی تجدید ہوتی رہتی ہے، جون ۱۹۹۶ء میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی صدر شعبہ ہوئے، دسمبر ۱۹۹۶ء کی سلیکشن کمیٹی سے پہلے ان چاروں کے علاوہ جو اساتذہ اب تک شعبہ میں داخل ہو چکے تھے ان میں مہتاب حیدر نقوی، ڈاکٹر شہاب الدین، اشفاق احمد عارفی اور نثار احمد کا نام بھی تھا۔ اس سلیکشن کمیٹی میں ان لوگوں کے علاوہ میرا نام بھی شامل ہو گیا۔ میں نے شعبہ میں ۵؍فروری ۱۹۹۷ء کو جوائن کیا تھا کہ ایک ہفتہ بعد جنرل سلیکشن کمیٹی کا اعلان ہو گیا جو ۲۲؍فروری کو ہوئی تھی۔ جنرل سلیکشن کمیٹی کا مطلب ملازمت کا مستقل ہو جانا ہے یا اس کا ختم ہو جانا ہے، اس اعلان سے ممکن ہو کچھ لوگ خوش ہوئے ہوں جو دو تین برس سے پڑھا رہے تھے لیکن مجھے بہت گھبراہٹ تھی کیوں کہ عارضی تقرری میں' میں نو وارد تھا اور چوں کہ لکچرر کی صرف دو جگہیں تھیں اس لیے میرے لیے بظاہر کوئی امکان نہ تھا۔ صدر شعبہ اگر چہ میرے سپروائزر تھے لیکن انھوں نے جنرل سلیکشن کمیٹی ہونے والی ہے، اس کی طرف ذرا سا اشارہ بھی نہیں کیا تھا، میرے علاوہ بہت زیادہ پریشان ہونے والوں میں منور بھائی مرحوم بھی تھے۔

عارضی تقرری کے بعد انھوں نے اپنے اہل وعیال کو علی گڑھ بلالیا تھا، ان کے پانچ بچوں میں دو بیٹیاں بڑی تھیں۔ اس کے بعد صاحبزدے معظم اور چھوٹی بیٹی کا داخلہ انھوں نے تعمیر ملت اسکول میں کروادیا تھا۔ منور بھائی کا قیام ان دنوں ادارۂ تحقیقات اسلامی کے احاطہ میں ایک کنارے پر بنی عمارت میں تھا جس کے ایک حصے میں لائبریری تھی جس میں کتابیں بھری تھیں، یہ عمارت اب بھی اسی طرح ہے، زینہ چڑھتے ہی برآمدے کے بائیں جانب ایک چھوٹا کمرہ جو ہمارے وطن میں بیٹھک کہا جاتا ہے۔ جدید زمانہ میں جسے ڈرائنگ روم کہتے ہیں لیکن اس ڈرائنگ روم میں ایک تخت اور میز کے علاوہ ایک دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جہاں منور بھائی مرحوم آنے والے مہمانوں کی میز بانی کیا کرتے تھے اور شاید ہی کوئی ایسا ہوتا ہو جس کو وہ بہ اصرار چائے نہ پلاتے ہوں اور چائے صرف چائے نہ ہوتی کچھ نہ کچھ لوازمات ضرور ہوتے۔

ایسے کثیر العیال اور مہمان نواز شخص کی اس وقت کی ذہنی کیفیت کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو خود بھی ایسی صورت حال سے گزرے ہوں جب ملازمت سے برطرف ہو جانے کا خدشہ لاحق ہو اور بظاہر کوئی سرپرستی کرنے والا نظر نہ آتا ہو۔ میرا قیام اس وقت اپنے بزرگ دوست ڈاکٹر سید ظفر امام کے ساتھ تھا، جنھوں نے شمشاد کے بنگالی کوٹھی میں ایک مکان ''رحمان منزل'' کرایہ پر لے رکھا تھا۔

۲۲؍فروری کو عصر کے وقت تک میں بیحد بے چین تھا لیکن بعد نماز عصر وہ تمام اضطراب سکون میں

تبدیل ہوگیا تھا۔ انٹرویو میں میرا نمبر مغرب کے بعد آیا، وہاں سے نکل کر ظفر بھائی کے ساتھ میں نے ہوٹل میں کھانا کھایا، عشاء کی نماز پڑھی اور سوگیا، اس لیے کہ مجھے اپنی تقرری کے ہونے کا ذرا بھی گمان نہ تھا اس لیے کہ میں عارضی ملازمت میں سب سے جونیر تھا۔ منور بھائی کا انٹرویو میرے بعد ہونے والا تھا کب، مجھے یاد نہیں کل باون یا ترپن امیدوار تھے اور جگہیں صرف دو۔ دوسری صبح تقریباً آٹھ ساڑھے آٹھ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ منور بھائی تھے اندر داخل ہوتے ہی انھوں نے سوال کیا کچھ معلوم ہوا میں نے انھیں بتادیا کہ میں تو آکر سورہا نہ کسی سے دریافت کیا نہ کوئی یہاں آیا۔ تب انھوں نے بتایا کہ ''سنا ہے کہ آپ کا سلیکشن ہوگیا ہے۔'' میرے یہ پوچھنے پر کہ اور کس کس کا ہوا تو انھوں نے جواب دیا کہ'' آپ کے ساتھ ساتھ میرا بھی ہوگیا ہے۔'' میں نے انھیں رسماً مبارکباد دی اس لیے کہ مجھے کم از کم اپنے بارے میں تو بالکل یقین نہ تھا کہ یہ خبر درست ہے۔ منور بھائی کو یہ خبر جہاں سے بھی ملی ہو وہ مجھ سے اس کی تصدیق کے لیے اس لیے آئے تھے کہ میرے سپروائزر صدر شعبہ تھے۔ لیکن میں ان کے پاس گیا نہیں گیا تھا۔ نہ جانے کا سبب یہی تھا کہ مجھے کوئی توقع نہ تھی کہ جس شخص نے یہاں صرف ریسرچ کی ہو اس کے لیے شعبہ میں کوئی امکان ہے، میں نے اس کا تصور بھی نہ کیا تھا۔ حالاں کہ ہمارے ہی ساتھ سید سراج الدین اجملی کی تقرری بھی عمل میں آئی، جنھوں نے کوئی ڈگری یہاں سے حاصل نہ کی تھی۔ منور بھائی اس کے بعد رکے نہیں فوراً چلے گئے ممکن ہے وہ صدر شعبہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی کے پاس گئے ہوں، جو ہیں جیل روڈ پر واقع اپنے مکان میں رہتے تھے۔ ظفر بھائی اور میں اس کے بعد تیار ہو کر نکلے اور جب ہم دونوں کبیر کے ہوٹل پر ناشتہ کر رہے تھے تو مہتاب حیدر نقوی صاحب کا اسکوٹر آکر رکا اور انھوں نے اترتے ہی گلے لگالیا تو اب منور بھائی کی لائی ہوئی اس خبر پر مجھے یقین ہوا اور پھر ہم لوگ جلدی جلدی چائے پی کر استاذی ابوالکلام قاسمی صاحب کے گھر پر حاضر ہوئے۔ منور بھائی جا چکے تھے، استاذ نے سرزنش بھی کی کہ 'تم کہاں غائب ہوگئے تھے؟' میں ان سے کیا کہتا خاموش رہا۔ مہتاب نقوی صاحب بتا چکے تھے کہ ان کے علاوہ شہاب الدین صاحب، امتیاز احمد، منور حسین صاحب، سراج اجملی اور میری تقرری ہوئی ہے۔ میں اس معمہ کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکا جب تک ہم لوگوں کا آرڈر نہ آگیا، جو اسی دن آگیا تھا۔ شعبہ میں دو جگہیں خالی تھیں، ان پر ڈاکٹر شہاب الدین صاحب اور مہتاب حیدر نقوی صاحب کی تقرری ہوئی تھی اور جن لکچررس کی بطور ریڈر ترقی ہوئی تھی ان کی جگہ پر ہم لوگوں کی عارضی تقرری ہوئی تھی۔ منور بھائی کی تقرری قاضی افضال حسین صاحب کی خالی جگہ پر ہوئی تھی جو پروفیسر بنائے گئے تھے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ شعبہ کے نئے اساتذہ کو عام طور سے لازمی اردو کے کورسیز پڑھانے کے لیے دیے جاتے تھے اور ایم اے کی کلاسیز بھی پانچ سال کی تدریس کے تجربہ کے بعد دی جاتی تھیں، لیکن منور بھائی کی صلاحیتوں کے ہمارے اساتذہ جس طرح معترف تھے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنرل سلیکشن کمیٹی کے بعد اگلے سیشن کے لیے منور بھائی مرحوم کو ایم اے کا ایک کورس U-405 یعنی اولڈ ٹیکسٹ دیا گیا جو ایک مشکل پرچہ سمجھا جاتا تھا، جس میں دکنی اردو کے متون کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ اس سال انھیں بی اے فائنل کا ایک پرچہ UR-304 بھی دیا گیا، جس کا عنوان تھا Introduction to urdu Criticism جسے اس سے پہلے پرفیسر ابوالکلام قاسمی پڑھاتے تھے لیکن اگلے سال یہ پرچہ امتیاز احمد صاحب کو دیا گیا اور منور بھائی مرحوم کو UR-303 یعنی History of Languge and Literature دیا گیا، ان پرچوں کی تدریس سے وہ اپنی زندگی کے خاتمہ تک وابستہ رہے۔ ۹۹-۲۰۰۰ء کے سیشن میں انھیں Elementry Urdu A کا ممتحن بھی بنایا گیا تھا۔

عام طور پر نئے صدر شعبہ اپنی پسند کے مطابق اساتذہ کو شعبے کے مختلف کاموں کی ذمہ داری سونپتے ہیں۔ قاسمی صاحب نے منور بھائی کو شعبہ کے ترجمان 'رفتار' کی ادارت کی ذمہ داری سونپی اور انھوں نے اس کے دو شمارے ۹۷-۹۶ اور ۹۹-۹۸ نکالے، ان شماروں کے مشمولات کو ایک نظر دیکھنے سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر منور حسین کتنے سلیقہ اور محنت سے کام کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ جنوری ۱۹۹۷ء میں شعبہ کے جدید اردو نظم سمینار کی چوبیس صفحات کی رپورٹ اس طرح انھوں نے تیار کی کہ ایک ایک اجلاس کے مقالات، ان پر ہونے والے تمام مباحث کو سمیٹ کر اس طرح پیش کیا ہے کہ اس رپورٹ کا قاری خود کو اس سمینار کا حصہ محسوس کرنے لگے۔ ایک سو گیارہ صفحات کے اس پرچہ میں نصف سے زائد منور بھائی کی تحریروں پر ہی مبنی ہے۔ تقریباً یہی صورت اگلے شمارے ۹۹-۱۹۹۸ء کی ہے۔ حالانکہ بعض وجوہ سے یہ پرچہ مختصر ہو گیا لیکن اس میں بھی تقریباً نصف صفحات منور بھائی کی تحریروں پر مبنی ہیں۔ منور بھائی ان شماروں سے پہلے ۹۶-۹۵ کے شمارے کے لیے بھی جس کے مرتب ڈاکٹر صغیر افراہیم تھے، رشید احمد صدیقی اور اردو طنز و مزاح سمینار کی تفصیلی رپورٹ تیار کر چکے تھے۔ یہی سبب ہے کہ صدر شعبہ نے انھیں رفتار کی ذمہ داری ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء کی بھی سونپی تھی۔ لیکن پہلے بیماری اور پھر وفات سے یہ سلسلہ ترک ہو گیا اور پھر کافی تاخیر سے ۲۰۰۲ء میں شہاب الدین صاحب کی ادارت میں رفتار کا اگلا شمارہ شائع ہو سکا۔

شعبہ میں تقرری کے بعد منور بھائی مرحوم سے تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی تھی، مارچ-اپریل ۱۹۹۸ء میں؛ میں دھوہرّا کے ایک مکان میں بطور کرایہ دار منتقل ہوگیا۔ جو منور بھائی مرحوم کی قیام گاہ سے تقریباً نصف کلو میٹر سے بھی کم دوری پر تھا۔ ادارہ تحقیق کی دیوار سے لگی ہوئی نبی نگر کی مسجد تھی لیکن منور بھائی اکثر نمازیں مرکزی مسجد میں پڑھا کرتے تھے۔ میرے مکان سے مرکزی مسجد اور مسجد حفصہ جس کا نام اس وقت اس مسجد کے منتظمین نے مسجد اقصیٰ رکھا تھا، ان منتظمین میں سے ایک صاحب محمد عالم صاحب تھے جو وسیع کمپاؤنڈ میں قیام پذیر تھے اور منور بھائی کے علاقے کے رہنے والے تھے، غالباً انھیں کے توسط سے منور بھائی اس مسجد کے منتظمین کے رابطے میں آئے ہوں گے۔ منتظمین میں تو اور لوگ بھی ہوں گے لیکن عالم صاحب کے علاوہ رفیق صاحب فعال تھے جو جواہر لال نہرو میڈیکل کالج کے سرجری لیب کے انچارج تھے۔ اب تو یہ دونوں بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ میں بھی ان لوگوں کے رابطے میں منور بھائی کی وجہ سے آیا۔ ہم دونوں اس پر متفق تھے کہ مسجد اقصیٰ تو ایک ہی ہوسکتی ہے، لہٰذا اس کے نتیجے میں یہ مسجد آج مسجد حفصہ کہی جاتی ہے۔ مسجد کی تعمیر کے لیے ہم لوگوں نے بعض سربرآوردہ افراد سے ملاقاتیں کی ان میں ایک نام پروفیسر عضدالدین صاحب کا یاد ہے۔ منور بھائی اس مسجد میں جمعہ کے اعزازی خطیب اور امام بھی تھے۔ جہاں امامت میں ان کے چھوٹے صاحبزادے اعظم بھی شریک ہوتے وہ کسی طرح ان کو چھوڑتا نہ تھا بہت سمجھانے پر اگر ایک کنارے بیٹھ بھی جاتا تو دوران نماز وہ پھر منور بھائی کے برابر پہنچ جاتا۔ کچھ لوگ معترض بھی ہوتے لیکن اکثر مصلی حضرات اس کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر لیتے۔

۱۹۹۹ء کے آغاز میں ہماری اہلیہ اور نوزائیدہ بچی بھی وطن سے آگئیں تو منور بھائی مرحوم اور ان کی اہلیہ نے آکر ملاقات کی اور پھر ہم لوگوں کی پرتکلف دعوت بھی کی۔ میری دادی اور والد محترم جب تشریف لائے تو منور بھائی ان سے بھی ملنے آئے اور جب میرے والد نے ان کے علاقے کا نام کھگڑیا سن کر ان کو یہ بتایا کہ دراصل وہ ''خاک گریہ'' ہے تو وہ حیرت زدہ ہوئے کہ انھوں نے یہ سنا نہ تھا اور نہ اس پر کبھی غور کیا تھا۔

شعبہ کی رفاقت کے ساتھ ساتھ اکثر عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت منور بھائی مرحوم کے ساتھ گزرتا وہ تو کبھی کبھی ہمارے یہاں آتے لیکن میں تقریباً روزانہ ہی ان کے یہاں جایا کرتا اور عام طور پر ہم لوگوں کے درمیان مسلمانوں کی عمومی صورت حال پر ہی گفتگو ہوتی، دوسروں کی ذات اور شخصیت خال خال ہی گفتگو کا موضوع بنتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار مرکزی مسجد میں بعد نماز فجر، فرض کے بعد ایک صاحب کے سنت پڑھنے

پر مصلیوں میں سے ایک بزرگ جو پروفیسر بھی تھے، معترض ہوئے تو منور بھائی مرحوم نے ان صاحب کی حمایت کی جو سنت پڑھ رہے تھے۔ پروفیسر صاحب نے منور بھائی مرحوم کو ڈانٹ کر چپ کرادیا کہ ''آپ کیا جانیں کیا آپ عالم دین ہیں؟'' اور منور بھائی خاموش ہوگئے۔ پروفیسر صاحب ان کو صرف اردو کے استاد کی حیثیت سے جانتے تھے لیکن منور بھائی مرحوم کا یہ انکسار کے وہ خاموش ہوگئے اور کچھ بھی ظاہر نہ کیا۔

وہ گرمی کی چھٹیوں کے بعد جب وطن سے واپس آتے، شعبہ کے اکثر ہم عمر اساتذہ اور دیگر حضرات کو اپنے گھر مدعو کرتے اور گھر سے لائی ہوئی مختلف اشیا بہ اصرار کھلا کر خوش ہوتے ان کے گھر کے دیسی گھی کے بنے ہوئے گلاب جامنوں کا ذائقہ میں تو نہیں بھولا اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے دیگر ساتھیوں کے ذہن میں بھی یہ ذائقہ محفوظ ہوگا۔

۱۹۹۹ء کی گرمیوں کی چھٹی کے بعد جب وہ واپس آئے تو ملنے پہنچا تو ان کے ایک پیر میں پلاسٹر لگا ہوا تھا۔ استفسار سے معلوم ہوا کہ گاؤں میں کچھ لوگوں کے درمیان لڑائی ہورہی تھی، وہ بیچ بچاؤ کے لیے گئے تو ایک شخص ان کے پاؤں پر گر گیا، جس سے ان کے پاؤں کی ہڈی ٹخنوں کے پاس سے ٹوٹ گئی ہے۔ میں نے یہ پیش کش کی کہ میں آپ کو روزانہ اپنے اسکوٹر سے شعبے لے جایا کروں گا اور پھر واپس لے آیا کروں گا۔ انھوں نے تھوڑے سے تامل کے ساتھ اس کو قبول کرلیا اس لیے کہ مجھے اس کے لیے کوئی اضافی دوری طے نہیں کرنی تھی اس طرح پلاسٹر تک اور کچھ اس کے بعد تک بھی یہ معمول رہا اور اس کے علاوہ ان کو کہیں جانا ہوتا تو وہ رکشا سے چلے جایا کرتے تھے، مجھے نہیں بتایا کرتے۔ منور بھائی کے پیروں کی ہڈی تو جڑ گئی لیکن اس دوران معذوری کے احساس نے ان کو ذہنی مریض بنا دیا۔ اس وقت ادارہ تحقیقات اسلامی کی چہار دیواری نامکمل تھی اور جو تھی وہ بھی مختلف جگہوں سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ پڑوس کی آبادی میں جس طرح کے افراد بستے تھے اس کی وجہ سے وہ خوف کی نفسیات میں مبتلا ہوگئے اور کسی طرح ہم لوگ ان کو مطمئن نہیں کر پائے یہاں تک کہ ہم لوگوں نے ان کا نفسیاتی علاج کرنے کی بھی کوشش کی۔

ہمارے رفیق کار سید سراج الدین اجملی صاحب کا تعلق دائرہ شاہ اجمل الہ آباد سے ہے، ان کے چھوٹے بھائی قمر اجملی صاحب ان دنوں تشریف لائے ہوئے تھے، اس زمانہ میں یہاں پی اے سی کے ایک کمانڈنٹ تھے، جناب وجے کمار ان کی دلچسپی صوفیہ اور تاریخ سے تھی، اس سلسلے میں وہ دائرہ شاہ اجمل کے رابطہ میں آئے تو قمر میاں کی وہ بڑی عزت کرتے تھے۔ میں نے قمر میاں کے ہمراہ ان کی سرکاری رہائش گاہ پر

ان سے ملاقات کی اور قمر میاں نے ان کو صورت حال بتا کر یہ گذارش کی کہ وہ ایک جیپ میں چند سپاہیوں کو بھیج دیں اور یہ لوگ کبھی کبھی آ کر ان سے ملاقات کر لیا کریں تاکہ انھیں یہ اطمینان ہو کہ وہ غیر محفوظ نہیں ہیں اور محلے کے لوگ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کمانڈنٹ صاحب نے حسب خواہش اس کا انتظام کر بھی دیا اور ایک حوالدار خاں صاحب تو کئی بار حاضر ہوئے لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا پھر ان کو شعبہ نفسیات کے معالج ڈاکٹر ابو قمر صدیقی کو دکھایا گیا تو دواؤں سے ان کی حالت بہتر بھی ہوئی۔ گرمی کی چھٹیوں میں جب وہ گھر گئے تو وہاں ان کے اعزا نے رانچی کے ماہرین نفسیات سے مشورے کیے۔ بہر حال وہ جب واپس آئے تو بالکل ٹھیک ہو چکے تھے۔

میرے والد اور دادی کے ضعف کی وجہ سے اوپر کے مکان میں مجھے دشواری ہو رہی تھی تو میں ایک دوسرے مکان کی تلاش میں تھا۔ اپریل ۲۰۰۰ء میں، میں نگلہ روڈ دودھ پور کے ایک مکان میں منتقل ہو گیا اس طرح گھر پر روزانہ ملاقات کا یہ سلسلہ ترک ہو گیا لیکن شعبہ میں ملاقات تو ہوتی ہی تھی۔ ان کے ایک عزیز نہال الدین جو اس وقت یہاں طالب علم تھے، انھوں نے ان کی نگہداشت کے لیے غالباً ادارہ کی دوسری عمارت میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے منور بھائی کو کبھی اونچی آواز میں بات کرتے نہیں سنا ان کی اونچی آواز بھی میری روزمرہ کی آواز سے اونچی نہ ہوتی۔ انھیں کیسی بھی پُر لطف بات ہو منھ کھول کر ہنستے نہیں دیکھا، میں ان سے بہ اعتبار عمر بھی چھوٹا تھا لیکن انھوں نے کبھی میرا نام صاحب کے لاحقے کے بغیر نہیں لیا۔ کسی کی شکایت نہیں کرتے تھے۔ البتہ جب وہ اپنی زندگی کی آخری گرمی کی چھٹیوں کے بعد واپس آئے تو ممکن ہے کہ اپنی صحت کی وجہ سے انھوں نے صدر شعبہ سے کوئی بات کہی ہو، جس کو انھوں نے قبول نہ کیا ہو، تو کئی بار ایسا ہوا کہ جب اسٹاف روم سے اٹھ کر ان کے کمرے میں ان کی رفاقت میں چائے نوشی کے لیے جاتا تو وہ کہتے کہ ''آپ کے صدر شعبہ تو بورڈ آف اسٹڈیز کی تحریر کو وحی الٰہی سمجھتے ہیں۔'' اور یہ کئی بار کئی نشستوں میں انھوں نے کہا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کیا بات تھی۔ ممکن ہے کہ وہ 'رفتار' کی ذمہ داری سے الگ ہونا چاہتے ہوں اس لیے کہ کلاسز تو وہ پابندی اوقات سے لے رہے تھے۔ وہ اپنے آخری سال میں اپنی اسی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہو سکے یعنی رفتار کی اشاعت نہ کرا سکے۔

۱۹ ستمبر ۲۰۰۰ء منگل کا دن تھا، جب میں چوتھے پیریڈ کے لیے جو پونے گیارہ بجے سے ہوتا تھا، شعبہ پہنچا۔ (اس وقت شعبہ آرٹس فیکلٹی کی عمارت میں تھا) لاؤنج کی جانب سے جیسے ہی شعبہ کی جانب مڑا تو وہاں تالا لگا پایا جب کہ فیکلٹی میں جیسی چہل پہل ہوتی ہے وہ ویسی ہی تھی کوئی سامنے کھڑا مل گیا تو اس سے دریافت

کرنے پر معلوم ہوا کہ منور بھائی کا انتقال ہوگیا ہے۔اس خبر کوسن کر کیسا محسوس ہوا،اس کے بیان کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔اس وقت موبائل فون اتنے سستے نہ تھے،اس لیے کثرت سے نہ تھے، بتانے والے نے یہ بھی اطلاع دی کہ رات میں انتقال ہوا ہے اور جنازہ وطن بھیجا جارہا ہے۔فوراً بھاگا بھاگا ان کی رہائش گاہ پہنچا تو راستے میں ہی آفتاب بھائی سے ملاقات ہوگئی، جو منور بھائی کے عزیزوں میں ہیں ان کا پورا نام تو آفتاب عالم ہے لیکن دھوہرا میں ان کا نام اور ان کی سیمنٹ ایجنسی ایک لینڈ مارک کی حیثیت رکھتے تھے۔آفتاب بھائی نے بتایا کہ گاڑیوں کا نظم ہوگیا ہے چوں کہ خاندان کے اکثر افراد مصر ہیں کہ جنازہ بھیجا جائے اس لیے کہ بوڑھے والدین کا یہاں آنا ممکن نہیں۔جا کر آخری دیدار کیا اور وہیں کھڑے اس جاتے ہوئے قافلہ کو دیکھتا رہا۔جس کے مسافروں کا آب ودانہ اس شہر سے اٹھ گیا تھا۔

میں نے اپنے پچھلے چند دنوں کا محاسبہ کیا تو یاد آیا کہ جمعرات کو ملاقات ہوئی تھی منور بھائی سے جیسے روزانہ ہوتی تھی۔جمعہ کو آدھے دن کی کلاسز کی وجہ سے اکثر لوگوں کی ملاقات نہیں بھی ہوتی ہے۔سنیچر کو وہ نہیں آئے تھے،اس کی مجھے اطلاع نہ تھی۔بعد میں لوگوں سے استفسار سے معلوم ہوا کہ ان کو بخار آیا اور نمونیا ہوگیا تھا۔ڈاکٹر فخر الہدیٰ ان کے عزیز ہیں اس لیے ان کی وجہ سے انہیں CCU میں داخل کرا دیا گیا تھا ورنہ ان کی بیماری اتنی سنگین نہ تھی۔احمد مجتبیٰ جواب شعبہ جغرافیہ میں استاد ہیں وہ اپنے کسی عزیز کی وجہ سے اس رات وہاں تھے انھوں نے بتایا کہ منور بھائی نے رات کا کھانا کھا کر عشا کی نماز پڑھی اور پھر لیٹ گئے اہلیہ کو انھوں نے گھر واپس بھیج دیا کہ بچوں کو اکیلے نہ رہنا پڑے،کوئی تشویش کی بات تھی بھی نہیں۔رات کے ڈیڑھ پونے دو بجے ان کی طبیعت خراب ہوئی اور فون آفتاب بھائی کے پاس پہنچا، وہ بھاگ کر ہسپتال آئے تو اسی وقت ان کا انتقال ہوگیا اناللہ وانا الیہ راجعون۔ڈاکٹروں نے جو موت کا سرٹیفکٹ دیا تھا اس میں لکھا تھا کہ تمام اعضاء رئیسہ ناکام ہوگئے۔کل من علیہا فان۔

۲۰۰۱ء کی گرمی کی تعطیل میں جب میں اپنے گھر پٹنہ گیا تو پیر الطیف جانے کا پروگرام بنایا کہ منور بھائی کے مرقد پر حاضر ہوسکوں اور ان کے والد سے تعزیت کرسکوں،ان کے خسر جناب جنید صاحب مرحوم جو خود بھی علیگ تھے،ان سے ملاقات ہوچکی تھی۔جنید صاحب منور بھائی کے ماموں بھی تھے،ان کے گھر جانے کے لیے میں نے پہلے ظفر بھائی (ڈاکٹر سید ظفر امام) کے گھر جانے کا پروگرام بنایا جو بیگو سرائے کے سانحہ کے باشندے ہیں ایک شب سانحہ میں قیام کے بعد دوسرے روز تقریباً بارہ بجے دن میں ہم دونوں پیر الطیف پہنچے۔اندازہ

ہوا کہ منور بھائی کی نانیہال تو کافی خوشحال ہے۔منور بھائی کے گھر جانے کی نوبت نہیں آئی ان کے والدصاحب خود تشریف لے آئے، لمبے قد کے گہرے گندمی رنگ، چھریرا بدن، چھدری سفید داڑھی میں ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ہم لوگوں کی قبرستان تک رہنمائی کی، میں ان آنکھوں کے پانی میں ان خوابوں کو، ڈوبتا ہوا دیکھتا رہا جو کبھی ایک باپ نے اپنے ہونہار بیٹے کی شکل میں دیکھے ہوں گے۔خواب تو اس بیٹے نے بھی دیکھے ہوں گے اپنی اولادوں کے لیے، ان کی تینوں بیٹیاں اب شادی شدہ ہیں، بڑے بیٹے نے نانیہال کے ترکے میں ملنے والی جائداد کے حصے میں ایک دکان کھول لی ہے، بلکہ اس کے مرحوم ماموں پرویز مرحوم نے یہ سب انتظام اپنی زندگی میں ہی کردیا تھا۔چھوٹا بیٹا جس کے بارے میں، میں سوچتا تھا کہ وہ کیسے سمجھایا جاسکے گا کہ اس کے ابا اب کبھی نہیں ملیں گے۔وہ جو ایک پل بھی ان سے جدا ہونا نہ چاہتا تھا، بیس برس سے زائد ہوگئے، اپنی اسی ذہنیت کے ساتھ آج بھی ہے عمر تو اس کی جوان ہوئی، لیکن ذہن اسی لڑکپن کا ہے۔میرے اس سفر میں ان کی دونوں بڑی صاحبزادیوں سے بھی ملاقات ہوئی، جن کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔یقیناً منور بھائی مرحوم نے جو خواب دیکھے ہوں گے ان کی یہ تعبیر تو نہیں سوچی ہوگی۔

●⧉●

”آج کے دور میں جب انسانی ذرائع علم سب کو معلوم ہیں۔کسی مافوق الفطری ذریعہ علم کا انکار عقل کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔یہ دراصل اسی قدیم اعتراض کی نئی شکل ہے۔انسان کی اصل آزمائش یہ ہے کہ تمام انسانی ضروریات ولوازمات کے ساتھ وہ اللہ والا بننے کا ثبوت فراہم کرے، رسولوں کا امتیاز یہ ہے کہ وہ زیادہ شادیاں کرکے بھی اور تعلقات کے تقاضے ادا کرکے بھی نہ صرف یہ کہ وہ خداترس ہوتے تھے بلکہ خدا کے رسول جیسے بلند منصب پر فائز ہوسکتے تھے۔“

(**ڈاکٹر منور حسین فلاحی**، تذکیر بالقرآن، ماہنامہ رفیق منزل، مارچ ۱۹۸۸ء)

حسرت ان غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

(ڈاکٹر منور حسین فلاحی کی علمی خدمات)

جمشید احمد ندوی

نظام قدرت کے مطابق ہر شخص کی عمر متعین ہے جس میں ایک سکینڈ بھی کمی زیادتی نہیں ہوسکتی ہے۔ تاہم انسان اپنی انسانی فطرت سے مجبور ہے اور وہ ہر وقت یہی تمنا کرتا رہتا ہے کہ ابھی اس کی عمر دنیا چھوڑ کر جانے کی نہیں تھی۔ یہی بات منور حسین بھائی کی وفات پر بھی کہی گئی تھی کہ ان کا انتقال کم عمری میں ہوگیا۔ اللہ ہم سب کو معاف کرے کہ ہم اپنے اس قول ورویہ سے مشیت ایزدی میں دخل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ زیادہ بہتر طور پر جانتا ہے کہ کس کے حق میں کون سا فیصلہ - زندگی یا موت زیادہ بہتر ہے۔

اسلام کی علمی تاریخ میں متعدد افراد ایسے گزرے ہیں جن کی عمر دنیاوی اعتبار سے بہت کم تھی لیکن انھوں نے اپنی حیات مستعار میں ایسے کارنامے انجام دیے کہ وہ تاریخ میں آج بھی زندہ ہیں۔ ڈاکٹر منور حسین فلاحی کا شمار بھی ان ہی ہستیوں میں کیا جاسکتا ہے جن کی زندگی تو بہت مختصر تھی لیکن انھوں نے اپنے اوقات کا استعمال اس طرح کیا کہ اپنے پیچھے ایک علمی سرمایہ چھوڑ گئے، یہ سرمایہ اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ انھوں نے یہ علمی سرمایہ ایک بھرپور تحریکی زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ چھوڑا ہے۔

عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ جو افراد تحریکات میں بہت زیادہ مصروف رہتے ہیں قلم وقرطاس سے ان کا رشتہ کچھ کمزور پڑ جاتا ہے یا بالکل ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے کہ 'لکل مجال رجال' کے مطابق اسلام کی سربلندی کے لیے کیے جانے والے ہر عمل کی قدر و قیمت ہے اور وہ اہمیت کا حامل ہے خواہ اس کا تعلق قلم وقرطاس سے ہو یا معاشرہ کی اصلاح سے، اجتماعی کاموں کے نظم ونسق سے ہو یا افراد کی کردار سازی سے، زمینی حقائق سے ہو یا مستقبل کی منصوبہ بندی سے۔ تاہم ایک مخصوص میدان میں مصروف عمل رہنے والوں کے مقابلے میں ان افراد کی اہمیت وقدر و قیمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، جو کئی چیزوں کا سنگم ہوتے

ہیں اور مختلف محاذ پر اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر منور حسین فلاحی کی شخصیت قابل قدر اور قابل رشک ہے کہ انھوں نے قلم وقرطاس اور دیگر مشاغل کے درمیان ایک توازن قائم رکھا تھا۔ عملی میدان میں جوہر دکھانے کے ساتھ ساتھ علمی سرگرمیوں کو بھی جاری رکھا اور اس میدان کو بھی کسی نہ کسی حد تک سر کرتے رہے۔

ڈاکٹر منور حسین فلاحی سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی یاد نہیں ہے، لیکن ان سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، کبھی شعبہ میں تو کبھی ان کی پہلی تربیت گاہ ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی میں۔ ان ملاقاتوں کا مجموعی تاثر یہ رہا کہ وہ ایک سنجیدہ، بردبار اور اپنے دھن کے آدمی تھے۔ غالباً ان کے دوستوں کا حلقہ بہت محدود تھا۔ تاہم ان کے حلقۂ یاراں میں ڈاکٹر امتیاز احمد اور ڈاکٹر خالد سیف اللہ (شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) شامل تھے اور گاہے بگاہے ان کے ساتھ ہی ملاقات ہوجایا کرتی تھی۔ میرے ذہن پر ان کا جو نقش مرتسم ہے اس کو الفاظ کا جامہ یوں پہنایا جاسکتا ہے کہ ان کا شمار علی گڑھ کے ان طلبۂ مدارس میں کیا جاسکتا ہے جن کی ظاہری شخصیت، رکھ رکھاؤ، چال چلن اور عادات واطوار میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اور ان میں ذرا بھی بدلاؤ نہیں آیا تھا۔ نئے اور کھلے ماحول میں آنے کے باوجود وہ ویسے ہی رہے جیسے وہ اپنے دینی ادارہ میں تھے۔ صرف شیروانی کا اضافہ ہوگیا تھا کہ وہ علی گڑھ کے لوازمات میں شامل ہے۔

ڈاکٹر منور حسین فلاحی ان خوش نصیب افراد میں تھے جنھیں تعلیم کی تکمیل کے ساتھ ہی ملازمت مل گئی تھی۔ ان کی پی ایچ ڈی ۱۹۹۲ء میں مکمل ہوئی تھی اور اسی سال ان کا تقرر شعبہ اردو میں بطور لیکچرر کے ہوگیا اور اس عہدہ پر ایک مختصر سی مدت گزارنے کے بعد ان کا انتقال ۱۸ ستمبر ۲۰۰۰ء میں ہوگیا۔ ان کی وفات کے وقت میں بھی علی گڑھ میں موجود تھا کہ میرا تقرر بحیثیت ریسرچ اسسٹنٹ شعبۂ عربی میں ہوچکا تھا۔ وہ وقت ان کے تمام متعلقین کے لیے بہت سخت تھا لیکن نظام قدرت سے سب مجبور ولاچار تھے۔ وفات کے بعد ان کی فیملی نے مادر وطن کو لوٹنا مناسب سمجھا اور وہ وہاں منتقل ہوگئی۔ دھیرے دھیرے سب کے یا کم از کم اکثر لوگوں کے حافظہ سے محو ہوتے چلے گئے جن میں میں بھی شامل ہوں۔ کبھی کبھار کسی حوالہ سے کوئی بات چھڑ جاتی تو تھوڑی دیر کے لیے ان کا تذکرہ ہوجاتا اور بس، پھر سب لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف ہوجاتے۔ اللہ بھلا کرے ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی صاحب، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کہ انھوں نے یاد رفتگاں کو آواز دی ہے اور ان کی زندگی کو ایک مرتب انداز میں پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس منصوبہ سے

حسرت ان غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

انھیں ذاتی طور پر کتنا فائدہ ہوگا اوران کے سامنے کیا کیا فوائد ہیں میں نہیں کہہ سکتا تاہم اس منصوبہ کا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ کچھ اشخاص وافراد کے حالات زندگی اور ان کے علمی ، دینی، سماجی اور تربیتی کارنامے محفوظ ہوجائیں گے جوان شاء اللہ آئندہ آنے والی نسلوں کے کام آئیں گے کہ ہماری خاکستر میں کیا کیا چنگاری دبی ہوئی تھی۔ اللہ انھیں ان کے ارادوں میں کام یاب بنائے اوراس راستہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور ہونے کے اسباب مہیا فرمائے۔

ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے اپنے پیچھے جو علمی سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے اس میں دو کتابیں اور متعدد مقالات، کچھ ترجمے، تلخیص وتبصرے اور'رفیق منزل، نئی دہلی' کے اداریے ہیں۔ لہٰذا ان کی شخصیت کو علمی لحاظ سے محقق و مصنف، مقالہ نگار ومترجم ومبصر اور مدیر کے خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ تمام پہلو ان کی شخصیت کے ثانوی پہلو ہیں۔ ان کا بنیادی پہلو اسلام کا ایک سپاہی ہونا ہے جس کا اظہار ان کی عملی زندگی سے ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی کار پیغمبری میں گزرا تھا کہ وہ عملی طور پر ایس آئی او اور جماعت اسلامی کے ایک فعال کارکن تھے اور دونوں تحریکوں کے عملی اور تنظیمی امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

بحیثیت محقق ومصنف

منور بھائی علیہ الرحمہ بنیادی طور محقق ہی قرار دیے جائیں گے کہ انھوں نے باضابطہ طور پر کوئی مستقل کتاب نہیں چھوڑی ہے تاہم ان کے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کی اشاعت نے انھیں مصنف کے درجہ پر بھی فائز کردیا ہے۔ ان کی تحقیق کا دائرہ بھی صرف ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کے اردگرد گھومتا ہے کہ انھوں نے اپنی اس صلاحیت کو مزید جلا بخشنے میں بخل اور کنجوسی سے کام لیا تھا اور تحقیق کے میدان میں مزید کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکے جس سے ان کا قد مزید بلند ہوتا۔ غالباً اس کی وجہ ان کی نظر میں انسانی زندگی کا مطمح نظر اور بنیادی مقصد کا 'کچھ اور' ہونا تھا۔

شعبہ نے ان کی ایم فل کے لیے جو موضوع منتخب کیا تھا وہ انیسویں صدی کی ایک اہم شخصیت اور تحریک علی گڑھ کے ایک فعال رکن 'مولوی چراغ کی حیات وخدمات' تھا۔ انھوں نے موضوع کا حق کرتے ہوئے ان کی حیات وخدمات کو اچھے انداز میں مرتب کیا تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ان کے عہد طالب علمی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم فل اور پی ایچ ڈی میں داخلہ ایک ساتھ ہی ہوجاتا تھا اور دونوں کے عناوین بھی طے ہوجاتے تھے۔ عام طور پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے موضوعات میں کوئی نہ کوئی

قدرے مشترک پائی جاتی تھی۔لہٰذا ان کی پی ایچ ڈی کا عنوان 'اردو میں علمی نثر (۱۸۵۷تا۱۹۱۴ء) سماجی علوم کے حوالہ سے' طے کیا گیا تھا کہ چراغ علی کی تصانیف کا تعلق علمی نثر سے تھا۔اس وقت ریسرچ میں داخلہ دینے کا عمومی رجحان یہی تھا تاہم کبھی کبھی کچھ طلبہ کو صرف ایم فل میں داخلہ دیا جاتا تھا اور پی ایچ ڈی میں داخلہ ان کی 'ریسرچ کارکردگی' پر موقوف کر دیا جاتا تھا۔

انھوں نے ایم فل کی طرح پی ایچ ڈی کے موضوع کے ساتھ انصاف کیا اور تن دہی، محنت اور جانفشانی کے بعد ایک عمدہ مقالہ تیار کیا تھا۔ان کی محنت اور جانفشانی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ڈھائی سو سے زائد کتابوں کا جائزہ اپنے مقالہ میں لیا ہے۔یہ دونوں مقالے پروفیسر منظر عباس نقوی، سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے زیر نگرانی لکھے گئے تھے اور بالترتیب ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۲ء میں انھیں جمع کیا گیا تھا۔ان مقالوں کی جامعیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ مقالات بعینہ اسی طرح شائع کر دیے گئے ہیں جس طرح انھیں شعبہ میں ڈگری کے حصول کے لیے جمع کیا گیا تھا ورنہ عام طور سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کو شائع کرنے سے پہلے ان پر نظر ثانی کی جاتی ہے اور اس کی خامیوں اور کمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔یہ عمل غیر مستحسن بھی نہیں ہے کہ طالب علمانہ مزاج اور ہوتا ہے اور استادانہ یا مصنفانہ مزاج اور۔لہٰذا ان کے دونوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا مناسب اور بہتر سمجھا جاتا ہے۔ان کے مطبوعہ مقالات کو دیکھ کر ان کے اندر چھپے ہوئے محقق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مصنف کی حیثیت سے ان کے دامن میں صرف دو کتابیں ہیں۔ان کی یہ دونوں کتابیں ان کے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات ہیں۔ایم فل کا مقالہ ان کی زندگی میں ہی ۱۹۹۷ء میں شائع ہو چکا تھا، جب کہ پی ایچ ڈی کا مقالہ ان کی وفات کے تقریباً بیس سال بعد ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا ہے۔پی ایچ ڈی کے مقالہ کی اشاعت میں مرحوم کے قریبی ساتھی اور کرم فرما دوست کا گرانقدر تعاون شامل ہے۔اللہ انھیں اجر عظیم سے نوازے کہ مرحوم کا ایک کارنامہ 'ضائع' ہونے سے بچ گیا اور اس سے استفادہ کی راہ ہموار ہوگئی ہے۔

مرحوم کے ایم فل کا مقالہ، خدا بخش لائبریری، پٹنہ سے شائع ہوا ہے جو خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا مقالہ کس قدر جامع اور اہم تھا۔اس ادارہ سے اس مقالہ کی اشاعت ان کے علمی مقام و مرتبہ کو طے کرنے کے لیے کافی ہے۔ان کا مقام و مرتبہ اور بڑھ جاتا ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ مذکورہ ادارہ ان کی کتاب کو بالکل عنفوان شباب میں شائع کرتا ہے۔اس کتاب کی اشاعت پر اس وقت کے ڈائرکٹر جناب حبیب الرحمٰن چغانی

نے مختصر سا پیش لفظ لکھا ہے اور مصنف کی علمی کاوش کو ان الفاظ میں سراہا ہے۔''ڈاکٹر منور حسین نے ایم فل کے اپنے اس مقالہ میں مولوی چراغ علی کی حیات اور ان کی علمی خدمات کا احاطہ کیا، ان کی اردو انگریزی تصانیف اور مضامین کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ موصوف نے مولوی چراغ علی کی شخصیت اور علمی خدمات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ سرسید کے ایک ہم خیال عالم سے روشناس کرانے کی ان کی یہ کاوش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی''۔ ان کا یہ مقالہ 'مولوی چراغ علی کی علمی خدمات' کے عنوان سے ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے مجموعی صفحات کی تعداد ۹۵ ہے۔

ان کی اس کتاب کو دو بنیادی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصہ میں مولوی چراغ علی کی حیات کو بیان کیا گیا ہے اور دوسرے حصہ میں ان کی علمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ ہی اس کتاب کا بنیادی حصہ ہے جس میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کے علمی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس کتاب کے ابتدائی حصہ میں مولوی چراغ علی کے آبا واجداد، پیدائش، تعلیم، ملازمت، قیام حیدرآباد، مرض وفات اور وفات پر معاصرین کی آرا، پس ماندگان اور شخصیت (حلیہ، قد وقامت، لباس اور عادات و اطوار اور ان کے علمی مقام و مرتبہ وغیرہ) کا انھوں نے بہت ہی مختصر انداز میں ذکر کیا ہے۔ ان کے بیانیہ کے اختصار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ سب معلومات انھوں نے صرف سولہ صفحات (۱۱ تا ۲۷) میں سمیٹ دی ہیں۔

انھوں نے ان کے معاصرین میں سے صرف سرسید، نواب سر وقار الامراء (اس زمانہ میں نظام حکومت کے مدار المہام) کے تعزیتی نوٹس کو نقل کیا ہے، حالی کے مختصر مرثیہ (دس اشعار پر مشتمل) کا ذکر کیا لیکن کوئی شعر نقل نہیں کیا ہے۔ اس کے علاوہ سید محمود، مولوی محمد اعظم چریا کوٹی اور سید محمد واحد علی نے ان کی وفات پر جو تاریخ وفات نکالی تھی، ان کو درج کیا ہے۔

حیات زندگی کے بعد ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کے ساتھ ساتھ تہذیب الاخلاق میں شائع ہونے والے مضامین کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ جائزہ کتاب کے اولیں حصہ کے مقابلے میں کسی قدر تفصیلی ہے۔ کتاب کے اس حصہ کے صفحات کی مجموعی تعداد ۶۳ ہے۔

مولوی چراغ علی کی مطبوعہ تصانیف میں تعلیقات، بشارت مثیل موسیٰ، مجموعہ رسائل (چار مقالات کا مجموعہ)، اعظم الکلام بارتقاء الاسلام (انگریزی)، حیدرآباد انڈر سر سالار جنگ (انگریزی، چار جلدیں)، تحقیق

الجہاد وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور مذکورہ کتابوں کے موضوع، مباحث اور کس کے رد میں لکھی گئی ہے وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مطبوعہ کتابوں کے بعد مولوی چراغ علی کے ان آٹھ مضامین کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے جو تہذیب الاخلاق میں رجب ۱۲۹۰ھ تا جمادی الاول ۱۲۹۲ھ کے درمیان شائع ہوئے تھے اور انھیں ملک فضل الدین نے کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔ اس مجموعہ میں شامل مضامین کے علاوہ انھوں نے العلوم الجدیدۃ فی الاسلام کا بھی جائزہ لیا ہے جس کی پانچ قسطیں تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئی تھیں لیکن مضمون مکمل نہ ہوسکا تھا کہ ان کی وفات ہوگئی تھی۔ یہ مضمون تہذیب الاخلاق میں چھپنے والا ان کا آخری مضمون ہے جو اتفاق سے ان کی زندگی میں چھپنے والا آخری مضمون بھی ہے۔

علمی خدمات کے مبحث کے آخر میں ان کی غیر مطبوعہ تصانیف/ رسائل/ مضامین کا ذکر کیا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ ان ۱۲ر رسائل کا نام درج کیا گیا ہے جو فاضل محقق کو دستیاب نہیں ہوسکے تھے۔

ان کے مطبوعہ وغیر مطبوعہ علمی سرمایہ کے جائزہ کے بعد مولوی چراغ علی کے اسلوب نگارش پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ''ان کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت ان تجزیاتی اور منطقی انداز ہے''۔ ان کے اسلوب کی دیگر خصوصیات میں استدلالی انداز بیان اور اس کا واضح اور غیر مبہم ہونا ہے۔

کتاب کے آخر میں کتابیات شامل ہے۔

ڈاکٹر مرحوم کی یہ کتاب ان کے تحقیقی ذہن اور علمی مزاج کی عکاس ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں کوئی بات بلا تحقیق نہیں کہی ہے، بلکہ بعض مقامات پر مسلمہ معلومات کو غلط بھی ثابت کیا ہے جیسے مولوی چراغ علی کی کتاب 'تعلیقات' کو بالاتفاق ان کی اولین تصنیف بتایا جاتا ہے لیکن انھوں نے اس قول سے اختلاف کرتے ہوئے ان کی کتاب 'ردشہادت قرآنی بر کتب قرآنی' کو ان کی اولین تصنیف بتایا ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے ان کی غیر مطبوعہ تصانیف کے ضمن میں ذکر کیا ہے جس کا مسودہ ان کے اپنے ہاتھوں کا تحریر کیا ہوا ہے۔ اس کتاب کے حوالہ سے انھوں نے دو چیزوں کی وضاحت کی ہے۔ پہلی یہ کہ اس کا ذکر مطبوعہ تصانیف میں ملتا ہے جب کہ وہ غیر مطبوعہ ہے۔ اسی طرح اس کتاب کو انھوں نے چراغ علی علیہ الرحمہ کی پہلی کتاب قرار دیا ہے کہ اس کی ابتدا ۱۸۶۲ء میں اور تکمیل ۱۸۶۴ء میں ہوئی تھی۔ اپنی اس تحقیق سے انھوں نے اس مسلمہ حقیقت سے اختلاف کیا ہے کہ 'تعلیقات' ان کی پہلی کتاب ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۸۷۱ء ہے اور سنہ طباعت ۱۸۷۲ء ہے۔

حسرت ان غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

یعنی دونوں کے سنہ تصنیف اور اشاعت میں کم از کم نو سال کا فرق ہے۔

اسی طرح انھوں نے چراغ علی کے ان مضامین کی تعداد میں اضافہ کیا ہے جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے تھے۔ کتاب کی اشاعت سے قبل تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کے کل آٹھ مضامین تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے تھے لیکن انھوں نے اپنی تحقیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ ان کے مضامین کی تعداد ۹ ہے۔ نواں مضمون 'العلوم الجدیدۃ فی الاسلام' ہے جس کی صرف پانچ قسطیں ہی شائع ہو سکی تھیں کہ مضمون نگار کا انتقال ہو گیا تھا۔

یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود بہت جامع ہے اور غالباً اس کی جامعیت کے پیش نظر ہی خدا بخش لائبریری نے اس کی اشاعت کا فیصلہ کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی دوسری کتاب 'اردو میں علمی نثر (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء): سماجی علوم کے حوالے سے' ہے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ زبان صرف ادبی موضوعات کے اردگرد نہیں گھومتی ہے بلکہ اس کے دامن میں سب کچھ سمویا ہوا ہے اور ان سب کو بھی 'نثر' کے درجہ میں رکھا جائے گا۔ اس کتاب میں صرف سماجی علوم کی کتابوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ طوالت کے باعث سماجی علوم میں سے بھی صرف چار بنیادی سماجی علوم- تاریخ، جغرافیہ، معاشیات اور سیاسیات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں علمی نثر کی تعریف و مفہوم کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اردو میں علمی نثر کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے فروغ میں فورٹ ولیم کالج، شاہان اودھ، شمس الامراء، قدیم دلی کالج کے کردار کو اجاگر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ انفرادی طور پر کی جانے کی کوششوں اور کاوشوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں سماجی علوم سے مراد لیے جانے والے علوم وفنون کی نشان دہی کی گئی ہے اور سماجی علوم میں سے جن علوم کی کتابوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اس کی وضاحت کی گئی۔ اس ضمن میں مترجم کتب کی نوعیت کو طے کرتے ہوئے ۱۸۵۷ء کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور آخری باب میں تاریخ، جغرافیہ، معاشیات اور سیاسیات کی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

جناب منور حسین صاحب کی دونوں کتابوں میں سے پہلی کتاب کسی حد تک مختصر ہے تو دوسری کتاب کسی قدر ضخیم- صفحات کے لحاظ سے- لیکن دونوں کتابوں میں جو قدر مشترک پائی جاتی ہے وہ ان کا تحقیقی اور علمی ہونا اور ان میں غیر ضروری مواد کا نہ ہونا اور صرف موضوع سے متعلق معلومات کو فراہم کرنا ہے۔ کاش وہ اپنے اس

حسرت ان غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

تحقیقی اور علمی مزاج کا استعمال دیگر عناوین اور موضوعات کے لیے کرتے تو اردو زبان وادب کے دامن میں کچھ اور لعل و گہر کا اضافہ ہوجاتا لیکن چونکہ عملی زندگی میں کاش اور اگر جیسے الفاظ کا کوئی گزر نہیں ہوتا لہٰذا بقول غالب 'ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے' کا ورد کرنے میں ہی عافیت معلوم ہوتی ہے۔

بحیثیت مقالہ نگار اور مترجم ومبصر

ڈاکٹر منور حسین مرحوم نے مذکورہ بالا کتب کے علاوہ کچھ مقالات ومضامین بھی بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ان میں کچھ طبع زاد ہیں تو کچھ مترجم تو کچھ کی ترجمہ کے ساتھ ساتھ تلخیص بھی کی گئی ہے۔موصوف کے مقالات ومضامین، تراجم، تلخیص اور تبصرے مختلف رسائل میں چھپتے رہے تاہم ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے، بلکہ ان کے علمی مزاج اور ان کی علمی حیات کے دورانیے کو دیکھتے ہوئے انھیں کم نہیں کہا جائے گا۔ان کے مقالات، مضامین، تراجم اور تبصرے مختلف جرائد ورسائل میں شائع ہوتے رہے تھے۔ان کی ایک فہرست ان کے ذاتی کوائف میں ملتی ہے۔اس مجموعہ میں شامل 'حیات نامہ' میں ان کے مقالات ومضامین ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

موصوف کے مقالات ومضامین کی فہرست پر طائرانہ نظر ڈالنے سے ہی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دیگر طلبہ کی طرح انھوں نے بھی علی گڑھ میگزین/ ہال میگزین سے اپنے قلمی سفر کا آغاز کیا تھا اور دوران طالب علمی ان مجلّات میں لکھتے رہے تھے۔وہیں یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے ہندوپاک کے معیاری اور علمی رسائل میں ان کی حصہ داری کافی کم ہے اور اتفاق سے جن علمی وادبی اور دینی رسائل میں ان کے مقالات ومضامین چھپتے رہے ہیں۔ان میں سے تین کا تعلق سرزمین علی گڑھ سے ہے۔ان میں سے دو-تہذیب الاخلاق اور فکر ونظر-کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تھا جہاں وہ ملازم تھے اور تیسرے رسالہ یعنی تحقیقات اسلامی سے وہ بحیثیت رفیق جڑے ہوئے تھے۔ان کے علاوہ کچھ مضامین رفیق منزل، نئی دہلی، زندگی نو (نئی دہلی)، حیات نو (بلریا گنج اعظم گڑھ) اور رفتار شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔

ان طبع زاد مقالات کے علاوہ انھوں نے کچھ اہم انگریزی اور عربی مقالات کو اردو کے قالب میں ڈھالا تھا۔ان میں سے کچھ مقالات کی انھوں ترجمہ کے ساتھ ساتھ تلخیص بھی کی تھی۔مقالات کے ترجمے اور تلخیص کو منور حسین کے 'حیات نامہ' میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

بحیثیت مدیر

مرحوم ڈاکٹر صاحب کا مختلف رسائل سے یک گونہ تعلق رہا ہے۔انھوں نے نہ صرف مختلف رسائل وجرائد میں لکھا ہے بلکہ رفتار شعبۂ اردو،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۱۹۹۶-۱۹۹۷ء)،علی گڑھ میگزین، ڈین فیکلٹی آف آرٹس،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۱۹۸۵-۱۹۸۶ء) اور رفیق منزل (دسمبر ۱۹۸۷ء تا دسمبر ۱۹۹۰ء) جیسے رسائل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے ہیں تو کچھ رسائل جیسے تحقیقات اسلامی،علی گڑھ میں مدیر رسالہ کا ہر قسم کا تعاون بھی کرتے رہے تھے۔اس کے علاوہ کچھ رسائل- جیسے اردو بک ریویو،نئی دہلی- کے ادارتی بورڈ میں بھی شامل تھے۔

ان کی ادارت کی بنیادی کسوٹی 'رفیق منزل' ہے جس نے انھیں ایک پختہ قلم کار بنادیا تھا اور وہ اسے بہتر سے بہتر بنانے کی اپنی جانب سے تمام ممکن کوشش کرتے تھے۔مولانا سید جلال الدین عمری،سابق امیر جماعت اسلامی ہند نے ان کی وفات پر لکھے گئے اپنے تاثراتی مضمون میں ان کی شخصیت کے اس پہلو کو یوں اجاگر کیا ہے: ''ڈاکٹر منور حسین فلاحی کو اللہ تعالیٰ نے لکھنے کی صلاحیت عطا کی تھی۔یہ اسی کا فضل ہے کہ اس صلاحیت کو کام میں لانے اور فروغ دینے کے انھیں مواقع بھی ملتے رہے۔SIO کا ترجمان 'رفیق منزل' دہلی سے ان ہی کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔وہ اس کے ایک ساتھ مدیر، طابع اور ناشر تھے۔دسمبر ۱۹۸۷ء تا دسمبر ۱۹۹۰ء تین سال تک اس کے مدیر رہے۔رفیق منزل کی ادارت کی وجہ سے ان کے تحریری ذوق کو تسکین ملی اور انھیں صحافت کا تجربہ ہوا۔اپنی ادارت کے دوران انھوں نے دو خاص نمبر بھی نکالے۔ایک کا عنوان تھا 'دعوت اسلامی اور ہندوستانی سماج'۔یہ مئی جون ۱۹۸۹ء کا مشترکہ شمارہ تھا۔دوسرا خاص نمبر مشہور ماہر تعلیم اور سابق قیم جماعت اسلامی ہند افضل حسینؒ کے متعلق تھا''۔

ان کی مدیرانہ زندگی کا آغاز اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن کے ترجمان 'رفیق منزل' نئی دہلی سے ہوتا ہے۔اس کی اشاعت کا آغاز دسمبر ۱۹۸۷ء میں مرحوم کی زیرادارت ہوتا ہے۔ان کی ادارت کا دورانیہ تین سال- دسمبر ۱۹۸۷ء تا دسمبر ۱۹۹۰- پر مشتمل ہے۔ان کے اداریے کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر کا 'تحریکی آدمی' انھیں ہر وقت بے چین کیے رہتا تھا اور وہ امت مرحومہ کی بازیابی کے لیے مختلف قسم کے منصوبے بنانے پر مجبور کیا کرتا تھا۔

ان کے اداریوں کی خاص بات یہ کہ وہ محض 'باتیں' یا 'اداریہ برائے اداریہ' لکھنے کے قائل نہیں تھے۔ان کے اداریوں کا کافی حصہ عملی باتوں پر منحصر ہے اور اس کا مخاطب اولیں اپنے آپ کو سمجھتے تھے۔ان کے اداریوں

میں ایک علمی انداز پایا جاتا ہے جب کہ متکلمانہ اور خطیبانہ انداز کہیں کہیں ہی پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے اداریوں میں قول کی بجائے عمل پر ابھارتے ہیں اور بہت سلجھے ہوئے انداز میں غیر عملی باتوں پر نکیر بھی کر دیتے ہیں اور حقیقت کا برملا اظہار کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور ربیع الاول/ دسمبر ۱۹۸۷ء کے اداریہ میں جہاں اس کی اشاعت کی طرف اشارہ کیا ہے وہیں ربیع الاول کے حوالہ سے اور عید میلا دالنبی کے تعلق سے مسلمانوں کے عام رویہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں کسی قسم کی کوئی روح نہیں پائی جاتی ہے اور وہ صرف ایک رسم کی ظاہری طور پر ادائیگی کرتے ہوئے اور اپنی زبانی محبت کا دعویٰ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں بقول علامہ اقبال 'رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی'۔

انھوں نے اپنے اداریوں میں ملک میں بڑھتے ہوئے غیر سیکولر اور فرقہ وارانہ مزاج کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے جس ماحول کی جانب اشارہ کیا تھا آج وہ بالکل عیاں ہو کر سامنے آ گیا ہے۔ دیکھیے رفیق منزل، جنوری ۱۹۸۸ء کا اداریہ۔

ان حالات سے نپٹنے کا حل بھی انھوں نے اسی اداریہ میں پیش کیا ہے جسے آج کے مصلحین امت بھی پیش کر رہے ہیں لیکن نہ ماضی قریب میں اور نہ ہی موجودہ حالات میں عملی طور پر ان میں سے کوئی بھی اس آگ کے دریا پار نہیں کرنا چاہتا۔ میری اپنی معلومات کی حد تک غالباً ڈاکٹر مرحوم صاحب نے بھی اس ضمن میں ذاتی طور پر کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی تھی کہ وہ براہ راست برادران وطن سے ملتے اور انھیں پہلے اپنے اخلاق و کردار سے متاثر کرتے، پھر ان کے سامنے دین اسلام کی دعوت پیش کرتے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم برادران وطن سے تعلق قائم کرنے کی ضرورت و اہمیت کو بیان تو کرتے ہیں لیکن عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی نہیں کرتے ہیں۔ ہر قسم کے کار نبوت میں مشغول و مصروف لوگوں میں سے کتنے ہیں جن کے برادران وطن کے ساتھ تعلقات ہیں اور وہ ان کی خوشی و غم کے موقع پر عملاً شریک ہوتے ہیں۔ اسلامی طبقہ کے مقابلے میں تجارتی طبقات کے تعلقات برادران وطن سے زیادہ گہرے ہیں جو موجودہ صورت حال کے نتیجہ میں کمزور سے کمزور پڑتے جا رہے ہیں۔ عام آدمی میں کوئی ان کے سکھ و دکھ میں شریک ہونا چاہے تو کیسے ہو کہ ایمان و کفر کا فیصلہ کرنے والے مفتیان کرام ان کے مومن و مسلم ہونے کے درپے ہی ہو جاتے ہیں کہ خبردار ان کے تیوہار وغیرہ میں شریک ہونا تو کجا اگر انھیں زبانی مبارک باد دے دی تو آپ کا دین و ایمان ختم، اگر بالفرض ختم نہیں ہوا تو مشکوک تو ضرور ہو جائے گا۔ اس صورت حال میں ان کے سامنے دین کی دعوت کیوں کر پیش کی جائے؟ ایک بہت بڑا سوال ہے۔ اس پر مستزاد ہمارے اخلاق و کردار اور مسلکی

حسرت ان غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اور جماعتی تعصّبات۔

ڈاکٹر مرحوم کے اداریے عام طور پر ملک کے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں، اسلام کی سربلندی اور احیائے امت مسلمہ کے منصوبے پیش کرتے ہیں۔ان میں سے آج بھی کچھ قابل عمل ہیں۔ ہر اداریہ کا جائزہ لینا طوالت کا باعث ہوگا لہٰذا کچھ اہم اداریوں کے بعض پہلوؤں پر اشارہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

اداریہ دسمبر ۱۹۸۷: رفیق کی اشاعت، عید میلا دالنبی کی رسم، نبی اکرم ﷺ کی بنیادی حیثیت اور دیگر مصلحین کے مقابلہ آپ ﷺ کا امتیاز وغیرہ۔

اداریہ جنوری ۱۹۸۸: ملک میں منافرت کا بڑھتا ہوا ماحول اور اس کے سدباب کی کوششیں اور منصوبے۔

اداریہ فروری ۱۹۸۸: اللہ کی بندگی کی دعوت کی اہمیت اور اسے تمام امور پر ترجیح دینے کی ضرورت کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کی اصلاح کے دیگر پہلوؤں کی نشان دہی۔

اداریہ اپریل تا مئی ۱۹۸۸: روزہ کی اہمیت اور اس کے تئیں مسلمانوں کا رویہ، اس مبارک مہینہ میں کمزور طبقہ کی خبر گیری اور معاشرہ سے تعلق رکھنے والے دیگر امور۔

اداریہ جون ۱۹۸۸: جوش وجذبہ کے ساتھ ہوش مندی سے کام لینے کی اہمیت اور ضرورت، رفیق منزل مہم کا اعلان اور اس کی ضرورت۔

اداریہ اگست ۱۹۸۸: جذبۂ قربانی کی اہمیت اور ضرورت۔

اداریہ ستمبر ۱۹۸۸: جنرل ضیاء الحق کی وفات پر مدیر کے تاثرات

اداریہ ستمبر ۱۹۸۸: مذہب اور سیاست کی تفریق (اداریہ یا مضمون)

اداریہ اکتوبر ۱۹۸۸: کارکنان تحریک اسلامی کی مولانا وحید الدین خان کی جانب سے کی جانے والی کردار کشی کی حقیقت۔

اداریہ نومبر ۱۹۸۸: اسلام کے اجتماعی نظام کی اہمیت کا اعتراف اور اس ضمن میں اسلامی تحریکات کی جانب سے کی جانے کوششوں کا ذکر۔

اداریہ دسمبر ۱۹۸۸: سلمان رشدی کی بدنام زمانہ کتاب 'سیٹنک ورسیز' پر حکومت ہند اور دیگر ممالک کی جانب سے پابندی لگائے جانے پر پیدا ہونے والے ہنگامہ اور مخالفت کا جواب۔

اداریہ جنوری ۱۹۸۹: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سرسید علیہ الرحمہ کی یاد میں منعقد ہونے والے توسیعی

حسرت ان غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

خطبات کی حقیقت اور اس کے مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ۔

اداریہ فروری ۱۹۸۹: دارالعلوم و مظاہر العلوم سہارنپور میں ہونے والی شورش اور اس کے اثرات بد

اداریہ اپریل ۱۹۸۹: روزہ کی اہمیت اور اس کا پیغام اور قرآن سے اس کا تعلق

اداریہ اگست ۱۹۸۹: اسلام کا نظام حیات اور تفریق وانتشار کی ناپسندیدگی

اداریہ ستمبر ۱۹۸۹: اقامت دین کی راہ میں مخلصانہ اور اصلاحی کوششوں کا نتیجہ

اداریہ اکتوبر ۱۹۸۹: ایس آئی او کی چوتھی میقات اور اس کے منصوبے

اداریہ دسمبر ۱۹۸۹: شمالی ہند میں پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ فسادات

اداریہ دسمبر ۱۹۸۹: تذکیر بالقرآن (القصص: ۸۳-۸۸)

مرحوم منور بھائی کے اداریوں کے حوالہ سے اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ان کا ہر اداریہ کمیت کے اعتبار سے الگ الگ ہے کہ چند مختصر ہیں تو کچھ قدرے طویل اور کچھ طویل، یعنی وہ موضوع کی ضرورت اور اہمیت کے اعتبار مختلف کمیت کے اداریے لکھتے تھے۔

رفیق منزل میں مرحوم منور بھائی نے کچھ مضامین بھی لکھے تھے اور تذکیر بالقرآن کے تحت بھی کبھی کبھار قرآن کی چند آیات کی تشریح وتوضیح بھی کیا کرتے تھے۔

بحیثیت کارکن ایس آئی او اور جماعت اسلامی

ڈاکٹر منور حسین فلاحی مرحوم کی شخصیت کا بنیادی پہلو دینی پہلو ہے۔ ان کی تمام زندگی دین اور اس کی بقا کے لیے کی جانے والی کوششوں کے اردگرد گھومتی ہے۔ جامعۃ الفلاح میں داخلہ کے بعد ان کے دینی مزاج کو مزید جلا ملی لہٰذا اپنے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کی خاطر اسلامی تحریکات سے نہ صرف وابستہ ہوئے بلکہ اس کے ایک پرجوش اور فعال کارکن بھی بن گئے۔ اسلام کی اشاعت اور اس کی تبلیغ ان کی زندگی کا بنیادی مقصد تھا اور اس مقصد کے لیے تمام چیزوں کو تج دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ یہی ان کی زندگی کا سب سے تابناک اور روشن پہلو ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی تمام دینی، اسلامی، علمی اور ادبی خدمات کو قبول فرمائے اور انھیں ان کی خدمات کا بہترین صلہ دے اور ابدی زندگی میں سکون واطمینان سے نوازے۔

ڈاکٹر منور حسین فلاحی مرحوم

ظفر احمد اثری

آزادی کے بعد سے ساٹھ ستر کی دہائی میں مسلمانوں کا دور انتہائی پرآشوب دور رہا ہے۔ مسلمان تعلیمی میدان میں ہر اعتبار سے پیچھے ہوتے جارہے تھے۔ دینی درس گاہوں سے فارغ ہونے والے طلبہ کی ایک بڑی تعداد حالات اور زمانہ کے تقاضوں کو پورا نہیں کر پارہی تھی اور زمانہ اور حالات کے اعتبار سے وہ اپنے وجود کو مختلف تعلیمی میدانوں میں اور اپنی صلاحیتوں کو ملک کے سامنے ایک طاقت اور قوت کے طور پر اپنے آپ کو پیش کرنے سے عاجز تھی چوں کہ ان مدارس کے نصاب تعلیم میں عصری علوم کو کوئی جگہ نہ دی گئی تھی۔ یہ بات تو ایک حد تک صحیح ہے کہ ایک محدود حلقے میں رہ کر ملت اسلامیہ کی ضرورت پوری ہو رہی تھی اور ملت اسلامیہ اس سے ضرور مستفیض ہو رہی تھی لیکن وہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے وہ متوقع فوائد نہیں حاصل کر پارہی تھی جن کا کہ انہیں اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی اور ہے کہ معاش کا مسئلہ دینی تعلیم سے نہیں جڑا ہوتا ہے۔ اور دوسری وجہ نصاب میں عصری علوم کا ناپید ہونا ہے۔

جامعۃ الفلاح کا قیام اس پس منظر میں دیکھا جاسکتا ہے جہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کو جگہ دی گئی اور نئی نسل کو عالم دین بنانے کے ساتھ ساتھ عصری علوم سے لیس کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہاں کے فارغین کے لیے اندرونِ ملک اور بیرون ملک کی کئی نامور یونی ورسٹیز میں داخلے کی منظوری اور سہولتیں فراہم کی گئیں تاکہ وہاں مزید اپنی تعلیمی صلاحیتوں کو پروان چڑھاسکیں اور اپنے مستقبل کو سنوار سکیں۔

جامعہ کا قیام ۱۹۶۴ء میں ہوا اور اس کے قیام کے ہوتے ہی ماہرین اساتذہ کی ایک ٹیم جمع ہونا شروع ہوگئی اور ہندوستان کے کونے کونے سے طلبہ بھی جمع ہونا شروع ہوگئے۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں بھی یہاں علم کی پیاس بجھانے کے لیے ۱۹۶۴ء میں آیا اور ۱۹۶۹ء میں فارغ ہوا اور یہاں سے فراغت کے بعد مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ نے جامعہ میں تدریس کے لیے بلایا۔ پہلے میں فراغت کے بعد چھ ماہ کے لیے اپنے

گاؤں کے مدرسہ میں تعلیم کا فریضہ انجام دینے لگا تھا۔ میرے لیے یہ بہت ہی سعادت کی بات تھی کہ اس عظیم درس گاہ میں، جہاں تعلیم حاصل کی تھی وہیں تعلیم وتدریس کا فریضہ انجام دوں۔ جامعہ آتے ہی مجھے عربی اول سے سوم تک کی انشاء کی کلاسیں اور ریاض الصالحین کی گھنٹیاں دے دی گئیں۔ اس وقت تمام اکابر اساتذہ موجود تھے بلکہ استاد محترم مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب نے عربی سوم کی انشاء اور ریاض الصالحین کی اپنی گھنٹی میرے لیے خالی کردی اور اس طرح میں وہاں تعلیم وتربیت کے نظم میں شامل ہوگیا۔ اس وقت مولانا جلیل احسن ندوی مولانا شہباز اصلاحیؒ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ اور مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ موجود تھے۔ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں اس وقت طلبہ کن کن عظیم اساتذہ سے مستفید ہورہے تھے اور اپنے مستقبل کو سنوار رہے تھے۔

ان ہی میں ایک سعادت مند طالب علم منور حسین تھے جو مونگیر صوبہ بہار سے آئے تھے اور وہ میری انشاء کے کلاس میں بھی تھے، ذہین وفطین طالب علم تھے اور اپنی کارکردگی کے اعتبار سے کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ اساتذہ کا احترام واکرام میں آگے آگے رہتے اور اس کے ساتھ میں بورڈنگ میں ان کا نگراں بھی تھا۔ یہاں بھی اخلاق وکردار کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے تھے۔ سنجیدگی اور متانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ہمیشہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہم آہنگی قائم رکھتے اور بہت ہی خاموش طبع طالب علم تھے اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتے لیکن ان کی کم لوگوں سے دوستی تھی۔

جب انجمن طلبۂ کا قیام ۱۹۷۷ء میں عمل میں آیا اور اس کا پہلا اجلاس جامعہ میں منعقد ہوا تو منور حسین اس میں شریک تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس اجالس کا اہم پروگرام انجمن کی دستور سازی اور مسودہ کو ٹھیک ٹھاک کرنا تھا۔ مسودہ پر گفتگو اور اسے پاس کرنے کے لیے مخصوص طور پر ایک سیشن تھا جس کی صدارت مولانا ابواللیث اصلاحیؒ وندی نے کی تھی۔ جو دستوری نکات نکالنے میں ماہر تھے اور اس کے اینچ پینچ سے بخوبی واقف تھے۔ مولاناؒ اس دستوری اجلاس میں بڑی دل چسپی کے ساتھ شریک تھے اور جامعہ کے اس وقت کے مخصوص حالات میں مدرسہ سے حد درجہ فکرمندی کا اظہار کرتے تھے۔ منور حسین بھی دستور کی باریکیوں پر گفتگو کرتے اور نشاندہی کرتے تھے۔ مولاناؒ نے ان کو کئی مواقع پر ان کی دستوری گفتگو کو سراہا۔ منور حسین جامعہ سے فراغت کے بعد علی گڑھ چلے گئے تو وہاں بھی ان کی ذہانت کے جوہر کھل کر سامنے آئے اور یہاں آکر اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور وہ ڈاکٹر منور حسین فلاحی بن گئے۔ ان کے علی گڑھ کے آخری دنوں کی زندگی کے احوال

کا علم نہ ہوسکا، جس کا مجھے افسوس ہے۔

میں مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ ان پر نمبر نکال رہے ہیں۔ یہ بہت ہی عمدہ کام کیا ہے اور ایک قابل تحسین عمل ہے اور ہر فلاحی اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے عظیم کاموں کو یاد کیا جائے اور ہر پہلو سے فلاحیوں کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جائے۔

●●

''آج پوری دنیا میں مسلمانوں کے سامنے جس قسم کے مسائل ہیں بالخصوص ہندوستان میں مسلمان جس صورتِ حال سے دوچار ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ایک ایسے طبقہ کا جس پر ہندوستان کی ایک بڑی آبادی کو اب تک دینی اعتماد رہا ہے، اس طرح باہم دست وگریباں ہونا اور اپنے وقار واعتماد کو خاک میں ملانے کی غیر دانش مندانہ کوشش جہاں ایک افسوس ناک امر ہے، وہیں اللہ کے اس دین کو رسوا اور ذلیل کرنے کی غیر ارادی مذموم کوشش ہے جو سارے انسانوں کے لیے رحمت اور نعمت بن کر آیا ہے۔ کیا یہ بات ایک زبردست سانحہ اور المیہ نہیں کہ علم دین کے حاملین، علم دین کے مراکز میں یہ مناظر لوگوں کے تمسخر کے لیے پیش کریں۔ کاش! ہم اپنے سطحی اور حقیر قسم کے مفادات سے بلند ہوسکیں اور دین وملت کے وسیع تر مفاد میں اب بھی دانش مندی کا دامن تھام لیں! **اللھم انا اعوذ بک من شرور انفسنا ومن سیأت اعمالنا۔** آمین۔''

(**ڈاکٹر منور حسین فلاحی**، اداریہ ماہ نامہ رفیق منزل فروری ۱۹۸۹ء)

ڈاکٹر منور حسین فلاحی۔ چند تأثرات

رضوان احمد فلاحی

''ڈاکٹر منور حسین فلاحی جامعۃ الفلاح میں میرے واقعی کلاس فیلو تھے۔'' کیا کلاس کے دیگر طلبہ کلاس فیلوز نہیں تھے؟''

نہیں، میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے۔ دراصل ہم دونوں کا ایک ہی دن داخلہ ہوا تھا اور ہماری فراغت بھی ایک ساتھ ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے ہم دونوں ایک دوسرے کے کلاس فیلو ہیں۔

واقعی کلاس فیلو ہونے کا جملہ دراصل منور مرحوم نے میرے لیے استعمال کیا تھا۔ میں دسمبر۱۹۸۳ء میں عازم برطانیہ ہونے سے ذرا پہلے ذاتی کام سے علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ مرحوم ان دنوں یونی ورسٹی کے طالب علم تھے اور غالبًا فلاحی طالب علموں میں سب سے سینئر تھے اور ان کی علی گڑھ انجمن شاخ کے ذمہ دار تھے۔ میری علی گڑھ حاضری کی مناسبت سے انہوں نے ایک چھوٹی سی تقریب ملاقات کا اہتمام کرڈالا۔ اس میں میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ رضوان میرے واقعی کلاس فیلو ہیں۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ہم دونوں کا ایک ہی دن اور ایک ہی کلاس عربی دوم میں داخلہ ہوا تھا۔ استاد محترم مولانا سلامت اللہ اصلاحی صاحب نے ہم دونوں کا داخلہ ٹیسٹ لیا تھا۔ ہم دونوں کئی ماہ تک ایک ہی کمرے میں رہائش پذیر رہے اور ظاہر ہے کہ جامعہ سے تعلیمی فراغت بھی ایک ہی ساتھ ہوئی۔

ایک ہی دن داخلہ کی بات مجھے نہیں معلوم تھی۔ مرحوم کے داخلہ کی کارروائی صبح کے سیشن میں مکمل ہوئی تھی اور میرے داخلہ کی دوپہر کے بعد والے سیشن میں۔ اس اعتبار سے مرحوم مجھ سے چند گھنٹے سینئر ٹھہرے۔ ہم دونوں کا داخلہ دسمبر۱۹۷۰ء کی کسی تاریخ میں عربی دوم میں ہوا تھا۔

منور مرحوم ایک سنجیدہ، کم گو اور محنتی طالب علم تھے۔ سادہ مزاج تھے۔ اپنا بیشتر وقت پڑھنے اور مطالعہ کرنے میں گزارتے تھے۔ عصر بعد سیر وتفریح اور کھیل کے اوقات بھی وہ کتابوں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ ان سے تعلقات کی نوعیت رسمی رہی، نہ بہت گرم جوشی نہ سرد مہری۔ اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے زیادہ گھلنے ملنے یا

یار باشی سے گریز کرتے تھے۔

ہم دونوں جامعہ سے جولائی ۱۹۷۶ء میں فارغ ہوئے۔ یہ بدنام زمانہ ایمرجنسی کا دور تھا اور وابستگان جماعت مختلف آزمائشوں کے شکار تھے۔ اللہ کے فضل سے یہ سیاہ دور اگلے سال مارچ یا اپریل میں ختم ہوا۔ سرگرمیاں بحال ہوئیں۔ منور مرحوم ۱۹۸۲ء میں علی گڑھ آ گئے جہاں فراغت کے بعد میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد ان سے صرف دو ملاقاتیں اور ہوئیں۔ ایک جامعۃ الفلاح میں انجمن طلبۂ قدیم کے پروگرام میں اور دوسری اور آخری مرکز جماعت اسلامی ہند دہلی میں۔ وہ ان دنوں ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی اور سہ ماہی تحقیقات اسلامی سے بھی وابستہ تھے اور اسی سلسلے میں ادارہ کے ذمہ دار اور رسالہ کے مدیر مکرم جناب مولانا سید جلال الدین عمری صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔ جو ان دنوں نائب امیر جماعت تھے۔ منور مرحوم کی زندگی اگر وفا کرتی تو وہ ہر دو کے لیے اثاثہ ثابت ہوتے۔

مرحوم نے شعبہ اردو سے پی ایچ ڈی کی تھی اور عارضی طور پر اسی شعبہ میں انہیں ملازمت بھی مل گئی تھی۔ اگر میری یادداشت غلطی نہیں کر رہی ہے تو ان کی ریسرچ کا موضوع فورٹ ولیم کالج کی اردو خدمات سے متعلق تھا۔ خدابخش خاں لائبریری، پٹنہ نے ان کی تحقیق کو شائع بھی کیا تھا۔ اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج سے متعلق مرحوم کا ایک مضمون ماہنامہ حیات نو میں بھی شائع ہوا تھا جس میں کالج کی اردو کی خدمات کے پردے میں اسلام مخالف سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا تھا۔ میری معلومات کی حد تک فورٹ ولیم کالج پر اس زاویہ سے یہ پہلی تحریر تھی ورنہ عموماً اس پر کام کرنے والے تحقیق کار کالج کی لسانی اور ادبی خدمات کی ریشمی قبا میں اتنے مدہوش ہو جاتے ہیں کہ اس پہلو کی طرف کسی کا دھیان بھی نہیں جاتا۔ مجھے امید ہے کہ فاضل مدیر اس قیمتی مضمون کو مجلّے کی فائلوں سے تلاش کر کے اسے اشاعت خاص کی زینت ضرور بنائیں گے۔

لندن میں مرحوم سے متعلق خبریں ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی صاحب سے ملتی رہیں جو ماضی قریب تک کئی برسوں سے اسلامک فاؤنڈیشن کی علمی سرگرمیوں میں معاونت کے لیے برطانیہ تشریف لاتے رہے۔ ان ہی سے منور مرحوم کے شعبہ اردو میں مستقل ہو جانے کی خبر ملی۔ اس کا بھی واقعہ بڑا دلچسپ رہا جو قدوائی صاحب نے مجھے سنایا اور منور مرحوم پر ان کی تحریر میں اس کا تذکرہ بھی ہے۔ ان ہی سے معلوم ہوا کہ منور مرحوم قدوائی صاحب کی مدد سے اپنی انگلش دانی کی استعداد بڑھاتے رہے اور موخر الذکر ان سے عربی سیکھتے رہے۔ دونوں استاد، دونوں شاگرد۔ مرحوم کے انتقال سے چند ماہ قبل پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب لندن تشریف لائے

تو ان کے ذریعہ ان کے مبتلائے مرض ہونے کی خبر ملی اور پھر چند ماہ کے بعد انتقال کی خبر دل کو افسردہ کر گئی۔

مرحوم ہماری کلاس کے ان طلبہ میں سے تھے جن کے بارے میں خیال تھا کہ وہ علمی دنیا کو اپنی علمی عطا سے فائدہ پہنچائیں گے اور انہوں نے اپنی حیات مختصر میں ایسا ہی کیا۔ انہیں اگر مزید مہلت حیات ملتی تو وہ یقیناً علم و تحقیق کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیتے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین۔

''اصلاح کا کام کرنے والوں کو ایک طرف اللہ تعالیٰ مختلف طریقوں سے آزماتا ہے، جو اس آزمائش میں صابر و ثابت قدم رہ جائیں انہیں فلاح و کامرانی کی خوش خبری سناتا ہے تو دوسری طرف مختلف طریقوں سے ان کی کوششوں میں مدد بھی فرماتا ہے۔ مصلحین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت کا جو قرآنی وعدہ ہے وہ کئی صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ مخاطبین کے قلوب کو نرم کر دینا، ضدی اور ہٹ دھرم طبیعت والوں کو تنبیہات کے ذریعہ ہوش میں آنے کے مواقع عطا کرنا، شقی القلب اور بدبخت لوگوں کو مہلت عمل ختم ہو جانے پر آسمانی یا زمینی آفتوں یا باہمی جدال و قتال کے ذریعہ فنا کے گھاٹ اتار دینا، یا مصلحین کے ذریعہ انہیں عذاب دینا۔ پیچیدہ حالات و مشکل مسائل میں صحیح طرز عمل کے لیے رہنمائی و دست گیری فرمانا نیز بصیرت و فراست کی نعمت عطا کرنا، سختیوں کو آسانیوں میں بدل دینا، مایوس کن احوال کو امید افزا احوال میں تبدیل کرنا۔ غرض یہ کہ اور بھی متعدد و متنوع صورتیں ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اپنی نصرت کا مظاہرہ فرماتا ہے۔''

(**ڈاکٹر منور حسین فلاحی**، اداریہ ماہ نامہ رفیق منزل ستمبر ۱۹۸۹ء)

ڈاکٹر منور حسین فلاحی۔ چند یادیں

انعام اللہ فلاحی

برادر منور حسین فلاحی مرحوم جامعۃ الفلاح کے ان فضلا میں سے ایک تھے جنہیں ہم عالم باعمل کہہ سکتے ہیں۔ مدارس اسلامیہ کے فارغین اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جب عصری درسگاہوں اور یونی ورسٹی کا رخ کرتے ہیں تو ان کی اچھی خاصی تعداد عام طور پر وہاں کے ماحول سے متاثر ہو جاتی ہے۔ وہ نہ صرف اپنے وضع قطع، لباس اور حلیہ کو بدل لیتے ہیں بلکہ ذہنی اور فکری طور پر بھی مرعوب ہو کر سابقہ فکر وخیال اور مدرسہ کی سابقہ زندگی کے عادات واطوار سے دست بردار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے طلبہ بھی دیکھے گئے ہیں جو اپنی مادر علمی کو برا بھلا کہتے ہیں، اپنے مدرسے اور جملہ مدارس اسلامیہ کو تنقید اور سب وشتم کا نشانہ بناتے ہیں۔

مولانا منور حسین فلاحی اس کے برعکس اپنے فکر وخیال اور نظریہ وعمل میں نہایت پختہ تھے۔ وہ یونی ورسٹی کے ماحول اور افکار وخیال سے کبھی بھی مرعوب نہیں ہوئے۔ ان کا شمار ان فارغین مدارس میں ہوتا تھا، جو نہ صرف اپنے ظاہر بلکہ باطن میں بھی کسی طرح کی مرعوبیت کے شکار نہیں ہوئے۔ مولانا مرحوم شیروانی اور ٹوپی پہنتے تھے۔ کلاس روم ہو کہ ہاسٹل، سفر ہو یا حضر ہر جگہ ان کا ایک ہی لباس ہوتا تھا۔ اپنے درجے میں ممتاز نمبرات سے پاس ہوتے تھے۔ انہوں نے ایم اے میں گول میڈل بھی حاصل کیا تھا۔

منور بھائی کا قد طویل اور جسم نحیف تھا، بینائی کمزور تھی زیادہ پاور کا چشمہ پہنتے تھے۔ سرسید ہال میں ہم دونوں رہتے تھے، ہاسٹل الگ الگ تھا۔ وہ اس حدیث پر عامل تھے: **طعام الواحد یکفی الاثنین و طعام الاثنین یکفی الثلاثه**. 'ایک فرد کا کھانا دو لوگوں کے لیے کافی ہوتا ہے اور دو کا کھانا تین لوگوں کو کفایت کرتا ہے۔' یونی ورسٹی میں عام طور پر ان سے طلبہ ملنے آتے رہتے تھے اور حلقے یوپی کے صدر تھے اس وجہ سے باہر سے بھی لوگ آتے رہتے تھے۔ وہ اپنے کھانے میں آنے والوں کو شریک کر لیتے تھے۔ مہمانوں کی آمد پر کبھی میرا کھانا اپنے کمرے میں منگا لیتے تھے کبھی اپنا کھانا میرے کمرے میں بھیج دیتے۔ اس طرح دو کھانے میں

تین لوگ کھا لیتے تھے۔ نہایت کفایت شعار تھے۔ بیت المال کے بارے میں غایت درجہ محتاط تھے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں عام طور پر عصر کے بعد سے عشاء تک طلبہ شمشاد مارکیٹ اور تصویر محل کی طرف چائے پینے اور گھومنے اور تفریح میں وقت گزارتے تھے ان کا معمول تھا ڈپارٹمنٹ لائبریری اور SIO آفس، نہ ان کے پاس چائے پینے کا وقت تھا نہ اِدھر اُدھر آنے جانے کا۔ سرسید ہال کی جامع مسجد میں فجر کی نماز پڑھتے تھے۔ یونی ورسٹی میں عام طور پر دیر رات تک جاگتے ہیں اور صبح ۸ یا 9 بجے تک سوتے ہیں۔ اس وجہ سے جو لوگ نماز کے پابند بھی ہوتے ہیں فجر کی نماز ان لوگوں کی بھی قضا ہو جاتی ہے لیکن منور بھائی اگر یونی ورسٹی میں ہیں تو فجر میں ان کا ملنا یقینی ہوتا تھا۔

جامعۃ الفلاح سے 1974 میں عالمیت اور 1976 میں فضیلت کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ میں ان کے درجے کے ساتھیوں میں طارق اکرام اللہ (دہلی)، وسیم احمد غازی (دہلی)، صالح سیف اللہ (رانچی)، عطاء الرحمٰن (بستی)، محمد ابرار (اعظم گڑھ)، رضوان احمد (اعظم گڑھ مقیم لندن)، امیر احسن (سدھارتھ نگر)، رحمت اللہ (بستی) حافظ محمد مصطفیٰ (رانچی)، عبدالقیوم (سدھارتھ نگر)، بدرالدین (اعظم گڑھ)، جمیل احمد (اعظم گڑھ)، آفتاب عالم (اڈیشہ)، محمد خالد (بستی)، جلال الدین (منی پور) تھے۔

جامعۃ الفلاح سے فراغت کے بعد انہوں نے درس وتدریس کو اپنے لیے میدان کار منتخب کیا، لیکن شاید انہیں جلد ہی یہ احساس ستانے لگا کہ درس تدریس کا مشغلہ اور زیادہ علمی تیاری کا متقاضی ہے۔ ایک اچھا استاد بننے کے لیے فن استادی بھی آنا چاہیے، چناں چہ انہوں نے اس مشغلے کو خیر آباد کہہ کر ایک بار پھر طالب علمی کی زندگی اختیار کر لی۔ اس کے لیے انہوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا رخ کیا۔ وہیں سے بی اے، ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

وہ ایس آئی او آف انڈیا کے تاسیسی رکن تھے۔ ایس آئی او جس وقت تشکیل کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ اس وقت جامعۃ الفلاح بلریا گنج (اعظم گڑھ، یوپی) میں بھی ایس آئی او کی شاخ قائم ہوئی، اس میں حامد علی ساغر فلاحی زبیر احمد ملک فلاحی اور راقم پیش پیش تھے، اسی طرح بلریا گنج قصبے سے صباح الدین اعظمی فلاحی اور طارق احسن فلاحی وغیرہ سرگرم تھے، اس کے بعد ولی اللہ سعیدی فلاحی، عبدالرحمٰن فلاحی، عطاء الرحمٰن، سعید احمد گجراتی اور حبیب احمد گجراتی وغیرہ بھی تھے۔

مشرقی یوپی کا تین روزہ تربیتی کیمپ قصبہ بلریا گنج میں رکھا گیا تھا، اس کیمپ کا ناظم مجھے بنایا گیا تھا۔ مرحوم

حکیم محمد ایوب مرحوم کی خصوصی دل چسپی تھی۔ اس کیمپ کے پورے اخراجات اور نظم و انصرام کو خود دیکھ رہے تھے۔ اس طرح سے مقامی جماعت کا پورا تعاون حاصل تھا۔ اس پروگرام میں صدر حلقہ جاوید علی صاحب اور سکریٹری حلقہ منور حسین صاحب کو شریک ہونا تھا۔ صدر حلقہ کسی معذوری کی وجہ سے نہیں شریک ہو سکے۔ بھائی شفیق الرحمٰن (سابق ایڈیٹر سہ روزہ دعوت) کی ذمہ داری تھی کہ مولانا سید احمد عروج قادری صاحب کے ہمراہ اس کیمپ میں شریک ہوں، وہی خصوصی مربی تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جب یہ حضرات اعظم گڑھ پہنچے تو رات ہوگئی۔ اس وقت 8 بجے کے بعد اعظم گڑھ سے بلریا گنج کے لیے سواری نہیں ملتی تھی، پوری رات اعظم گڑھ بس اسٹینڈ پر مچھروں کی یلغار میں گزاری۔ صبح بلریا گنج پہنچے تو پروگرام کا وقت ہو چکا تھا۔ مولانا مرحوم کی تذکیر سے ہی پروگرام کا آغاز ہونا تھا۔ انہوں نے چائے پینے کے بعد تذکیر پیش کی تینوں دن انھیں کی تذکیر تھی۔ موضوعات تھے: 'محبت اور دشمنی اللہ کے لیے'۔ دوسرے دن کا عنوان تھا: 'جڑنا اور کٹنا اللہ کے لیے' اور تیسرے دن کا موضوع تھا: 'دینا اور نہ دینا اللہ کے لیے'۔ اس پروگرام میں مولانا کی ایک تقریر تھی، جس کا عنوان تھا: 'فکر آخرت اور اسلامی انقلاب کا رشتہ'۔ بعد میں اسٹوڈنٹ Z اسلامک پبلیکیشنز (SIP) نے اس تقریر کو کتابچہ کی شکل میں شائع کیا تھا۔ مولانا منور صاحب سے اسی پروگرام میں پہلی ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد ZAC وغیرہ میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

ایس آئی او کی دوسری میقات (1985-1987) میں انہیں یو پی کا صدر حلقہ منتخب کرلیا گیا اور مجھے سکریٹری حلقہ مقرر کیا گیا۔ جامعۃ الفلاح سے فضیلت کے بعد میں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ایم اے عربک میں داخلہ لے لیا تھا، یہی وہ پہلا سال تھا جب علی گڑھ میں جامعۃ الفلاح کی فضیلت کی ڈگری B.A. کے مساوی تسلیم کی گئی تھی اور براہ راست ایم اے میں داخلہ دیا گیا تھا۔ ہمارے درجے کے کئی ساتھیوں نے داخلہ لیا تھا، اطہر احسن، اطہر کمال، محمد احمد، توقیر عالم، محی الدین ساجد اور امتیاز احمد وغیرہ۔

اس طرح ان کے ساتھ دو سال رہنے کا موقع ملا۔ شمشاد مارکیٹ کے پاس گلشن سہیل بلڈنگ میں ایس آئی او کے حلقے کا آفس تھا۔ اس مکان کو اصلاً احراز الحسن جاوید صاحب نے کرایہ پر لے رکھا تھا اسی میں سے ایک روم sio کو دے دیا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد سے عشاء تک ہم دونوں آفس میں بیٹھتے تھے۔ دونوں اعزازی طور پر کام کرتے تھے۔

میرے حصے کا بہت سارا کام وہ خود کر لیتے تھے۔ میں تنظیم میں نو آموز تھا اور وہ ایک میقات سکریٹری

حلقہ رہ چکے تھے اس طرح ان کے تجربات بھی زیادہ تھے۔ اللہ نے انہیں تحریر کا فن عطا کیا تھا، پختہ تحریر تھی جو بھی لکھتے تھے ایک بار لکھتے تھے درمیان میں کہیں بھی کاٹتے نہیں تھے۔ اس وقت یونٹس اور سرکلس کو سائیکلو اسٹائل سے پرنٹ کر کے بھیجا جاتا تھا۔ اسٹینسل کاٹنے کا کام سکریٹری کا ہوتا تھا لیکن اکثر وہ خود کرتے تھے اور نہایت خوش دلی سے کرتے تھے کبھی بھی ناگواری کا اظہار نہیں کرتے۔

اپنی ذات کے خلاف سننے کی صلاحیت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ برادر محترم کے اندر سخت سے سخت بات برداشت کرنے اور کسی ردعمل کا شکار نہ ہونے میں کمال حاصل تھا۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ان کے اساتذہ مختلف الخیال تھے۔ ان میں تبلیغی جماعت کے بعض بڑے ذمہ دار بھی تھے لیکن ان کو تمام لوگوں میں مقبولیت حاصل تھی۔ انہیں عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ نہایت ہی کریم النفس، نرم خو، منکسر المزاج اور شیریں کلام تھے۔

منور حسین مرحوم بلند ذہن وفکر اور مضبوط کردار کے حامل تھے۔ اللہ نے ان کی زبان میں تاثیر اور شخصیت میں رعب دیا تھا۔ لکھنؤ میں دفتر جماعت اسلامی ہوادار منزل میں حلقے کی سطح کا تربیتی کیمپ لگا تھا۔ پورے صوبے کے ممبران شریک تھے۔ جس دن اجتماع ختم ہونا تھا شہر کے حالات خراب ہوگئے، مولوی گنج علاقہ میں کرفیو کا اعلان کر دیا گیا۔ تمام لوگ اسی بلڈنگ میں محصور ہوکر رہے بلڈنگ کے عقب میں ایک دروازہ تھا جہاں سے کھانے پینے کی چیزیں آتی رہیں۔ تیسرے دن کرفیو میں ڈھیل دی گئی۔ یہ بات طے ہوگئی کہ پانچ پانچ افراد دفتر سے وقفے سے نکلیں۔ کچھ لوگ رکاب گنج چوک کی طرف سے اسٹیشن کے لیے نکلے، کچھ آمین آباد کی طرف سے نکلے۔ تھوڑی دیر کے بعد اطلاع ملی کہ رکاب گنج چوک سے پہلے پولیس نے کچھ لوگوں کو روک لیا ہے۔ منور حسین مرحوم نے شیروانی اور ٹوپی پہنی اور مجھے ساتھ لے کر رکاب گنج چوک کی طرف نکلے۔ ایک جگہ آگ کا الاؤ جل رہا تھا وہیں پر ان پانچ لوگوں کو روک کر پولیس کا عملہ طرح طرح کے سوالات کر رہا تھا۔ منور صاحب ان کے قریب پہنچتے ہی کہا کہ آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں آپ کی ٹرین چھوٹ جائے گی اٹھیے اور جائیے۔ سارے لوگ اٹھے اور آگے بڑھ گئے۔ منور حسین صاحب نے مجھ سے کہا چلو واپس چلتے ہیں۔ پولیس کے عملہ سے انہوں نے بات ہی نہیں کی اور نہ ہی ان لوگوں نے ان سے کوئی سوال کیا۔

سرنگا پٹنم میں منتخب ممبران کا کیمپ تھا۔ دہلی اور علی گڑھ کے احباب ایک ساتھ سفر کر رہے تھے۔ صفدر سلطان اصلاحی مرحوم اور ایک صاحب دوسری بوگی میں تھے اور ہم لوگ دوسری بوگی میں۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھے

تھے ایک بوڑھی عورت سے ٹی ٹی بات کر رہا تھا اور اسے اگلے اسٹیشن پر اترنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس کا تیور کچھ سخت تھا۔ صفدر صاحب نے مداخلت کی اور کہا بوڑھی عورت ہے اس پر رحم کرو۔ پھر ٹی ٹی اور صفدر مرحوم میں کچھ سخت کلامی ہوگئی۔ ٹی ٹی نے صفدر صاحب سے ٹکٹ طلب کیا۔ ٹکٹ میں جو عمر لکھی تھی وہ مرحوم کی حقیقی عمر ہی تھی لیکن ان کا بھاری بدن ٹوپی اور داڑھی دیکھ کر کہنے لگا: یہ تمہارا ٹکٹ نہیں ہے، اپنی تاریخ پیدائش کا پروف دو۔ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ اگلے اسٹیشن پر انہیں ٹی ٹی اتار کر پولیس کے حوالے کر دے گا۔ منور بھائی دوسری بوگی میں تھے انہوں نے جا کر بات چیت کر کے کسی طرح معاملہ حل کیا۔

منور فلاحی مرحوم کے انتقال کے بیس سال ہو چکے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ ابھی کل کی بات ہے۔ ان کی محبت اور اپنائیت، ان کا خلوص اور ایثار، تواضع اور انکساری نے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ نظر جھکا کر چلتے تھے اور نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لوگوں سے ملتے تھے۔ وہ ایس آئی او آف انڈیا کے ماہ نامہ اور ترجمان رفیق منزل کے کئی سالوں تک اعزازی مدیر رہے۔ ادارۂ تحقیق وتصنیف سے بھی کچھ عرصہ تک وابستہ رہے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں لکچرر رہے۔ ۱۸ر ستمبر ۲۰۰۰ کو اس دار فانی کو خیر باد کہا۔

اللہ سے دعا ہے کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ان کی خدمات کو ان کے حق میں صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

منور بھائی - کچھ یادیں

اشہد رفیق ندوی

شہرِ علم و دانش علی گڑھ میں جن چند بھلے لوگوں سے ملاقات ہوئی، ان میں ایک منور بھائی مرحوم تھے۔ دراز قامت، فراخ سینہ، تیز رفتار، چہرے پر چیچک کے داغ مگر نور سے بھرے ہوئے، لب پر ہر دم تبسم، بولتے تو منھ سے پھول جھڑتا، لکھتے تو الفاظ کے موتی جڑتے، خدمت کے جذبے سے سرشار، ہر دم رواں، پیہم دواں، میرے منور بھائی وقت سے پہلے رخصت ہو گئے۔ ہائے اللہ۔

ڈاکٹر منور حسین بھائی ضلع کھگڑیا کے قصبہ پیر الطیف..... کے علمی خانوادہ میں یکم جولائی ۱۹۵۹ء کو پیدا ہوئے۔ والد محترم انوار الحق صاحب نے بہترین تعلیم وتہذیب سے آراستہ کیا۔ جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ سے عالمیت وفضیلت پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے، بی ٹی ایچ، ایم اے اور پی ایچ ڈی کی اعلیٰ اسناد اعلیٰ نمبرات سے حاصل کیں۔

دوران تعلیم علم وتہذیب کے ساتھ بہت نیک نامیاں کمائیں۔ ہر دو ادارے کے طلبہ واساتذہ میں اپنی لیاقت، جانفشانی اور شرافت کی وجہ سے مقبول رہے۔ ہر طرح کی علمی وثقافتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور فائز المرام ہو کر انعامات واعزازات حاصل کرتے۔ علی گڑھ میں دورانِ تعلیم ہال میگزین اور یونیورسٹی میگزین کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یونیورسٹی میگزین کا ایڈیٹر مقرر ہونا بجائے خود بہت بڑا اعزاز تھا۔ جب وہ معیاری ترتیب وتہذیب کے بعد منصۂ شہود پر لائے تو ناموران علی گڑھ نے ان کی صلاحیت کا کھل کر اعتراف کیا اور دادِ تحسین دی۔ ایڈیٹر مقرر ہونے سے پہلے معروف رسائل میں علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین لکھنے لگے تھے۔ پی ایچ ڈی مکمل ہونے کے بعد ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی میں رفیق کی ذمہ داری سنبھالی۔ اور اس کے ترجمان مجلّہ تحقیقات اسلامی کے معاون مدیر کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۹۴ء میں بفضل خداوندی مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں فضا ناسازگار ہونے کے باوجود لیاقت کی بنیاد پر لیکچرر منتخب ہو گئے اور ٦ برس خدمات انجام دیں۔ شعبے کے ہر فرد کی نگاہ میں ان کا احترام واعتبار تھا۔ تدریسی مشغولیت کے ساتھ مضامین ومقالات بھی خوب لکھے۔

منور بھائی مرحوم کی صالحیت ان کی اصل پہچان تھی، عنفوانِ شباب میں طلبہ کی مقبول تنظیم ایس آئی او سے وابستہ ہوئے۔ پھر مسلم یونیورسٹی یونٹ کے صدر، سکریٹری وصدر حلقہ زیڈ اے.بی اور سی اے سی ممبر کی حیثیت سے تنظیمی ذمہ داریاں قبول کر کے تنظیم کی جڑیں مضبوط کیں۔ راقم جیسے نامعلوم کتنے کندہ ناتراش کو تراش خراش کر نکھارا۔ تدریس وتصنیف کے ساتھ نوجوانوں کی تربیت میں انہیں خاص دلچسپی تھی، فیکلٹی میں ہوں یا ہال میں، شعبہ میں ہوں یا ادارے میں، ہر دم ان کی صالح طبیعت بے چین رہتی تھی کہ اپنے نوجوان بھائیوں میں کیسے دین کا شعور پیدا کر دیں؟ کیمپس میں بڑھتی بے راہ روی پر کیسے قدغن لگائیں؟ اگر وہ فریضہ منصبی میں مشغول نہ ہوتے تو کسی نہ کسی نوآموز کی ذہن سازی کر رہے ہوتے۔ ان کا شفقت بھرا انداز، لپک کر سلام میں پیش قدمی کرنا، مصافحہ کرنا اور پیٹھ پر سرپرستوں کی طرح ہاتھ رکھ کر حوصلہ افزائی کرنا، کامیابی کے گر سکھانا، مشکلات کا حل پیش کرنا بھلائے نہیں بھولتا۔

سرسید ہال (نارتھ) کے باب العلم سے متصل ان کا کمرہ تھا۔ باب العلم پر ایسے ہی پہرہ دار کی ضرورت بھی تھی۔ اذان کے ساتھ مسجد کے لیے نکلتے تو ان کے جلو میں نمازیوں کا ایک قافلہ ہوتا۔ خود بہت پابند صلوٰۃ تھے اور پاس پڑوس میں سب کو پابند بنا رکھا تھا۔ فیکلٹی میں دو تین موٹی پتلی کتابیں سینے سے دبائے داخل ہوتے تو سلام علیکم سلام علیکم سے فضا گونج اٹھتی۔ یہ ان کی صالحیت، حسن اخلاق اور پاکیزہ کردار کو سلام ہوتا۔ موٹے شیشے والے چشمے کے پیچھے چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ایک ایک کر کے سب کو دیکھتے، مسکراتے، طلب کا جواب دیتے اور پھر چیمبر یا سیمینار لائبریری میں مطالعہ میں منہمک ہو جاتے۔ وقت ضائع کرتے تو کسی نے دیکھا ہی نہیں۔

منور بھائی نے کل ۴۱ برس عمر پائی مگر اس چھوٹی سی عمر میں بیش بہا تحریری سرمایہ چھوڑا۔ جو ان کے وسیع مطالعہ، تنقیدی بصیرت اور پختہ صلاحیت پر دال ہے۔ ان کے بایو ڈیٹا میں ۱۸ مطبوعہ مقالات / مضامین، ۱۲ تبصرے، ۴ غیر مطبوعہ مضامین، ۹ سیمیناروں میں پڑھے جانے والے مقالات کا تذکرہ ہے۔ ایس آئی او کے ترجمان رفیق کے ......عرصہ تک مدیر رہے۔ اس کی ترتیب وتہذیب اور پرمغز وچشم کشا موضوعات پر اداریے اس پر مستزاد ہیں۔ ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو میں علمی نثر۔ سماجی علوم کے حوالے سے'' حال میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر مزید حیرت ہوتی ہے کہ ایک طالب علم جو مدرسے کا پس منظر رکھتا ہے۔ اردو زبان وادب پر دسترس کے ساتھ سماجیات میں اتنا درک کیسے حاصل کر سکا؟ برادر موصوف نے اس مقالہ میں

تاریخ، جغرافیہ، معاشیات اور سیاسیات میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۶ء تک کے اردو لٹریچر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور سیکڑوں کتابوں کا عطر کشید کر رکھ دیا ہے۔

ابھی زندگی کی ۴۱ بہاریں ہی دیکھ پائے تھے کہ اچانک یہ خبر آ گئی کہ محترم منور بھائی نہیں رہے۔ حلقہ تعارف میں کہرام مچ گیا کہ ایسا عظیم مصلح اتنی جلدی رخصت ہو گیا۔ ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی سے جب ان کا جسم بے جان رخصت ہوا تو ان کے محبین کا ہجوم تھا۔ سب کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ مگر تقدیر کا لکھا کس نے ٹالا ہے۔ اللہ نے ان کے لیے مہلت عمل تھوڑی ہی رکھی تھی۔ اللہ نے اپنے محبوب کو جلد اپنے پاس بلا لیا۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور ان کی گراں قدر خدمات کو توشۂ آخرت بنائے۔ آمین۔

''اس ملک میں بسنے والے پندرہ کروڑ مسلمانوں کی کوئی مؤثر لیڈر شپ نہیں ہے۔ کوئی ایسی زبان نہیں ہے جس کی آواز میں اثر ہو۔ مختلف سیاسی پارٹیوں میں شامل اکثر مسلم رہنما بے زبان بھیڑوں کی طرح ہیں۔ جو نہ اپنا گلہ چھوڑ سکتے ہیں اور نہ چرواہے سے بغاوت کر سکتے ہیں۔ اتنی بڑی ملت کا کوئی رخ نہیں اور نہ کوئی قابلِ بھروسہ سیاسی قیادت۔

حالات انتہائی صبر آزما اور حوصلہ شکن ضرور ہیں بلکہ کبھی کبھی تو مستقبل بھی غیر یقینی نظر آتا ہے مگر یہی وہ حالات ہیں جن میں صبر اور جرأت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ صفات صحیح معنوں میں عزم الامور بن جاتے ہیں۔ ہمارے اندر اعتماد اور یقین ہونا چاہیے اور ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمیں اس ملک کو کچھ دینا ہے، جواب تک ہم نہیں دے سکے ہیں۔ ایک خدا کی بندگی کی دعوت، ملت کی نئی نسل سے ملت کی بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں۔ موجودہ حالات کا جواب بھی اس نئی نسل کے پاس ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنی حیثیت اور اپنی ذمہ داری کو سمجھ لے۔''

(**ڈاکٹر منور حسین فلاحی**، اداریہ ماہ نامہ رفیق منزل دسمبر ۱۹۸۹ء]

میرے منور بھائی!

محمد عرفان

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

منور بھائی سے میری ملاقات ۱۹۸۴ء میں علی گڑھ میں داخلہ لینے کے بعد ہی ہوگئی تھی کہ جہاں وہ شعبہ اردو میں ایم اے کے طالب علم تھے۔ساتھ ہی ایس آئی او اتر پردیش کے سکریٹری بھی تھے اور جاوید علی صاحب کے ساتھ پورے یوپی میں ایس آئی او کی سرگرمیوں کو منظّم کرنے اور تنظیم قائم کرنے کے لیے کوشاں تھے۔جاوید علی صاحب کے ایس آئی او کے سکریٹری جنرل بن جانے کے بعد وہ ایس آئی او یوپی کے صدر حلقہ بن گئے اور انہوں نے بہت محنت کر کے ایس آئی او کی شاخیں اتر پردیش میں قائم کیں۔

علی گڑھ کے قیام کے دوران دینی مدارس کے طلبہ سے ملاقات کا موقع ملا،مگر ان میں سے بیش تر کو وہاں کی زندگی سے مرعوب ہوکر وضع قطع اور لباس میں نمایاں تبدیلی دیکھی۔اس کی ایک بڑی وجہ خود علی گڑھ کا ماحول بھی تھا،جو تقسیم ہند کے بعد اشترا کی طلبہ اور اساتذہ کے زیر اثر پروان چڑھا۔مدارس کے ان طلبہ کو جو علی گڑھ کی زندگی اور ماحول سے متاثر ہورہے تھے مجھے دکھ ہوتا تھا کہ وہ یہاں کی زندگی کو متاثر کرنے کے بجائے خود مرعوبیت کا شکار ہوجاتے ہیں،مگر جن چندلوگوں کو اس ہنگام میں اپنی شناخت کے ساتھ دیکھا ان میں نمایاں ترین منور بھائی تھے۔ہمیشہ شیروانی،پاجامہ اور رامپوری ٹوپی میں وہ بہت پروقار لگتے تھے۔

مجھے یاد ہے منور بھائی ایڈہاک یونین کے صدر فرقان بھائی کے کمرے میں ایس ایس ہال نارتھ میں باب اسحاق کے بائیں طرف والے آخری کمرے میں رہتے تھے۔جہاں مجھ سمیت بہت سارے لوگ ان سے علمی استفادے کے لیے جاتے تھے۔منور بھائی نے خسرو صاحب کے آخری زمانہ اور پروفیسر شفیع صاحب کا زمانہ دیکھا تھا اور اس دور کی بدانتظامی کی وجہ سے وہ عام طلبہ کے علی الرغم سید حامد صاحب کے قدردان تھے۔

میرے منور بھائی!

یونی ورسٹی کے معاملات کے تعلق سے جب بھی ہم ان کی رائے لیتے وہ بہت جچا تلا تبصرہ کرتے، گرچہ اس وقت کئی بار ان کے تجزیے سے اختلاف ہوتا تھا مگر آج غور کرتا ہوں تو لگتا ہے ان کا مشورہ اصولوں اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو سامنے رکھ کر ہوتا تھا۔

منور بھائی سے آرٹس فیکلٹی میں جب وہ ایم اے کے طالب علم تھے گاہے بگاہے ملاقات ہوجاتی تھی۔ شعبہ اردو میں میرا کافی جانا ہوتا تھا۔ پروفیسر اصغر عباس صاحب سے میری بہت قربت تھی اور دوسرے اساتذہ سے بھی ملنا رہتا تھا اور شعبہ کے پروگراموں میں جو اکثر آرٹس فیکلٹی لانج یا روم نمبر ٦ میں ہوتا تھا خالی اوقات میں شریک ہوتا تھا۔

منور بھائی کا شعبہ اردو کے اساتذہ، ان کے علم، تقویٰ اور علمی لیاقت کی وجہ سے احترام کرتے تھے۔ جب ان کا ایم اے کا رزلٹ آیا تو نہ صرف انہوں نے ٹاپ کیا بلکہ شاید پرانے ریکارڈ کو بھی بہتر کیا۔ ان کی سنجیدگی اور صلاحیتوں کی وجہ سے شعبہ اردو کے سینئر اساتذہ ان کو اپنی زیر سرپرستی ریسرچ کرنا چاہتے تھے کہ منور بھائی نے JRF اسکالرشپ کے ساتھ پاس کیا تھا۔ شاید مظفر عباس نقوی صاحب جو ان دنوں شعبہ اردو کے سربراہ تھے نے ان کو اپنے ساتھ ریسرچ کرایا۔

منور بھائی نے جب JRF کوالیفائی کیا اس وقت یہ بڑی بات تھی کہ اس کے نتیجے میں قابل ذکر اسکالرشپ کے ساتھ یونی ورسٹی میں ملازمت کے حصول کے لیے یہ لازمی شرط قرار دی گئی تھی۔

منور بھائی جب ایس آئی او یوپی کے صدر سے سبک دوش ہوگئے تو ہم نے انہیں یونٹ کا صدر بنایا اور ان کی قیادت میں یونٹ کو مستحکم کرنے کی بہت ساری پہل کی گئی اور اسی پہل کے تحت اپنے ماہانہ تربیتی اجتماع بلند شہر میں جماعت کے زیر اثر مسجد میں رکھا جو تجربہ کافی کامیاب رہا کہ اس سے مقامی یونٹ کو بھی نیا ولولہ محسوس ہوا۔

منور بھائی سے میرا تحریک کی وجہ سے تعلق ہوا مگر وہ ذاتی بن گیا۔ عمر کے فرق کے باوجود میں شوخی سے ہر بات ان سے کرتا جس کا وہ مدلل اور نپے تلے انداز میں جواب دیتے۔ ایک بار جماعت کے تعلق سے میری تنقید کو رفع کرنے کے لیے ادارۂ تحقیق کے دفتر میں سابق امیر جماعت سید جلال الدین عمری صاحب سے بھی ملاقات کا اہتمام کیا۔ میں ان کے گھر میں گاہے بہ گاہے جاتا تھا اور ان کی ضیافت سے محظوظ ہوتا تھا۔ اپنی ذاتی زندگی کی اہم فیصلوں کے لیے بھی میں ان سے ملتا تھا اور وہ سوچ کر مجھے مناسب مشورے دیتے تھے۔ اسی تعلق

سے میں نے جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں ماسٹر میں ان کے علم کے بغیر داخلہ لے لیا، مگر ان سے مشورہ کیا تو انہوں نے دلیل سے مجھے قائل کر دیا اور داخلہ مکمل کرانے کے باوجود میں جے این یو نہیں گیا۔

۱۹۹۴ء میں اپنے گھریلو مسائل کے پیش نظر میں نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر خلیج آنے کا قصد کیا تو انہوں نے سختی سے منع کیا۔ مجھے اس وقت قابل ذکر اسکالرشپ ملتی تھی مگر میں نے ارادہ کرلیا تھا سو ان سے معذرت کرلی اور اپریل ۱۹۹۴ء میں دوبئ آ گیا۔

منور بھائی کو میں نے اصول پسند، اخلاق منداور وضع دار انسان کے طور پر دیکھا۔ ان کی گفتگو کا انداز اور لہجہ آج بھی میرے ذہن میں نقش ہے۔ وہ مختصر، نپی تلی اور مربوط بات کرتے تھے۔ ان کے دھیمے لہجے کی تقریر اوران کی تحریر کے بہت سارے مداح تھے۔ رفیق منزل ان کی ادارت میں بہت اعلیٰ معیار کا نکلنے لگا جو اس کی فائلوں میں محفوظ ہوگا۔

بھاگلپور کے میرے دوست عبدالباری نے جو ان کے شاگرد تھے یہ قصہ سنایا کہ منور بھائی فلاح سے فراغت کے بعد بھاگلپور کی درس گاہ میں استاد ہو گئے تھے اور ہر جمعرات کو اپنے گاؤں پیپرالطیف جاتے تھے۔ سو اس شام بچوں کے لیے مٹھائی لینے دکان میں گئے، جس کی وجہ سے بھٹو مرحوم کے حمایتی لوگوں نے یہ مضحکہ خیز خبر مشہور کی کہ جماعت کے لوگوں نے ان کی عدت پر مٹھائی خرید کر تقسیم کی۔

●۵●

ڈاکٹر منور حسین فلاحی

چند یادیں۔ چند باتیں

عبدالحق فلاحی

برادر منور حسین مرحوم کا جب خیال آتا ہے تو ان کے حسبِ حال یہ شعر بھی یاد آجاتا ہے:

خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری!

ایک سلیم الفطرت، نیک نفس، خاموش طبع، کم آمیز، متواضع، وضع دار اور خدا ترس شخصیت منور حسین کے نام سے عبارت تھی، جس کا ظاہر پُرسکون اور اندرون نورِ الٰہی سے منور تھا۔ مزاج میں نرمی، تحمل و بردباری، سلجھا ہوا ذہن اور اعتدال و توازن ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ افسوس کہ وہ ہمارے درمیان سے بہت جلد رخصت ہوگئے۔

بات کرنے کا انہیں بڑا سلیقہ تھا۔ یہ سلیقہ ان کی رائے مشورے، تجویز اور تحریر و انشاء میں بھی نمایاں تھا۔ مختلف اوقات میں انسان الگ الگ کیفیات میں ہوتا ہے۔ رنج و راحت اور خوشی و غم میں اس کے انداز و اطوار مختلف ہوتے ہیں۔ اندازِ گفتگو اور لب ولہجہ میں بھی فرق آجاتا ہے۔ مگر شکر ہے کہ ہمارے ممدوح جناب منور صاحب، حالات کے نشیب و فراز اور پیچ وخم کے باوجود ہمیشہ سلیقے سے گفتگو کرتے تھے۔ اور کبھی آپے سے باہر نہیں ہوتے تھے۔

نحیف و نزار جسم، ابھرتا ہوا قد، اِکہرا بدن، اے ایم یو کا نشانِ امتیاز شیروانی، ٹوپی، اور چہرے پر عینک ان کی پہچان تھی۔

سنجیدگی، وقار اور متانت ان کی زینت تھی۔ چہرے پر ہلکا سا تبسم ان کے وجود میں نکھار پیدا کر دیتا تھا۔ زندگی سادگی کا پیکر تھی۔ نمود و نمائش اور تصنع و ریا کاری جیسی کسی چیز سے بھی ان کی زندگی ناآشنا تھی۔ معاملات و تصرفات میں بھی ان کا یہ اسلوب نمایاں تھا۔ بزرگوں کا ادب واحترام اور خوردوں سے شفقت و محبت نے

انہیں اپنے ہم نشینوں میں ہر دل عزیز اور مقبول بنا دیا تھا۔

منور صاحب کا رہن سہن اور طرزِ بود و باش اور گھریلو زندگی، گاؤں جیسی سادہ تھی۔ بان کی چار پائی پر سونا بیٹھنا، گیس ختم ہو جانے پر لکڑی کا چولہا جلانا، معمولاتِ زندگی میں سے تھا۔ مرحوم کثیر العیال تھے۔ بیوی کے علاوہ پانچ بچوں کی پرورش و پرداخت اور دیکھ بھال ان کے ذمہ تھی۔ والدین (انوار الحق صاحب اور سیدہ خاتون صاحبہ) کے علاوہ اہلیہ پروین کوثر اور پانچ بچے اس شجرۂ طُوبیٰ کے برگ و بار تھے۔

اولاد میں دو بچے معذور بھی تھے۔ ایک ذہنی اعتبار سے اور دوسرا جسمانی طور پر۔ ان دونوں بچوں کی مستقل ذہنی اور جسمانی معذوری ان کے لیے بڑی صبر آزما اور سوہانِ روح تھی۔ تاہم صبر و شکر کے ساتھ زندگی گزر رہی تھی۔

منور صاحب کے پانچ بچوں میں تین (۳) لڑکیاں: (۱) ہاجرہ خاتون (۲) زَہرا خاتون (۳) نافعہ منور اور دو لڑکے تھے: (۴) معظم حسین اور (۵) اعظم حسین۔

خاندانی پس منظر

منور صاحب کا وطنِ مالوف پیر الطیف، مونگیر (بہار) کا ایک قصبہ تھا، جو کبھی ایک مردم خیز علاقہ تھا۔ خود ان کا خاندان بھی ایک علمی خاندان تھا۔ ان کے والد مرحوم انوار الحق صاحب جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے اور ذہنی و فکری طور سے اس تحریک سے وابستہ تھے۔ خود منور صاحب ایک ذی علم شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے ماموں جناب شکیل صاحب، مرزا غالب کالج، گیا کے پرنسپل تھے۔ (منور صاحب کی ایک بچی ان کے ماموں کے پاس رہ کر تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ ان کے ماموں ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ماموں سے ملنے ان کے پاس جایا کرتے تھے اور ماموں بھی علی گڑھ آتے تو ان سے مل کر جاتے)۔

شکیل صاحب ترقی کر کے بہار یونی ورسٹی، مظفر پور کے وائس چانسلر ہو گئے۔ عمر کے آخری حصہ میں جنوبی دہلی کے بٹلہ ہاؤس میں رہائش اختیار کی اور (غالباً) یہیں ان کا انتقال بھی ہوا۔ تقسیمِ ملک نے ہندوستان کا صرف جغرافیائی نقشہ ہی نہیں بدلا بلکہ بڑے پیمانے پر آبادیوں کا تبادلہ بھی ہوا اور یہاں کے اہل علم و فضل بھی پاکستان منتقل ہو گئے۔ شمالی ہند کے تقریباً تمام قصبات کی یہی صورت حال رہی۔ خود پیر الطیف کا بھی یہی حشر ہوا کہ مقامی آبادی اہلِ علم و فضل سے محروم ہو گئی۔ منور صاحب نے اپنے زہد و تقویٰ، علم و فضل اور پاکیزہ سیرت و کردار کے ذریعہ اس بستی کو پھر سے منور کرنے کی کوشش کی۔

جامعۃ الفلاح میں داخلہ

گاؤں کی ابتدائی تعلیم کے بعد منور حسین صاحب نے جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ کا رخ کیا۔ جہاں سے انھوں نے ۱۹۷۶ء میں اپنی دینی تعلیم مکمل کی اور سندِ عالمیت وفضیلت سے سرفراز ہوئے۔

اپنے پسندیدہ اخلاق وکردار کی وجہ سے وہ اپنے ہم چشموں اور طلبہ برادری میں ممتاز اور مقبول رہے اور ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے۔ اپنے مشفق ومہربان اساتذہ کی نظر میں بھی وہ عزیز تر رہے اور ان سے قریب رہے۔

جامعۃ الفلاح سے فراغت کے بعد وطن واپسی پر وہ جماعت اسلامی بھاگلپور کی درس گاہ میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ پھر انھیں مزید تعلیم حاصل کرنے کا شوق دامن گیر ہوا اور مقامی رفقاءِ جماعت کے مشورے پر انھوں نے علی گڑھ کا رخ کیا۔

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی میں داخلہ

علی گڑھ پہنچ کر انھوں نے ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور میں دوسالہ تصنیفی تربیت کے کورس میں اگست ۱۹۹۱ء میں داخلہ لیا۔ جس کی صدارت وسرپرستی مولانا سید جلال الدین عمری صاحب فرمارہے تھے۔

اپنی محنت، کارکردگی اور عمدہ صلاحیت کے باعث انھوں نے مولانا کا اعتماد حاصل کیا اور مولانا کی زیر ادارت شائع ہونے والے رسالوں: ماہنامہ زندگی، اور 'سہ ماہی تحقیقات اسلامی' کے لیے ادارے میں موصول ہونے والے مضامین ومقالات پر نظر ثانی کرکے انہیں مرتب کرنے کی ذمہ داری انہیں سونپ دی گئی۔ تصنیفی تربیت کے لیے داخلہ لینے والے طلبہ اگرچہ براہ راست مولانا سید جلال الدین صاحب کے کنٹرول میں تھے مگر عملاً ان کی دیکھ بھال اور رہنمائی منور صاحب ہی کرتے رہے۔

اس دوران منور صاحب کے ذمہ کچھ انتظامی کام بھی سپرد کیے گئے۔ مثلاً دھرہ، نبی نگر میں ادارۂ تحقیق کی زیر تعمیر نئی بلڈنگ (آفس رکیمپس) وغیرہ کی نگرانی اور دیکھ بھال۔ چنانچہ انھوں نے اس کی ذمہ داری بھی بحسن وخوبی نبھائی۔

دوسالہ تصنیفی تربیت کے لیے اس ادارے میں جو طلبہ بھی داخلہ لیتے ہیں انھیں لکھنے کے لیے ایک موضوع دیا جاتا ہے جسے مکمل کرکے انہیں ادارے کے حوالے کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ منور صاحب کو بھی لکھنے کے لیے ایک

موضوع دیا گیا تھا مگر غالباً مشاغل کی کثرت کی وجہ سے اس پر زیادہ توجہ نہ کر سکے اور وہ کام ادھورا رہ گیا۔

منور صاحب مرحوم کے دو بچے پیدائشی معذور تھے۔ ایک ذہنی طور سے اور دوسرا جسمانی اعتبار سے۔ جس کے لیے وہ فکر مند رہا کرتے تھے۔ ممکن ہے، دفتر کی علمی اور انتظامی مصروفیات کے علاوہ گھریلو مسائل مفوضہ کام کی تکمیل میں سدّ راہ بنے ہوں۔ (واللہ اعلم)

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں داخلہ

منور حسین صاحب نے 'ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی' میں تصنیفی تربیت کے دو سال مکمل ہونے پر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں بی۔ اے۔ (اردو) میں داخلہ لے لیا تھا۔ یہیں سے انھوں نے ایم۔ اے اور ۱۹۹۲ء میں 'اردو میں علمی نثر (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء): سماجی علوم کے حوالے سے' کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی۔ اس کے بعد انھیں یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر شپ کی ملازمت بھی مل گئی۔ لیکن اس کے بعد بھی وہ ادارۂ تحقیق سے جزوی طور پر وابستہ رہے۔

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی صاحب جو ادارۂ تحقیق سے طویل عرصہ تک وابستہ رہے ہیں، کا بیان ہے:

''۲۷ ستمبر ۱۹۹۳ء کو ادارۂ تحقیق کی منتظمہ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس کی روداد میں درج ہے کہ ادارۂ تحقیق سے علیحدگی کے بعد منور صاحب کی جز وقتی خدمات ادارۂ تحقیق کو حاصل ہیں۔''

ان جزوی خدمات کے صلے میں انھیں ادارۂ تحقیق کے کیمپس میں ایک فیملی کوارٹر مل گیا تھا، جس میں وہ بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔

منور صاحب کی علمی سرگرمیاں

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی علی گڑھ میں دو سالہ تصنیفی تربیت کے کورس میں داخلہ لینے اور علی گڑھ یونی ورسٹی میں ملازمت کے دوران ادارۂ تحقیق میں دو سال مزید جز وقتی خدمت انجام دینے کے حوالے سے گزشتہ صفحات میں یہ بات آ چکی ہے کہ منور صاحب نے اس چار سالہ وابستگی کے دوران ادارۂ تحقیق میں علمی اور انتظامی دونوں سطحوں پر خدمات انجام دیں۔ ایک طرف تو ادارے میں داخل ریسرچ اسکالرس کی رہنمائی اور ان کے مقالات پر نظر ثانی کی خدمت انجام دیتے رہے تو دوسری طرف مجلّہ تحقیقات اسلامی اور ماہنامہ زندگی میں اشاعت کے لیے موصول ہونے والے مقالات بھی چیک کر کے یہ رسالے مرتب کرتے رہے اور تیسری

طرف ادارہ میں تبصرے کے لیے موصول ہونے والی نئی مطبوعات پر تبصرے بھی کرتے رہے۔

ان کے علاوہ مختلف علمی، ادبی، تحریکی اور تحقیقی رسائل وجرائد اُن کی قلمی سرگرمیوں کی جولان گاہ بنے رہے۔ نوجوانوں اور طلبہ کے معروف اور مقبول ماہنامہ رفیق منزل، نئی دہلی کی ادارت کے فرائض ۳ سال تک انھوں نے انجام دیے۔ اس دوران اُن کی ایک قابل ذکر کاوش ''مولانا افضل حسینؒ۔ حیات وخدمات'' اشاعت خاص منظر عام پر آئی جو کہ افضل حسین مرحوم، سابق قیم (سکریٹری جنرل) جماعت اسلامی ہند کی حیات وخدمات پر ایک وقیع اور معیاری دستاویز ہے۔ یہ خاص دستاویزی نمبر رسالہ کے جلد ۳، شمارہ ۱۰، ماہ ستمبر ۱۹۹۰ء کے ۱۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

منور صاحب کے دیرینہ رفیق ودم ساز اور مخلص تحریکی ساتھی جناب جاوید علی صاحب (سابق صدر حلقہ ایس آئی او، یو۔ پی) نے ایک ملاقات میں ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

''وہ (منور صاحب) اردو کی ڈرافٹنگ بہت اچھی کرتے تھے۔''

اس کا عملی ثبوت وہ تحریریں ہیں جو مختلف رسالوں اور کتابوں میں بکھری پڑی ہیں۔ منور صاحب کی ایک تحریر ''مشتے نموز از خروارے''، ہم ماہنامہ رفیق منزل کے ''افضل حسین نمبر'' سے نقل کررہے ہیں جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے:

''اللہ کا احسان ہے جس کی توفیق سے ہم تاخیر سے سہی، یہ خصوصی نمبر پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں۔ ہمیں جو قلم کار میسر آئے، انھوں نے جتنی متنوع حیثیتوں سے موصوف کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے وہ مطالعہ کے لیے حاضر ہے۔ یہ دعویٰ درست نہیں ہوگا کہ ان کی زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ بیشتر حصے سامنے آگئے ہیں۔ اس (خاص) نمبر سے ہمارے قارئین کے ذہنوں میں متعدد سوالات کا قائم ہونا بھی بجا ہے۔ مثلا یہ کہ ان کی تصانیف کی صحیح تعداد کیا وہی ہے جس کا ذکر اس خاص نمبر میں بالتفصیل آیا ہے یا کچھ اور؟ اسی طرح انھوں نے L.T. (یہ ڈگری اب چلن میں نہیں ہے۔ آج کل کی مروجہ اور معروف ڈگری B.Ed اس کا متبادل ہے۔ ع۔ ج۔ ف) کی ڈگری علی گڑھ سے حاصل کی یا الہ آباد سے یا پھر آگرہ سے؟ اس خاص شمارے کے لیے جن افراد کا خصوصی تعاون ہمیں حاصل ہوا اُن میں ڈاکٹر عمر افضل صاحب امریکہ، سرفہرست ہیں کہ انہوں نے محض ایک درخواست پر متعدد چیزیں ارسال فرمائیں۔ ان کے دعوے کے مطابق بعض اور چیزیں ان کی طرف سے ہمیں ملنی تھیں مگر وہ نامعلوم اسباب کی بنا پر ہم تک نہیں پہنچ سکیں۔ تاہم ان کے موجودہ تعاون پر ہم ان کے بے انتہا

ممنون ہیں۔

برادر اسرار عالم صاحب (ریڈینس) کا علمی مضمون اس شمارے سے راست تعلق نہ رکھتے ہوئے بھی خصوصی تذکرے کا مستحق ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے بعض احباب کو اس کی اشاعت ناگوارِ خاطر ہو۔ مگر افکار وخیالات کی دنیا میں علمی بحث وتمحیص ہی وہ طریقہ کار ہے جس سے صحیح نتیجے تک پہنچنا اور متعدد رائج نظریات وتصورات میں کارآمد اور مفید وبرحق تصورات کا امتیاز ممکن ہوتا ہے۔ ہمیں یقینِ واثق ہے کہ اس مضمون کی بنیاد پر جس گفتگو کا آغاز ہوگا وہ کسی مفید نتیجہ تک ہمیں پہنچائے گا۔

ان کے علاوہ ہمارے بہت سے بزرگ اور احباب ہیں جنھوں نے براہ راست یا بالواسطہ ہمیں تعاون دیا ہے۔ ہم ان سب کے بے انتہا ممنون ہیں اور اللہ سے ان کے لیے جزائے خیر کی دعا کرتے ہیں۔

اس شمارے سے اگر ہمارے اندر قیم صاحب مرحوم کی خوبیوں میں سے کوئی خوبی پیدا ہوسکی یا ہمیں اس کا علمی فائدہ پہنچتا ہے تو یہ اس شمارے کی کامیابی کی ضمانت ہے ورنہ کارِ عبث ہے۔ اپنے تمام قارئین کی گراں قدر آراء کا شدت سے انتظار ہے۔ اپنے طور پر اس کا اعتراف بیجا بھی نہیں ہے کہ اس نمبر کو جس بہتر شکل میں پیش کرنا چاہیے تھا ہم نہیں کر سکے۔

دعا ہے کہ اللہ اسے ہم سب کے حق میں مفید ہی بنائے اور مضر پہلوؤں سے ہماری حفاظت فرمائے۔''

(خاص نمبر ماہنامہ رفیق منزل نئی دہلی ''مولانا افضل حسین۔ حیات وخدمات''، ستمبر ۱۹۹۰ء کا اداریہ)

اوپر منور صاحب کی جو تحریر بطور نمونہ نقل کی گئی ہے اسے غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غایت درجہ احتیاط وتوازن کے ساتھ لکھی گئی یہ تحریر انشا پردازی کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس سے مدیر رسالہ کی دیانت داری اور ایمان داری وثقاہت اور احساسِ ذمہ داری کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے مرحوم منور صاحب کا عجز وانکسار بھی مترشح ہوتا ہے جو کہ کردار کی بلندی اور قلب ونظر کی پاکیزگی اور صفائی کی دلیل ہے ورنہ ''ہم چو ما دیگرے نیست'' کے زعم میں بہتیرے لوگ مبتلا نظر آتے ہیں جنھیں کوئی چھوٹا یا بڑا منصب ومقام حاصل ہوجاتا ہے۔

جناب اَسرار عالم صاحب (سابق سب ایڈیٹر ریڈینس ویکلی) نے پرانی یادوں کے اوراق الٹتے ہوئے کہا کہ جب منور صاحب کو کہیں سے معلوم ہوا کہ میں نے کوئی سلسلہ مضامین لکھا ہے تو وہ علی گڑھ سے دہلی آئے اور اس امر کی تصدیق کرنا چاہی تو میں نے اثبات میں جواب دیا مگر یہ بھی کہا کہ یہ مضامین آپ نہ لے

جائیں ورنہ آپ کو خِفّت اٹھانی پڑے گی اور آپ کہیں گے کہ میں اسے شائع نہیں کرسکتا۔ انھوں نے کہا کہ دیجیے میں اسے شائع کروں گا۔ میں نے کہا کہ پہلے آپ ایک مضمون لے جایئے، جب آپ اسے شائع کرلیں گے تب میں دوسرا سلسلۂ مضمون دوں گا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب 'ماہنامہ زندگی نو' مرتب کرنے کی ذمہ داری عملاً انہی کے سرتھی۔ مولانا جلال الدین صاحب اداریہ وغیرہ لکھ دیا کرتے تھے۔ بالآخر اللہ کے بندے نے وہ مضمون (ماہنامہ) زندگی میں شائع کردیا۔ اس کے بعد ہنگامہ ہوا اور مرکز نے فوراً سنسر شپ نافذ کردیا۔''

آگے وہ مزید کہتے ہیں: اس کے بعد دو واقعات ہوئے:

چوں کہ منور صاحب متحمل مزاج تھے۔ اس لیے ان کو بالکل سبک دوش تو نہیں کیا گیا البتہ اب وہ کلی اختیار کے مالک نہیں رہے۔

دوسری طرف یہ ہوا کہ وہ متعلقہ شمارہ دنیا میں جہاں بھی گیا اس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ روزنامہ جسارت کے کراچی اور راول پنڈی ایڈیشنوں میں وہ مضمون دوبارہ شائع ہوا۔ عنوان تھا: ''معرکۂ خلیج''۔ یاد رہے، پہلی خلیجی جنگ جنوری۔ فروری ۱۹۹۲ء میں ہوئی تھی۔

بعض احباب سے معلوم ہوا ہے کہ یادگارِ سرسید ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ میں مشہور ادیب اور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے شائع کردہ مقالے پر منور صاحب مرحوم نے خاصا تعاقب اور تجزیہ کیا اور اس کی فروگزاشتوں کی متعینہ طور پر نشاندہی کی۔

اسی طرح وہ نئی دہلی سے شائع ہونے والے معروف علمی و ادبی سہ ماہی رسالے، اردو بک ریویو میں نئی مطبوعات پر برابر تبصرے کرتے رہے۔ منور صاحب مرحوم نے اپنے پیچھے ایک علمی یادگار ''مولوی چراغ علی۔ حیات وخدمات'' چھوڑی، جسے خدابخش اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ نے شائع کیا ہے۔

اردو ادب اور تاریخ سے منور حسین صاحب مرحوم کی گہری دل چسپی کی مظہر اُن کی تھیسس (Thesis) ''اردو میں علمی نثر ۱۹۱۴۔۱۸۵۷ء (سماجی علوم کے حوالے سے)'' ہے۔ جس پر ملک کی مایۂ ناز علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی۔ اس تحقیقی کتاب کو براؤن بکس علی گڑھ نے شائع کیا ہے۔ جس کی سپلائی اور تقسیم Amazon Portal پر دست یاب ہے۔

جائزہ اور احتساب کی ضرورت

اسلام پسند طلبہ اور نوجوانوں کی اس تنظیم کی تشکیل پر تقریباً چالیس (۴۰) سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ انسانی زندگی میں چالیس سال کا عرصہ معنے رکھتا ہے اور یہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر عقل وفکر میں پختگی اور اسی کے ساتھ سنجیدگی بھی آ جاتی ہے۔ انسان کو اپنے اچھے برے کا فیصلہ کرنے اور اس کا تجربہ کرنے کا شعور اور تمیز آ جاتی ہے۔ کیریئر بلڈنگ، تعلیم، شادی بیاہ، روزی روزگار اور ذریعۂ معاش کی سیٹنگ سے وہ بڑی حد تک فارغ ہو چکا ہوتا ہے۔ اس چالیس سالہ سفر کے پڑاؤ پر پہنچ کر خود ایس۔ آئی۔ او۔ کے فارغین اور تحریک اسلامی کے سرپرستوں، رہنماؤں اور اصحاب فکر ونظر کو اس کا گہرائی سے جائزہ لینا چاہیے اور تجزیہ کرنا چاہیے کہ اس طلبہ تنظیم کی تاسیس اور تشکیل کے وقت ہمارے بانیان نے جو حسین خواب دیکھا تھا اور جس عظیم مقصد کے لیے طلبہ اور نوجوانوں کی ذہنی وفکری آبیاری کی گئی تھی وہ مقصد پورا ہوتا نظر آ رہا ہے یا نہیں! اس ہدف پر پہنچنے میں کتنے فیصد کامیابی ملی؟ درمیانی مرحلے میں کیا نشیب وفراز آئے اور کتنی اور کس کس نوعیت کی رکاوٹیں اور آزمائشیں حائل ہوئیں۔ ہدف کو چھونے میں کیا اسباب وعوامل مانع راہ بنے اور اس سے بسلامت گزر جانے کے لیے ہمارے قائدین اور پالیسی سازوں نے کیا منصوبہ بندی کی؟ اس طویل المعیاد منصوبہ کو زیرِ عمل لانے میں جو وقت، انرجی اور سرمایہ لگا اس کا اس کے حاصل شدہ فائدے اور نتیجے سے موازنہ بھی کیا جانا چاہیے۔

یہ وہ عمر اور منزل ہے جس کا اعتبار خود کتاب الٰہی (قرآن مجید) نے کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

...... حَتَّى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ: رَبِّ أَوْزِعْنِيْ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحاً تَرْضَاهُ، وَأَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ، إِنِّيْ تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ. أُوْلَئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِيْ أَصْحَابِ الْجَنَّةِ، وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوا يُوعَدُوْن. (الاحقاف:۱۵۔۱۶)

’’یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا تو اس نے کہا: ’’اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو، اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے۔ میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابعِ فرمان بندوں میں

سے ہوں۔اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں۔ یہ جنتی لوگوں میں شامل ہوں گے اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جا تا رہا ہے۔''

'السابقون الاولون' نے جماعت کی مرکزی قیادت سنبھالی

تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود یہ امر واقعہ ہے کہ تحریک اسلامی ہند کا لگایا ہوا یہ پودا، اب بحمد للہ ایک شجر سایہ دار بن چکا ہے۔اس کے برگ و بار نظر آنے لگے ہیں۔اس کے دورِاول کے فارغین نے جماعت اسلامی کی مرکزی قیادت کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔الحمدللہ، یہ سبھی مخلص اور ایثار پیشہ لوگ ہیں جو باستثناء چند بے غرض اور بلا معاوضہ ملک وملت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔آج کے مادہ پرستانہ دور میں یہ ایک ایسی کوالٹی ہے جو اَب شے نایاب بنتی جارہی ہے۔ جماعتیں، تنظیمیں، این جی اوز اور ادارے خواہ خالص دینی ہوں یا سماجی، ملی اور سیاسی۔ دیکھنے میں بھلے ہی خدمت فی سبیل اللہ انجام دے رہے ہوں مگر حقیقتِ نفس الامری اس کے برعکس ہے۔عیاں راچہ بیاں!

منور صاحب مرحوم طلبہ اور نوجوانوں کے اس قافلے سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے ایک عظیم مقصد کے لیے اس تنظیم میں شمولیت اختیار کی اور تاحیات اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کرتے رہے۔اس تنظیمی خدمت کا انھوں نے کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ یہ خدمت للہ و فی اللہ تھی۔

آج کی تاریخ میں اس اسلامی تنظیم کے پروردہ جو لوگ تحریک اسلامی ہند کی اعلیٰ قیادت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں اور ایثار و قربانی کی اعلیٰ مثال پیش کررہے ہیں، ہم بطورنمونہ چند نام یہاں پیش کررہے ہیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

طلبہ تنظیم کا قیام جماعت کے پیش نظر شروع ہی سے تھا

برادر منور حسین صاحب مرحوم کی تنظیمی سرگرمیوں کے حوالے سے اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیاSIO کے سلسلہ میں پیچھے تفصیل گزرچکی ہے۔ اب اس کے اختتام پر یہ بتانا مقصود ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں جماعت اسلامی نے طلبہ تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔کیوں کہ جماعت کی ہمہ جہتی دعوت کے پروگرام میں طلبہ برادری کو کسی طرح نظرانداز کرنا ممکن نہ تھا۔

چنانچہ جماعت اسلامی کے اولین ابتدائی مرکز دارالاسلام پٹھان کوٹ (پنجاب) میں ۱۹۴۶ء سے لے

کر تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء تک مسلسل اس موضوع پر غور وفکر ہوتا رہا۔ ہم یہاں ایس۔آئی۔او۔کے آفیشیل لٹریچر (منزل کی اور ایس آئی او کا سفر (ہندی میں لکھا ہے،) سے اس کی مختصر تفصیل پیش کر رہے ہیں۔ اسلام پسند طلبہ تنظیموں کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک اہم دستاویزی مواد ہے۔

طلبہ تنظیم کے لیے کوشش: ایمرجنسی سے قبل

☆۱۹۴۶ء دارالاسلام پٹھان کوٹ میں طلبہ تنظیم سے متعلق معاملات ومسائل پر غور کرنے کے لیے ایک میٹنگ منعقد کرنے کا فیصلہ۔

☆۱۹۵۶ء: جماعت کے چار سالہ میقاتی پروگرام میں طلبہ کے الگ حلقوں کی سفارش اور اس کے تحت طلبہ کے مختلف حلقوں کا قیام۔

☆۱۹۵۶ء: اے۔ایم۔یو۔کی حد تک ایک طلبہ تنظیم کا قیام۔

☆۱۹۶۰ء: کی دہائی میں: مختلف ریاستوں میں اسلامی طلبہ تنظیموں کا قیام۔

☆۱۹۷۴ء: جماعت اسلامی ہند کی مرکزی شوریٰ میں کل ہند طلبہ تنظیم کے قیام پر غور وخوض۔

بحوالہ: منزل کی اور ایس آئی او کا سفر، پرسٹھ ۵۔

ایس۔آئی۔او۔کی تربیت یافتہ نسل، جماعت اسلامی ہند کی قیادت کے منصب پر فائز

نمبر شمار	اسمائے گرامی	موجودہ منصب	ایس آئی میں سابقہ منصب	مدت کار
۱	سید سعادت اللہ حسینی	امیر جماعت اسلامی ہند	کل ہند صدر ایس آئی او	۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۰ء
۲	جناب محمد جعفر	نائب امیر جماعت	کل ہند صدر	۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۵ء
۳	ایس امین الحسن	نائب امیر جماعت	کل ہند صدر	۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۳ء
۴	انجینئر محمد سلیم	نائب امیر جماعت	صدر حلقہ راجستھان	۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۳ء
۵	جناب محمد اقبال ملاّ	سکریٹری شعبۂ دعوت	صدر حلقہ کرناٹک	۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۵ء
۶	جناب ملک معتصم خاں	سکریٹری شعبۂ ملی امور	کل ہند صدر ایس۔آئی۔او۔	۱۹۹۵ء تا ۱۹۹۷ء
۷	جناب محی الدین شاکر	سکریٹری شعبۂ مالیات	صدر ایس۔ آئی۔ او۔ شہر حیدرآباد ممبر مرکزی مجلسِ شوری CAC، فاؤنڈر ممبر SIO	۱۹۹۳ء

۸	جناب عزیز محی الدین	سکریٹری شعبہ تنظیم	ممبر مرکزی مجلسِ شوریٰ صدر حلقہ مہاراشٹر	دوسری، تیسری اور چوتھی میقات
۹	جناب ولی اللہ سعیدی	سکریٹری شعبۂ تربیت	سکریٹری جنرل SIO	۱۹۹۷ء تا ۱۹۹۸ء
۱۰	جناب محی الدین غازی	سکریٹری شعبۂ تصنیفی اکیڈمی	سکریٹری SIO	۲۰۰۳ء۔۲۰۰۴
۱۱	جناب ڈاکٹر حسن رضا	چیرمین انڈین انسی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز	بانی حلقہ طلبۂ اسلامی بہار	۱۹۶۶ء۔۱۹۶۷ء ۱۹۷۱ء
۱۲	جناب محمد نیر	اسسٹنٹ سکریٹری برائے خصوصی توجہ	صدر حلقہ مغربی بنگال	۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۵ء

نوٹ:

۱۔ مذکورہ سبھی حضرات اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا SIO کا پس منظر رکھتے ہیں۔

۲۔ جن ناموں پر اسٹار لگا ہوا ہے یہ سبھی حضرات مرکز جماعت میں خدمت انجام دے رہے ہیں۔

جماعت اسلامی ہند کی مرکزی قیادت میں ایس۔ آئی۔ او۔ کے سابق ذمہ داروں کی شمولیت اور ان کی تفصیلات حاصل کرنے کے لیے میں نے متعدد اصحاب سے بالمشافہ ملاقاتیں کیں۔ فون پر بھی رابطہ قائم کیا اوران کا تحریری بیان بھی حاصل کیا۔

چنانچہ محترم ڈاکٹر حسن رضا صاحب کے اس انکشاف پر میں دنگ رہ گیا کہ ریاست بہار میں حلقۂ طلبہ اسلامی کی تشکیل سے پہلے بھی اسلام پسند طلبہ کو متحد و منظّم کرنے اوران کے سامنے دین کی دعوت پیش کرنے کا کام ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم، امیر مقامی پٹنہ کی ہدایت پر ڈاکٹر حسن رضا صاحب نے شروع کر دیا تھا۔ اور یہ کام 'حلقہ طلبہ متفقین جماعت اسلامی' کے نام سے ۱۹۶۶۔۱۹۶۷ء میں چل رہا تھا۔ ان کے بتانے کے مطابق اس وقت موصوف اس ابتدائی طلبہ تنظیم کے محرک (Mentor) تھے۔

قارئین کے اطمینان کے لیے ہم ڈاکٹر حسن رضا صاحب کا تحریری بیان یہاں نقل کر رہے ہیں:

''جس طرح آل انڈیا ایس۔ آئی۔ او۔ کے قیام سے پہلے ریاستی سطح پر (حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے نام سے) طلبہ میں کام شروع ہوا تھا اسی طرح ملک کے اہم شہروں میں طلبہ کی تنظیم قائم ہوئی۔ چنانچہ بہار میں پٹنہ میں 'حلقۂ طلبہ متفقینِ جماعت اسلامی' کا قیام ہم لوگوں نے ۱۹۶۶ء۔۱۹۶۷ء میں کیا اور پھر حلقۂ طلبۂ متفقین جماعت اسلامی، پٹنہ کی انتخابی نشست میں میری تجویز پر مولانا محمود عالم صاحب کو ناظم حلقہ بنایا گیا، جواس وقت مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ

میں عالمیت کے اسٹوڈنٹ تھے۔جنھیں میں ہی تحریک میں لایا تھا۔‘‘

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ مرحوم (اس وقت) امیر مقامی پٹنہ تھے اور وہی مربی تھے۔ پھر ہم لوگوں نے بہار کے دوسرے شہروں میں مثلاً بہار شریف اور دربھنگہ میں اسی طرح طلبہ کی تنظیم قائم کی۔ ۱۹۷۱ء میں جب ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب امیر حلقہ بہار مقرر ہوئے تب حلقۂ طلبہ اسلامی بہار قائم ہوئی، جس کے پہلے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر جاوید اختر صاحب مقرر ہوئے۔‘‘

تنظیم کے بحرانی دور میں ڈاکٹر منور حسین کی سلامت روی

ایس۔ آئی۔ او کے ایک اور سابق ذمہ دار (صدر حلقہ بہار) جناب شفیق الرحمٰن صاحب (سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر سہ روزہ دعوت) کا بیان ہے کہ تنظیم میں منور صاحب کی (حلقہ یوپی میں) سکریٹری شپ کا زمانہ بحرانی دور تھا۔‘‘

اس بحران کی تصدیق بانیٔ صدرِ تنظیم محمد جعفر صاحب نے بھی کی ہے۔ اس وقت جاوید علی، صدر حلقہ یو۔ پی تھے۔ صدرِ حلقہ اور شوریٰ میں کسی مسئلے میں اختلاف ہو گیا تھا اور اس اختلاف کی نوعیت بہت سنگین ہو گئی تھی۔ اطلاعات کے مطابق ZAC کے بعض اہم ممبران اس اختلاف کو ہوا دینے میں اہم رول ادا کر رہے تھے۔ خود شوریٰ میں دو گروپ ہو گئے تھے۔ ایک گروپ نے ڈاکٹر منور حسین کی صدارت میں مشاورتی کونسل (شوریٰ ZAC) کا اجلاس کرنا چاہا، مگر منور صاحب اس کے لیے آمادہ نہ ہوئے اور انھوں نے معذرت کر دی۔

اس واقعہ سے مرحوم منور صاحب کی فکری سلامت روی اور شرافتِ نفسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ شفیق الرحمٰن صاحب کا احساس ہے کہ عام طور پر تنظیمی حالات اور تغیرات کا صحیح تجزیہ (Assesment) نہیں ہو پاتا۔ اس لیے پسِ پردہ سرگرمیوں (Undercurrents) کو زیرِ بحث لانا چاہیے۔

ہم اس پر کچھ تبصرہ کرنے کے بجائے خود شفیق صاحب کے ایک تحریری بیان کو یہاں نقل کر رہے ہیں، جو بہت ادبی انداز میں لکھا گیا ہے۔ شفیق صاحب بیرونِ دہلی سفر پر تھے۔ اس لیے انھوں نے یہ تحریر واٹس ایپ پر بھیجی۔ موصوف لکھتے ہیں:

چوں می گویم مسلمانم بہ لرزم
کہ دانم مشکلاتِ لاالٰہ را

مشتاق یوسفی نے ’’ایک شام۔ نظر امروہوی کے نام‘‘ میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا:

’’ان کے رکھ رکھاؤ اور لہجے میں ایک مٹتی ہوئی، ایک رخصت ہوتی ہوئی تہذیب کا لوچ، نکھار اور رچاؤ

ہے جس کا انھیں خود بھی احساس ہے۔

دلوں پہ نقش رہے گا مرے زمانے کا
میں اختتام ہوں ایک عہد کے فسانے کا

حضرات! وہ سانچے جن میں ایسی شخصیتیں اور انوکھے، البیلے کردار ڈھلتے تھے، گردشِ دوراں کے ہاتھوں شکست وریخت کی نذر ہو گئے۔

ہمارے بعد نہ آئے گا کوئی ہم جیسا
ہم ایسے خاک نشینوں کا احترام کرو

جان ایلیا کی ایک بہت خوب صورت غزل کا ایک بہت خوب صورت شعر ہے:

وفا اخلاص، قربانی، محبت
اب ان لفظوں کا کیوں پیچھا کریں ہم!

لیکن منور صاحب جیسے لوگوں کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنے کا جی چاہتا ہے کہ ان میں زندگی کی رمق باقی ہے۔ ان کی معنویت ابھی پوری طرح گم نہیں ہوئی ہے۔ اگر ان کی آبیاری کی جائے تو خزاں کو اس دورِ بہار سے ایک بار پھر معطر کیا جا سکتا ہے۔''

فارغینِ فلاح کی تنظیم انجمن طلبۂ قدیم سے وابستگی

منور صاحب کے انتقال کے بعد مدیرِ حیات نو جناب انیس احمد مدنی نے اپنے اداریہ میں انھیں اس طرح یاد کیا:

> ''(منور صاحب) انجمن طلبۂ قدیم کی شوریٰ کے بھی متعدد بار رکن رہے اور انجمن کی تعمیر وترقی میں آپ کا زبردست رول رہا۔ جب جب انجمن نے یا انجمن کی کسی یونٹ نے آپ کو یاد کیا، آپ اپنی تمام مصروفیتوں کو چھوڑ کر جامعہ تشریف لائے اور اس کے منصوبوں کو روبہ عمل لانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔'' (حیات نو، اکتوبر ۲۰۰۰ء)

تعلق باللہ اور زہد وتقویٰ

منور صاحب اُن رسمی معنوں میں عابد وزاہد نہیں تھے جو خانقاہی شریعت میں معلوم ومعروف ہے بلکہ وہ سادگی وپُرکاری کا حَسین پیکر تھے۔ جس میں انسانی شرافت، وضع داری اور خاک ساری، اخلاص

وللّٰہیت، تقوی و پرہیز گاری، بندگان خدا سے بے لوث محبت، اللہ کے ذکر وفکر میں انہماک، نماز روزے کا اہتمام، خداترسی، اسلامی آداب اور احکام کی بجا آوری اور شعائر اسلامی کا احترام۔ سب کچھ جلوہ گر تھا۔ وہ ذاکر اور شاغل تھے اور سفر وحضر میں قلب ولسان، ذکر وفکر سے معمور اور نورِ الٰہی سے منور رہتا تھا۔

اخلاق وعادات

سماج میں رہ کر دوست احباب، ہم نشینوں، ہم چشموں، پڑوسیوں، اسکول کالج کے طلبہ واساتذہ وغیرہ سے رشتے بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ کسی کا معمولی سا حسنِ سلوک، تاحیات دوستی اور احسان شناسی میں بدل دیتا ہے اور کبھی مدتوں کی آشنائی اور دوستی لمحوں میں مزا کرکرا کر دیتی ہے اور زندگی بھر کے لیے تعلقات میں کڑواہٹ گھول دیتی ہے۔ ایسے حالات میں بقول غالب:

ایسا بھی ہے کوئی جسے اچھا کہیں سبھی؟

جی ہاں، ہمارے ممدوح جناب منور حسین صاحب کچھ ایسی ہی شخصیت کے حامل تھے جنھیں سبھی لوگوں نے بِلا ادنیٰ تامل اچھا کہا اور دل کھول کر تعریف کی۔ میں نے قریب ایک درجن لوگوں سے ملاقاتیں کیں، فون پر رابطے قائم کیے اور ان سب کا ایک مشترک تاثر تھا: ''وہ بہت نیک اور شریف انسان تھے۔'' ہم ان لوگوں کی ایک علیحدہ سے فہرست بھی دے رہے ہیں جن سے بالمشافہ مل کر منور صاحب کے حالات وواقعات معلوم کیے۔ فون پر ان کی سیرت وکردار اور عمومی تعارف حاصل کیا۔ منور صاحب مرحوم فی الواقع ایک شریف النفس انسان تھے۔ ایسے انسان جن کے بارے میں کہا جاتا ہے:

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

خود منور صاحب کے نام سے بھی اس صفت کا اظہار ہوتا ہے، جو ان کی نمایاں خصوصیت تھی۔ وہ اسم بامسمّٰی تھے۔ ان کی شخصیت ان کے نورِ قلب سے منور تھی۔

تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ انسان کے نام کا اثر اس کی شخصیت پر پڑتا ہے۔ اس کا مستقبل اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اگر کوئی یوسف ہے تو صبر وتحمل، بردباری اور عفوودرگزر اس کی سرشت میں پیوست ہو جاتا ہے، جو تاحیات اس کے ساتھ لگا رہتا ہے۔

شاعرِ تحریک حفیظ میرٹھی نے کیا خوب کہا ہے:

اس سے ذہنوں کی بلندی کا پتہ چلتا ہے
نام تم بچوں کے اپنے مہ واختر رکھنا

زبانِ خلق (دوست احباب، معاصرین اور بزرگوں کے تاثرات)

آیئے! زبانِ خلق کا مشاہدہ کریں کہ لوگ منور صاحب کے بارے میں کیا سوچتے اور کیا کہتے ہیں:

استاذ ذوق نے کہا ہے: زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔

ا۔''منور حسین صاحب بہت نیک آدمی تھے۔''(جناب محمد جعفر صاحب، بانی صدر ایس آئی او، نائب امیر جماعتِ اسلامی ہند)

۲۔''منور صاحب بہت شریف النفس انسان تھے۔''(جناب انعام اللہ فلاحی، معاون شعبۂ تعلیم مرکز جماعت اسلامی ہند، سابق سکریٹری ایس۔آئی۔او۔حلقہ یوپی)

۳۔''منور صاحب بہت تحمل والے، وضعدار شخصیت کے مالک تھے۔ بات کرنے کا انھیں سلیقہ تھا۔ وہ ہمیشہ سلیقے سے گفتگو کرتے تھے۔ وہ ذی علم شخصیت کے مالک تھے اور بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔''(اسرار عالم، صاحب سابق سب ایڈیٹر ریڈینس ویوز ویکلی، نئی دہلی)

۴۔''بہت نیک دل اور دل نواز شخصیت تھی۔ انہیں جب بھی دیکھتے چہرے پر مسکراہٹ سجی رہتی تھی۔''(شبیر عالم گیا، رکن مجلس نمائندگان جماعت اسلامی ہند۔)

۵۔''منور صاحب شریف النفس آدمی تھے۔''(شفیق الرحمٰن صاحب، سابق صدر حلقہ ایس۔آئی۔او۔ بہار وسابق اسسٹنٹ ایڈیٹر سہ روزہ دعوت، نئی دہلی)

۶۔''وہ (منور صاحب) صاف اور سلجھے ذہن کے آدمی تھے۔ جچے تلے الفاظ میں اپنی رائے دیتے تھے اور طلبہ میں ان کی بڑی قدر تھی۔''(جاوید علی صاحب، سابق صدر حلقہ یو۔پی۔)

۷۔''منور صاحب بہت شریف النفس اور منکسر مزاج انسان تھے۔''(ڈاکٹر فخر عالم صاحب، دہلی، سابق زیڈ۔اے۔سی۔ممبر حلقہ یو۔پی۔)

۸۔''جامعۃ الفلاح کے فارغین اور علی گڑھ یونی ورسٹی کے طلبہ میں انھیں (منور صاحب) مقبولیت حاصل رہی۔ آپ کی مقبولیت ومحبوبیت کے اسباب میں آپ کے کریمانہ اخلاق اور متواضعانہ اسلامی شعائر کا احترام اور اسلامی احکام کی بجاآوری (کا دخل ہے اور وہ اس) میں ضرب المثل تھے۔''(انیس احمد فلاحی مدنی، سابق مدیر حیات نو واستاذ جامعہ الفلاح۔

۹۔منور صاحب ایک شریف، نیک، صالح اور ہنس مکھ نوجوان تھے، خوش مزاج اور خوش اَطوار تھے۔

بااخلاق اور باکردار تھے۔ طلبہ کے علاوہ اساتذہ بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ (عبدالحلیم فلاحی، کارکن مدھر سندیش سنگم، نئی دہلی)

۱۰۔ ''منور صاحب بہت ذہین تھے۔ پڑھنے لکھنے میں بہتر تھے۔ اخلاق بہت اچھا تھا۔ کم گو تھے مگر ہنستے مسکراتے تھے۔ کبھی غصہ ہوتے نہیں دیکھا۔ عربی اول تا عربی ہفتم سات سال تک ان کا ہم سبق رہا مگر کبھی غصہ ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ میرے گہرے دوست تھے۔ ابھی جب کہ ان کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی، دورانِ طالب علمی حیاتِ نو میں انھوں نے تعددِ ازدواج کے موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا۔'' (امیر احسن فلاحی۔ ناظم جامعۃ الصالحات بانسی ضلع سدھارتھ نگر، یو۔ پی۔)

۱۱۔ ''جامعۃ الفلاح میں زمانۂ طالب علمی کے دوران خاموش طبعی اور سنجیدگی ومتانت ان کا نیچر تھا۔ اساتذہ کے مقرب رہے۔ پڑھنے لکھنے میں اچھے رہے۔ تنظیم میں شامل ہونے کے بعد وہ متحرک وسرگرم نظر آئے۔'' (شارق انصاراللہ۔ چیرمین شاہین پبلک اسکول، نئی دہلی)

۱۲۔ ''منور صاحب کا (اچانک) رخصت ہوجانا ایک بڑا سانحہ تھا۔ مرحوم منور فلاحی کا نئی نسل کے ان چند افراد میں نام لیا جاتا ہے جنھوں نے علی گڑھ کے ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی اور اے۔ ایم۔ یو۔ میں رہتے ہوئے اساتذہ اور طلبہ کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا اور انھیں تحریک اسلامی سے قریب لائے۔

خاص بات تو یہ تھی کہ وہ فیلڈ میں بہترین داعی ہونے کے ساتھ علمی، تحقیقی اور فکری طور پر متحرک تھے۔ انھوں نے اپنے رفیق صفدر سلطان صاحب جو کہ ان کی وفات کے چند سالوں کے بعد خود بھی دنیا سے رخصت ہوگئے، اور پھر علی گڑھ سے مولانا سید جلال الدین عمری ودیگر اکابرین کے چلے جانے کے بعد پیدا ہوئے بڑے خلاء کو پُر کیا تھا جس کے نتیجے میں وہاں تحریک اسلامی کا پھر سے روشن مستقبل دکھائی پڑنے لگا تھا۔''

اے۔ یو۔ آصف

ڈائرکٹر پریس کلب، نئی دہلی وسینئر صحافی

۱۳۔ ''منور بھائی سے میرا بہت قریبی تعلق رہا ہے۔ میں ان کا بڑا معتقد رہا ہوں۔ وہ میرے لیے بڑے بھائی کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت بہت ہی دل چسپ تھی۔ وہ غیر معمولی قلندر صفت آدمی تھے۔ مزاج میں سادگی کا اظہار ان کے معمول کے کرتہ پائجامہ شیرانی اور ٹوپی سے ہوتا تھا۔''

علی گڑھ کے ماحول میں ان کا بڑا اعتبار تھا۔ علی گڑھ میں منور صاحب نے جاوید علی صاحب (اور یونی

ورسٹی کے ۲۵۔۲۰ ہم خیال طلبہ کے ساتھ مل کر) ایس۔آئی۔او۔ کی تشکیل کی اور اس کی سرگرمیوں کو منظم کیا۔

مجھے یاد ہے کہ منور صاحب نے جب اے۔ ایم۔ یو۔ میں اردو کا امتحان دیا تو پورے ڈپارٹ منٹ میں ٹاپ کیا۔ اس سے قبل اس شعبہ میں جو امتحانات ہوئے تھے ان سب کے نتائج کو بھی انھوں نے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ڈپارٹ منٹ کے پروفیسروں میں ہوڑ لگی ہوئی تھی کہ منور صاحب کو اپنے ماتحت کون ریسرچ کرائے گا!

آخر کار صدرِ شعبہ نقوی صاحب نے اپنے استحقاق کا استعمال کر کے، انہیں خود اپنی ماتحتی میں رکھ کر پی۔ ایچ۔ڈی۔ کرائی۔

منور صاحب ایک علمی شخصیت کے مالک تھے۔ گفتگو ہو یا تحریر، وہ ہر چیز میں ممتاز تھے اور ہم چشموں میں اُن کا وقار اور اعتبار تھا۔ جب کچھ لکھتے تو بہت نپے تلے جملے لکھتے۔ اپنی ادارت کے دوران ایس۔آئی۔او۔ کے ترجمان ماہنامہ رفیق منزل کو اچھے معیار پر پہنچا دیا۔

مجھ سے متعدد احباب نے منور صاحب کے ریسرچ ورک کی ستائش کی اور کہا کہ اردو زبان کے اسکالرس کے لیے ان کی تھیسس بہت کارآمد ہوگی۔ کیوں کہ وہ بہت اچھی تھیسس ہے۔ اسے چھپوانے میں میں نے خود اپنے طور پر کوشش کی۔

میرے اور منور صاحب کے درمیان جس نوعیت کے خوش گوار تعلقات اور اچھے مراسم تھے اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ میری کوششوں ہی سے ان کی پی۔ایچ۔ڈی۔ کی تھیسس شائع ہوئی اور میری پہل پر اس خاص نمبر کی اشاعت پر برادرم ضیاء الدین ملک فلاحی صاحب آمادہ ہوئے اور ان کے شدید اصرار پر ایک مختصر سا مضمون بھی اس خاص نمبر کے لیے سپردِ قلم کیا۔''

عرفان احمد

متوطن بہار، مقیم دبئی، رکن جماعت، ایک اطالوی کمپنی میں منیجر۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

علی گڑھ میں منور صاحب کی ایس۔آئی۔او۔ میں سکریٹری شپ کا زمانہ خاصا آزمائشی رہا۔ جاوید علی صاحب صدر حلقہ یو۔پی۔ تھے اور منور صاحب سکریٹری حلقہ۔ اس بنا پر کسی کو یہ گمان ہوسکتا ہے کہ دونوں حضرات میں بظاہر نہ سہی مگر اندر اندر کشیدگی اور ناچاقی ضرور رہی ہوگی۔ مگر جب میں نے جاوید علی صاحب

سے ملاقات کر کے منور صاحب کے اخلاق وکردار اور باہمی تعلقات کے بارے میں دریافت کیا تو سارے خیالات گرد وغبار اور دھواں ثابت ہوئے۔ موصوف کے گھر پر ملاقات کر کے ہم نے جو کچھ سنا اور سمجھا اس سے صاف ہو گیا کہ الحمدللہ، حلقہ کی سطح پر ان دونوں ذمہ داروں کے تعلقات خراب نہیں ہوئے تھے اور باہم برادرانہ اور خیر خواہانہ تعلقات قائم وبرقرار رہے۔

جاوید علی صاحب نے مرحوم منور صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

''وہ ایک سلجھے ذہن کے آدمی تھے۔ معاملات ومسائل میں نپے تلے الفاظ میں اپنی رائے دیتے تھے۔ اور اسی وجہ سے طلبہ میں ان کی بڑی قدر تھی۔ وہ اردو میں ڈرافٹنگ بہت اچھی کرتے تھے۔''

جب میں علی گڑھ میں حلقہ یو۔ پی۔ ایس۔ آئی۔ او۔ کا صدر منتخب ہوا تو اپنے اختیار کا استعمال کرتے ہوئے میں نے منور صاحب کو سکریٹری حلقہ بنایا۔ چنانچہ وہ ۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۵ء تک حلقہ یو۔ پی۔ کے سکریٹری رہے۔ اس کے بعد جب میں ایس۔ آئی۔ او۔ ہیڈکوارٹر دہلی آ گیا تو منور صاحب کو حلقۂ یوپی کا صدر بنا دیا گیا۔ پھر ان سے ربط باقی نہیں رہا۔

علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں منور صاحب کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی تو میری اہلیہ پکوان اور دیگر ساز وسامان لے کر حاضر ہوئیں اور ان کی خدمت کی۔ میرے والد محترم علاج کے لیے وطن سے علی گڑھ تشریف لائے اور پھر Pacemaker لگوانے کے لیے انھیں دہلی لانا پڑا۔ اسپتال میں اُن کے آپریشن کے دوران مجھے بھی والد صاحب کے ساتھ رہنا پڑا۔

اس دوران منور صاحب میرے گھر برابر جاتے رہے اور اہل خانہ سے پوچھتے کہ کوئی ضرورت ہو تو بتائیں۔ اسی طرح میرے وطن کے سفر کے دوران بھی منور صاحب میرے گھر پہنچ کر برابر حال چال معلوم کرتے رہتے تھے۔ علی گڑھ اسپتال میں والد صاحب جب داخل تھے منور صاحب وقفہ وقفہ سے ابا کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال جاتے رہتے تھے اور میری عدم موجودگی میں میرے گھر جا کر حال چال معلوم کرتے رہتے تھے۔ الغرض، منور صاحب ہم سے بہت قریب تھے۔ ہمارے باہمی تعلقات خلوص ومحبت پر مبنی تھے۔ اور باہم خوش گوار تعلقات تھے۔''

خو گرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سُن لے

ڈاکٹر رضی الاسلام صاحب کا بیان ہے کہ: ''منور صاحب چار سال تک ادارۂ تحقیق سے وابستہ رہے۔

مگر جس موضوع پر انھیں مقالہ لکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اسے پورا نہ کر سکے۔''

موصوف کا احساس ہے کہ منور صاحب ادارے میں اِس حیثیت سے یکسو نہیں تھے کہ وہ ادارۂ تحقیق میں مستقل طور پر رہیں گے یا نہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ وہ مفوضہ کام (اسائن منٹ) پورا نہ کر سکے ہوں۔ البتہ وہ دیگر مفوضہ ذمہ داریاں: تصنیفی تربیت کے لیے ادارۂ تحقیق میں داخلہ لینے والے طلبہ کی رہنمائی، ان کے مقالات و مضامین کی چیکینگ اور مجلّہ تحقیقاتِ اسلامی اور ماہنامہ زندگی کے لیے ادارے کو موصول ہونے والے مضامین پر نظر ثانی نیز نبی نگر میں ادارہ کی زیر تعمیر بلڈنگ کی تعمیرات کی دیکھ بھال کرتے رہے۔''

اس لیے اس کا بجا طور پر امکان ہے کہ اسائن منٹ کی تکمیل کے لیے جو سکون، یکسوئی اور فرصت درکار تھی، وہ انھیں نہ ملی ہو۔ پیچھے یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ ذہنی وجسمانی طور سے دو بچوں کی معذوری بھی ان کے لیے عدم یکسوئی کا باعث تھی۔

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی ۱۹۸۳ء میں علی گڑھ آ گئے تھے اور ۱۹۹۴ء تک یونی ورسٹی (اے۔ ایم۔ یو) سے وابستہ رہے۔ ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی میں وہ یکم مئی ۱۹۹۴ء کو وابستہ ہوئے۔ اس طرح ایک سال سے کم عرصہ انھیں منور صاحب کے ساتھ ادارۂ تحقیق میں رہنے کا موقع ملا۔

الوداع ساتھو!

ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے عمر عزیز کی ۶۱ بہاریں دیکھ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ سنا ہے، جگر میں انفکشن ہو گیا تھا۔ بدن پر وَرَم آ گیا تھا۔ انھیں علاج کے لیے مولانا آزاد میڈیکل کالج علی گڑھ کے اسپتال میں داخل کیا گیا جہاں وہ کم و بیش ایک ہفتہ موت اور زیست کی کشمکش سے دوچار رہے۔ بالآخر جگرِ سوختہ ساماں نے زندگی کا مزید ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور ۱۹۔۱۸ ستمبر ۲۰۰۰ء کی درمیانی شب، دل کا شدید دورہ پڑا اور پھر وہ جاں بر نہ ہو سکے اور اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر کے بیوی، ۵ بچوں اور دوست احباب، ہمدردوں و غم خواروں کی ایک بڑی تعداد کو چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

حیات جس کی امانت تھی اس کو لوٹا دی
حفیظ چین سے سوتا ہے پاؤں پھیلا کر
بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میر
کیا دِوانے نے موت پائی ہے
حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

یَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ .

آخری بات

میں اس مقالہ 'منور حسین: چند یادیں۔ چند باتیں' کی تکمیل پر اللہ تعالیٰ کے بعد ان تمام حضرات کا صمیمِ قلب سے شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کی تکمیل میں کسی طور پر بھی تعاون کیا۔ خواہ وہ انٹرویو کی شکل میں ہو یا بالمشافہ گفتگو کی شکل میں ہو یا ٹیلی فون، موبائل پر ہوئی گفتگو ہو یا بذریعہ میسیج انھوں نے متعلقہ معلومات فراہم کی ہوں۔

میں ان تمام حضرات کا بطور خاص ممنون اور شکر گزار ہوں جو مرکز جماعت اسلامی ہند میں قائدانہ رول ادا کر رہے ہیں۔ جناب محمد جعفر نائب امیر جماعت، جناب محمد سلیم انجینئر نائب امیر جماعت، جناب محمد اقبال ملا سکریٹری شعبہ دعوت، جناب ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، سکریٹری شعبہ اسلامی معاشرہ، جناب شفیق الرحمٰن اسسٹنٹ ایڈیٹر سہ روزہ دعوت، جناب اے۔ یو۔ آصف عمر سینئر صحافی دہلی، جناب اسرار عالم اور ہمارے متعدد ساتھی ہمارے شکر وسپاس کے مستحق ہیں جنھوں نے کسی بھی طور سے اپنا وقت اس کام کے لیے فارغ کیا اور قیمتی معلومات فراہم کیں۔ محترم شبیر عالم (گیا) بھی ہماری اس فہرست کی زینت ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سبھی حضرات کے تعاون اور ان کے مشوروں کا بھرپور اجر عطا فرمائے اور خاک سار کو بھی اس میں سے حصہ عطا فرمائے۔

مآخذ ومراجع

۱۔ جناب محمد جعفر صاحب، نائب امیر جماعت اسلامی ہند، بانی وکل ہند صدر ایس۔ آئی۔ او۔
۲۔ جناب انجینئر محمد سلیم صاحب، نائب امیر جماعت اسلامی ہند وسابق صدر حلقہ ایس۔ آئی۔ او۔ راجستھان
۳۔ جناب ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی صاحب، سکریٹری شعبہ اسلامی معاشرہ وسابق ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

۴۔ جناب شفیق الرحمٰن صاحب، سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر سہ روزہ دعوت نئی دہلی وسابق صدر حلقہ ایس۔آئی۔او۔ بہار۔
۵۔ جناب جاوید علی صاحب، سابق صدر حلقہ یو۔پی ایس۔آئی۔او۔ ونائب امیر جماعت حلقہ دہلی وہریانہ
۶۔ جناب اسرار عالم صاحب، معروف مصنف، سابق سب ایڈیٹر ریڈینس ویوز ویکلی، دہلی۔
۷۔ جناب انعام اللہ فلاحی صاحب، معاون شعبہ تعلیم مرکز جماعت اسلامی ہند وسابق سکریٹری حلقہ ایس۔آئی۔او، یو۔پی۔
۸۔ جناب شبیر عالم صاحب، گیا(بہار) رکن مجلسِ نمائندگان جماعت اسلامی ہند وسابق رکن CAC (رکن شوریٰ ایس۔آئی۔او۔)
۹۔ جناب عبدالحلیم فلاحی صاحب، سابق اسٹاف مدھر سندیش سنگم، نئی دہلی۔
۱۰۔ جناب امیر احسن فلاحی، ناظم جامعۃ الصالحات بانسی، دوست وہم سبق منور حسین فلاحی مرحوم
۱۱۔ جناب شارق انصار اللہ فلاحی صاحب، چیرمین شاہین پبلک اسکول نئی دہلی
۱۲۔ جناب اے۔یو۔آصف عمر صاحب، ڈائرکٹر پریس کلب آف انڈیا، نئی دہلی وسینئر صحافی۔
۱۳۔ جناب عرفان احمد صاحب (دبئی) ایک اطالوی کمپنی میں منیجر اور منور صاحب کے قریبی ساتھی۔
۱۴۔ مختصر تاریخ جماعت اسلامی ہند از محمد شفیع مونس
۱۵۔ ماہنامہ حیات نو اکتوبر ۲۰۰۰ء
۱۶۔ ماہنامہ رفیق منزل 'افضل حسین نمبر' ستمبر ۱۹۹۰ء
۱۷۔ منزل کی اور (ایس آئی او کا سفر)

ڈاکٹر منور حسین فلاحی: یادوں کی بہاریں

محمد اسماعیل فلاحی

(پندرہ بیس سال پہلے لکھی گئی یہ تحریر ہے۔ مقالے کا نصف اول اگر چہ براہ راست عنوان سے تعلق نہیں رکھتا لیکن گرامی مصنف اسے اپنے ممدوح کے لیے پس منظر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ امید ہے قارئین کو یہ تحریکی منظر نامہ بھی پسند آئے گا۔ مدیر)

بنگلور اجتماع کی یاد میں

دسمبر ۱۹۸۵ء کی بات ہے، یہ شہر بنگلور کا پلے گراؤنڈ ہے۔ اقبال کے تخیل ع

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے
جوانوں کو میری آہِ سحر دے
تو ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

کے مصداق چٹانوں پر بسیرا کرنے اور عقابی شان رکھنے والے ایس آئی او سے وابستہ چوبیس ہزار جوان اس پلے گراؤنڈ میں جمع ہیں۔ آج ان کی پہلی آل انڈیا کانفرنس کا تیسرا دن ہے۔ ان کا یہ عزم محکم ہے کہ آپس میں لڑتی کٹتی، مرتی اس دنیا کو وحدتِ الٰہ، وحدت انسان اور وحدت نظام کی بنیاد پر بندگیِ رب کا پیغامِ امن ومحبت اور نغمہ سکون وجانفزا سنائیں گے اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر ایک خدا کی غلامی میں، ادیان ومذاہب کے جور وستم سے نجات دلاکر، اسلام کے سایۂ عدل ورحمت میں اور دنیا کی تنگ نائیوں سے چھٹکارا دلاکر آخرت کی وسعتوں کی سیر کرائیں گے۔ ان کا عزم ہے ؎

دنیا میں راج بدی کا ہو کیا ہم سے دیکھا جائے گا
اور ڈنکا ہر سو باطل کا کیا یوں ہی بجتا جائے گا
ہر سمت برائی کا دریا کیا یوں ہی بہتا جائے گا

ہم اس کو بڑھ کر روکیں گے
ہم اس پر بند لگائیں گے
ہم نیکی کے جانباز سپاہی
نیکی کو پھیلائیں گے

یہ تھے ایس آئی او کے کفن بردوش، جانباز اور یہ تھی ان کی پہلی آل انڈیا کانفرنس، شب کا پروگرام چل رہا تھا، آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا تھا، مقرر کی تقریر جاری تھی کہ دیکھتے دیکھتے آسمان پر کالے کالے بادل گھر آئے، ہواؤں میں شدت پیدا ہوگئی۔ طوفانی ہواؤں میں طوفانی بارش رعدو برق اور گھن گرج کے ساتھ قوتِ بازوئے مردِ مومن کا امتحان لے رہی تھی۔ طنابیں اپنی جگہ چھوڑنے لگیں، بمبوا کھڑنے لگے، ایسا لگ رہا تھا جیسے قدرت ان عاشقانِ راہِ وفا کو یہ پیغام دے رہی ہو کہ ہوشیار، سوچ سمجھ کر قدم رکھنا، یہ وادیِ پرخار ہے۔ اس مہیب منظر سے چند ثانیہ کے لیے مجمع کے سکون میں تھوڑا خلل پڑا۔ امیر جماعت اسلامی بنگلور جناب سید محمد سراج الدین ڈائس پر آئے اور سامعین سے بڑی پیاری آواز میں لب کشا ہوئے: جوانو! گھبراؤ نہیں، بس تھوڑی دیر کا امتحان ہے، کھڑے ہو جاؤ، بیٹھنے کی چٹائیاں سروں پر رکھ لو اور دس دس بارہ نوجوان مل کر بمبوؤں کو مضبوطی سے پکڑ لو کہ وہ اکھڑنے نہ پائیں، ابھی ان کے الفاظ ختم بھی نہیں ہوئے تھے کہ نوجوانوں کے دلوں میں بسنے والا تحریک اسلامی کا پیکرِ عمل قدر آور قائد، جناب عبدالعزیز، تکلف و بناوٹ سے دور، ایثار صفت، فدائیت اور قربانی کا مجسمہ، سادگی کی تصویر، وی آئی پی انداز سے نفور۔ ایسا خطیبِ بے بدل اور شعلہ بیان جس کی خطابت ٹوٹے ہوئے دل کی صدائے پر تاثیر تھی اور جو اس شعر کا ترجمان تھا۔

اجازت ہو تو شاہا پیش کردوں
مرے پہلو میں ہے ٹوٹا ہوا دل

اور جو اس بات سے بھی بخوبی آگاہ تھا۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اپنے سر پر چٹائی سے چھتری کا کام لیتے ہوئے ڈائس پر نظر آیا اور مائک ہاتھ میں لے کر اونچی مخصوص آواز میں کچھ اس طرح مخاطب ہوا: جوانو! مستقبل کے معمارو! بادلوں سے ڈرتے ہو؟ طوفانوں سے گھبراتے

ہو؟ یہ تمہارے عزم کا امتحان ہے۔ تم نے اپنے رب سے جو سودا کیا ہے یہ اس کی آزمائش ہے کہ تمہارے اندر کتنا دم خم اور کتنا حوصلہ ہے۔

یہ قدم قدم بلائیں، یہ سواد کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

یاد رکھو اس رعد و برق اور اس طوفان خیز بارش کی تمہارے آہنی عزم کے آگے پَرِ کاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں۔ تم تو وہ ہو جو ہواؤں کا رخ موڑ سکتے ہو۔ سیلابوں کے آگے بند باندھ سکتے ہو، سمندر کی موجوں سے ٹکر لے سکتے ہو، اس گھن گرج کے جواب میں تمہارے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنی چاہیے، خبردار! خبردار! تم میں سے جو کوئی اپنی جگہ سے ہلا۔

عشق بڑھتا رہا سوئے دار و رسن زخم کھاتا ہوا مسکراتا ہوا
راستہ روکتے روکتے تھک گئے زندگی کے بدلتے ہوئے زاویے

مولانا عبدالعزیز صاحب کا مخصوص لب ولہجہ تھا کہ بکھرتا ہوا مجمع سنبھل گیا اور گرجتے بادلوں، آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی آسمانی بجلیوں اور آندھیوں کے درمیان مقرر نے اپنی تقریر جاری رکھی، مجمع بھیگتا رہا اور ہمہ تن گوش سنتا رہا۔

اس موقع پر بنگلور کے وسیع القلب اور بالغ نظر باشعور مسلمانوں کو داد دینے کو جی چاہتا ہے، جنھوں نے بلاتفریقِ مذہب و مسلک و جماعت اپنے اپنے اسکول، مدرسے، مسجدیں اور دوسرے ادارے، کانفرنس میں بھارت کے کونے کونے سے آئے نوجوانوں کے لیے کھول دیے اور پروگرام ختم ہونے کے بعد اکثر و بیشتر افراد رات ہی میں ان جگہوں پر منتقل ہو گئے۔

اس موقع پر تین چیزیں نوٹ کرنے کی ہیں۔ ایک تو امیر مقامی بنگلور جناب سید سراج الدین صاحب اور مولانا عبدالعزیز کا نوجوانوں سے ایسا موثر خطاب کہ آگ کا سمندر بھی راہ کا روڑا نہ بن سکے۔ دوسری ان شاہین صفت جوانوں کا عزم و حوصلہ، ان کی استقامت اور ثابت قدمی اور ان کا نظم وڈسپلن۔ تیسری اہم چیز مسلمانانِ بنگلور کی ہر طرح کی ملکی، گروہی اور تنظیمی عصبیت سے بالاتر ہو کر ان کی اعلیٰ ظرفی، کشادہ دلی اور مہمان نوازی۔

منظر نگاری کا حقیقی محرک

ان تین باتوں کے علاوہ ایک اور انتہائی اہم، موثر اور دلوں کو اپنی جانب کھینچ لینے والا قابل تقلید منظر ہے جو

آج تک میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکا ہے۔ درحقیقت وہی منظر میری آج کی اس گفتگو کا اصل محرک ہے۔

میں نے اس منظر کو زیادہ اہمیت اس لیے دی ہے کہ کسی بھی تحریک کے قائدین کی یہ عزیمت اور ان کا یہ ایثار اور اعلیٰ کردار تحریک کی رگوں میں گرم گرم خون دوڑا دیتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے افراد بنیانِ مرصوص، سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنتے اور یک جان دو قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے یہی اوصاف حمیدہ تھے کہ آپ صحابہ کے دلوں میں بستے تھے۔ آپ نے اپنے اور ان کے درمیان کوئی دیوار حائل نہیں کی تھی، صحابہ کے درمیان اس طرح بیٹھتے کہ امتیاز مشکل ہو جاتا، صحابہ کے ساتھ تمام کاموں میں حصہ لیتے، زبانی جمع خرچ نہیں، عملی طور سے ساتھیوں بلکہ عام انسانوں کے مسائل سے دلچسپی، ان کی پریشانیاں دور کرنا اور دکھ باٹنا آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ غزوۂ خندق میں ساتھیوں کے ساتھ آپ نے خندق کی کھدائی اور سارے کاموں میں بہ نفسِ نفیس حصہ لیا۔ ساتھیوں کے ساتھ آپ نے بھی دھوپ، پیاس اور بھوک کی شدت برداشت کی، ایسا نہیں ہوا کہ خود تو سائے میں بیٹھے ہوں اور لوگوں کو دوڑا رہے ہوں۔ اس کے برعکس آج دینی مدارس ہوں یا عصری اسکول، ملی جماعتیں ہوں یا سیاسی انجمنیں اور پارٹیاں یا دیگر ادارے اور کمیٹیاں بالعموم ہر جگہ ذمہ داروں نے اپنے اور ماتحتوں کے درمیان ایک حصار کھڑی کر لی ہے۔ دوسروں کو قناعت، اخلاص اور نظم کی پابندی کے درس کے ساتھ اپنے اقارب اور اپنی گول کے لوگوں کو مناصب اور عہدوں سے نوازنا ان کی عادت ہے۔ اپنے لیے رعایتیں ہی رعایتیں ہیں، سارے قواعد وضوابط دوسروں کے لیے۔ سربراہوں اور قائدین کا کام بیٹھ کر کرسیاں توڑنا، ہم مذاق لوگوں کے ساتھ وقت ضائع کرنا، ڈیوٹی کے وقت میں اخبارات ورسائل دیکھنا، اپنے اور اپنی لابی کے لیے کوارٹر، فرج، اے سی، لسّی، چائے وغیرہ اور اے سی اور ہوائی جہاز کے سفر کا استحقاق اور yes sir کا کردار ادا نہ کرنے والوں کو محروم کرنے کے ہزار بہانے۔ اپنے ادارے میں مختلف شخصیات کی آمد کے بہانے عمدہ پکوانوں کا اپنے کو اور اپنی لابی کو مستحق سمجھنا، یہ ہے ان کا بالعموم انداز، کسی کام میں خود ان کی شرکت آپ نہیں دیکھ سکتے۔ ان کا کام صرف دوسروں کو خوبصورت انداز میں آرڈر دینا اور کام ہو جانے کے بعد شکریہ اور جزاک اللہ کے الفاظ کہہ دینا کافی ہے۔ پروگراموں میں اپنے لیے خصوصی انتظام کی خواہش، اگر کسی طرح کی کمی ہو جائے تو نہ صرف چہرہ پر شکن بلکہ رویے اور صاف الفاظ میں خفگی کا اظہار۔ پروگراموں میں دوسرے رفقاء کے ساتھ وقت پر ان کے لیے شرکت ممکن نہیں، تقریر کے لیے ٹھیک اپنی باری کے وقت پہنچیں گے، تقریر کے لیے پہلے سے طے شدہ وقت پورا ہو جانے پر وقت ختم ہو جانے کی پرچی دینے، الارم بجانے یا علامتی ریڈ

لائٹ کے استعمال پر شدید ناگواری کا اظہار، پھر اپنی تقریر کے فوراً بعد آرام گاہ میں چلے جانا، جہاں پہلے سے ان کے نائو ونوش کے لیے کوئی رضا کار موجود ہوگا۔ ان کے بڑے اور ذمہ دار ہونے کی علامتیں ہیں۔ اس صورت حال کے ہوتے ہوئے یہ کیسے امید کی جاسکتی ہے کہ کسی ادارے یا جماعت کے افراد بنیان مرصوص بن سکیں گے، جن سے باطل پر لرزہ طاری ہوجائے۔ ان کے درمیان تو بس ضابطہ کا رسمی تعلق ہوگا۔ دل پھٹے ہوں گے اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ میرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

اس کے برعکس صورت حال یہ ہوتی ہے

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مرد خلیق

تحریک اسلامی کے مخلص قائدین اور رفقاء کار

ان نگاہوں نے ملت کے ایسے قائدین بھی دیکھے ہیں جن پر زمانہ جانیں نچھاور کرتا تھا۔ جو ملت کے ہر فرد کو اپنا سمجھتے، گلے لگاتے، فکری اختلاف اس میں حائل نہیں ہوتا، اپنے رفقاء کے ساتھ بیٹھ کر گھر میں جو کچھ ہوتا، بے تکلف کھاتے۔ انھیں اس میں عار نہیں تھا کہ اپنے ساتھ ناشتے میں رات کی بچی باسی روٹی میں شریک کررہے ہیں۔ رفقاء کی سطح پر اپنے کو رکھتے، اپنا سامان خود لے کر چل رہے ہیں، ان سے خواہش کی جاتی کہ رات آرام کے ساتھ دوسری جگہ گزاریں لیکن وہ رفقاء کے ساتھ رات گزارنا پسند کرتے۔ ہم کیسے بھول سکتے ہیں مولانا ابواللیث اصلاحی کو، مولانا سید حامد علی کو، مولانا افضل حسین اور مولانا شفیع مونس کو، مولانا شہباز اصلاحی اور جناب انیس الدین مرحوم (سابق امیر حلقہ بہار)، جناب قمر الہدیٰ اور ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ (سابق امیر حلقہ بہار) کو، جناب حسنین سید اور جناب عبدالفتاح (امیر حلقہ بنگال واڑیسہ) کو، مولانا سراج الحسن اور جمال احمد امین آبادی کو، جناب سید محمد جعفر صاحب (پٹنہ) جناب سید اقبال (گیا)، جناب احمد علی اختر (پٹنہ)، مولانا محمد اثری (دربھنگہ)، رضوان احمد اصلاحی (پٹنہ)، مولانا شبیر انور اصلاحی اور مولانا صغیر احسن اصلاحی کو، جناب شفیع المذنبین (بھاگلپور)، جناب سمیع احمد (بھاگلپور)، اکرم باروی، اکرم صدیقی (بھاگلپور)، مولانا محمد عالم اور مولانا محمود عالم اصلاحی (بھاگلپور)، جناب عبدالقدوس صاحب اور جناب اشفاق صاحب

بھاگلپور، جناب اظہار کریم (بھاگلپور)، حاجی مولوی محمد بشیر مرحوم (رانی پور سیوان)، محمد قاسم (صدر پور سیوان)، محمد یعقوب فلاحی (سیوان)، عبداللطیف بھایاں (ہاسن)، جناب فہیم الدین (بیدر)، جناب اقبال ملا، جناب محمد اشفاق احمد صاحب (اورنگ آباد)، جناب رفیق احمد (بنگلور)، جناب جعفر صادق (ہاسن)، عبدالخالق فیروز سائیکل مارٹ (ہاسن)، جناب لیاقت احمد ملا (کرناٹک)، جناب حکیم محمد ایوب اور منشی محمد انور (بلریا گنج)، ڈاکٹر مشتاق (محمد پور)، ماسٹر امتیاز احمد (محمد پور)، مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی، مولانا محمد سلامت اللہ اصلاحی، مولانا محمد عمران خاں فلاحی، طارق فارقلیط فلاحی اور جناب منور حسین فلاحی، جناب صباح الدین ملک قاسمی اور جناب محی الدین غازی کو اوران کے جیسے بہت سے لوگوں کو، ان حضرات کو تو دیکھا ہے اوران کے ساتھ صحبت رہی ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے بزرگوں کے بارے میں سنا ہے کہ کیا تھا ان کے رہنے کا انداز، کیسا تھا رفقائے کار سے ان کا تعلق، سب کے ساتھ مل کر کام کرنے کا ڈھنگ کیا تھا، پروگراموں میں شروع سے آخر تک شریک، اپنے لیے کوئی مخصوص نشست نہیں، اپنے لیے کوئی رعایت نہیں، کوئی باؤنڈیشن نہیں، کوئی کمپینگ نہیں، سب ہمارے ہیں، ہم سب کے ہیں، سب کے درد کو اپنا درد سمجھنے والے اوراسے دور کرنے کے لیے بے چین، ایسے قائدین پرلوگ کیوں جانیں نچھاور نہیں کریں گے، کیوں ایسے لوگ ایک اسرہ نہیں ہوں گے، جن کے ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو سارے اعضا اس کی ٹیس محسوس کریں۔

بنگلور اجتماع کا چوتھا منظر

ہاں تو بات چل رہی تھی بنگلور کانفرنس کے چوتھے اہم منظر کی۔ وہ منظر یہ تھا کہ ہواؤں کی شدت گو تھم گئی تھی، بارش کی طوفان خیزی میں بھی کمی آ گئی تھی، لیکن ہلکی ہلکی بارش رات بھر ہوتی رہی، سرد ہوائیں اپنا تیور بھی دکھاتی رہیں، ارض وسما سب محو حیرت تھے اس قافلۂ سخت جاں کی قیادت کے ان شہبازوں پر، ایثار وقربانی کے ان پیکروں پر، خدا جانے یہ کس گوشت پوست سے بنے تھے!! انھوں نے عام نوجوانوں کو محفوظ ٹھکانوں پر پہنچانے کا انتظام تو کر دیا تھا لیکن خود اپنی جگہ سے ٹلے نہیں۔ بھیگ رہے ہیں، بارش اور سرد ہوائیں ان کے گرم حوصلوں اوران کے گرم جذبات کا امتحان لینے میں ناکام ہیں۔ وہ اِدھر اُدھر لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتے پھر رہے ہیں، آگ بھی جلا رکھی ہے اور چائے کا دور بھی چل رہا ہے۔

ڈاکٹر منور حسین فلاحی ایس آئی او کے شاہین صفت صدر حلقہ

اس شاہین صفت قیادت میں ایک نوجوان کچھ زیادہ ہی متحرک نظر آتا ہے۔ یہ قابل صد رشک نوجوان

غیر منقسم یو پی بشمول دہلی کے ایس آئی او کا صدر حلقہ ڈاکٹر منور حسین فلاحی ہے۔ دبلا پتلا، گورے رنگ اور لانبے قد کا یہ نوجوان، بھیگی شیروانی اور چوڑے پاجامہ میں ملبوس، پیشانی پر معصومیت کا نور، پارے کی طرح متحرک، چہرے پر تبسم، کبھی اِدھر سے گزرتا ہے اور کبھی اُدھر سے، کبھی سامنے سے آتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی پیچھے سے، اسے نہ اپنی نیند کا خیال ہے اور نہ بھیگی شروانی کی پروا۔ خواہش ہے تو بس اس بات کی کہ ساتھیوں کی کیسے مدد کی جائے، حال معلوم کرتا ہے، چائے کی پیش کش کرتا ہے، اگر کوئی ضرورت سامنے آتی ہے تو پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی مختصر باتوں میں بلا کی اپنائیت ہے، اس کے حوصلے ہمالہ سے بھی بلند معلوم ہوتے ہیں۔ بات دھیمے انداز میں کرتا ہے۔ اس کا نرم دھیما لب ولہجہ راہِ حق کے تمام نشیب وفراز، حق وباطل کی ستیزہ کاری اور بالآخر جاء الحق وزھق الباطل کا مژدہ سناتا ہے۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے ابھی چند لمحے پہلے تک موسلا دھار بارش، آسمان کی گھن گرج، بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور ہواؤں کی قیامت خیزی میں مردانِ راہ حق کا اپنی جگہ شیروں کی طرح ڈٹے رہنے، بادلوں کے سست پڑ جانے، طوفان کے تھم جانے اور ہواؤں کے نرم پڑ جانے کی شکل میں سامنے آیا تھا۔

میرے ہمدمِ دیرینہ کے احوال وکوائف

برادر مکرم منور حسین فلاحی سے میرا پہلا تعارف ۱۹۷۱ء میں اس وقت ہوا جب وہ جامعۃ الفلاح میں داخلہ کے لیے آئے تھے۔ میں بھی اسی سال جامعہ آیا تھا، میرا داخلہ عربی اول میں ہوا تھا، وہ کچھ عربی پڑھ کر آئے تھے اس لیے ان کا داخلہ عربی کے دوسرے سال میں ہوا۔ میرا اور ان کا ساتھ جامعۃ الفلاح میں چھ برس تک رہا۔ وہ بہار کے ''کھگڑیا' ضلع کی ایک مردم خیز بستی 'پیر الطیف' کے رہنے والے تھے۔ اس بستی میں علماء وفضلاء، حفاظ اور عصری علوم کے حاملین بڑی تعداد میں رہے ہیں۔ اس بستی کے لوگوں کے میرے والد جناب مولانا محمد عالم صاحب سے گھریلو قسم کے تعلقات تھے، والد صاحب اپنی فیملی کے ساتھ 'بھاگلپور' میں نصف صدی سے زیادہ رہے ہیں۔ بھاگلپور کمشنری کے دوسرے علاقوں کی طرح پیر الطیف کے بہت سے گھرانوں کے لوگ جب بھاگلپور آتے تو مولانا محمد عالم صاحب ان کے میزبان ہوتے۔ اکثر و بیشتر ان کا آنا جانا ہوتا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ لوگ آئیں اور والد صاحب سے ملے بغیر چلے جائیں۔ میری والدہ محترمہ صابرہ خاتون صاحبہ ان مہمانوں کی آمد سے بہت خوش ہوتیں اور والد صاحب کو ان کا تعاون ہمیشہ حاصل رہتا۔

منور حسین صاحب کے والد جناب انوار الحق صاحب ایک دین دار اور تعلیم یافتہ شخص تھے، والد صاحب

سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ منور حسین صاحب کی شخصیت کے اندر قدرت نے جمال باطنی کے ساتھ جمال ظاہری بھی ودیعت کر رکھا تھا۔ اوصافِ حمیدہ اور خصالِ فاضلہ بالخصوص للّٰہیت، اخلاص اور بلاتفریق تمام انسانوں کے لیے نصح وخیر خواہی۔ انسانی زندگی کا وہ جوہر ہے جو ہر جگہ خلقِ خدا کو اپنی طرف کھینچتا ہے اس کے ساتھ پیر الطیف سے اور اس سے آگے بڑھ کر محترم جناب انوار الحق صاحب سے ان کے تعلق کی نوعیت نے مجھے ان سے اور ان کو مجھ سے بہت قریب کر دیا۔ وہ ۱۹۷۶ء میں جامعۃ الفلاح سے سند فضیلت لے کر فارغ ہوئے، جب وہ جامعہ میں داخل ہوئے تو ان کی انگریزی کمزور تھی اس وجہ سے شروع کے دو سالوں میں فرسٹ ڈویژن سے آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن جلد ہی انھوں نے اپنی انگریزی میں خاصی استعداد پیدا کر لی۔ اس کے بعد مستقل آخر تک درجہ میں ان کی دوسری پوزیشن آتی رہی۔ درجہ میں ان کا شمار انتہائی ممتاز طلبہ میں ہوتا بلکہ بقول حافظ احسان الحق فلاحی شیخ التفسیر کلیۃ البنات جامعۃ الفلاح طلبہ آپس میں کہا کرتے کہ پہلی پوزیشن تو ان کی آنی چاہیے۔ منور حسین صاحب کے درجہ میں پہلی پوزیشن برادر محترم جناب طارق اکرام اللہ صاحب کی شروع سے آخر تک آتی رہی۔ ان کے درجہ کے نمایاں ساتھیوں میں مولانا صدر الدین اصلاحیؒ کے دوسرے صاحبزادے جناب رضوان احمد فلاحی (مقیم لندن)، طارق اکرام اللہ فلاحی، وسیم احمد غازی فلاحی، شمیم احمد غازی، نسیم الحق فلاحی، امیر احسن فلاحی، صالح سیف اللہ کامی فلاحی، جمیل احمد فلاحی استاد جامعۃ الفلاح اور عربی سوم تک منشی محمد انور صاحب کے بھائی محمد امین صاحبان ہیں۔ غیر درسی کتابوں کا مطالعہ ان کا وسیع تھا۔ حالات حاضرہ سے باخبر رہتے۔ وسیم احمد غازی اور منور حسین میرے علم کی حد تک یہ دو طلبہ ایسے تھے جو ریڈیو رکھتے اور پابندی سے خبریں سنتے۔ جمعیۃ الطلبہ کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے، جامعۃ الفلاح میں اس زمانے میں ہفتہ میں دو دن بیت الخلا اور مسجد سمیت پورے جامعہ کی صفائی ہوتی اور اس کی باریاں بنی ہوتیں، اسی طرح اجتماعی طور سے کھانا کھلانے کی بھی باریاں ہوتیں۔ یہ اپنی باریوں میں بڑی صفائی اور سلیقہ سے آگے بڑھ کر کام کرتے اور کراتے۔ تقریر وتحریر کی مشق میں بھی حصہ لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے معاملہ کی تہہ میں اتر جانے والا ذہن رسا دیا تھا، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی ودیعت کی تھی وہ رٹو نہیں تھے، سمجھ کر پڑھتے اور چیزیں ذہن میں نقش ہو جاتیں، عربی اور انگریزی کی بڑی اچھی استعداد پیدا کر لی تھی، تھے تو پتلے دبلے لیکن دلیر اور بہادر تھے، ڈر اور خوف نام کی کوئی چیز نہیں تھی، ساتھ ہی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ متحمل مزاج اور بردبار بھی تھے، جوش میں آ کر بھڑک اٹھنے والے اور مشتعل ہونے والے نہیں تھے۔ ہر کام سوچ سمجھ کر پورے ہوش وحواس کے ساتھ کرتے اور اس میں

کسی کی پرواہ نہ کرتے ایک باران کے زمانے میں جامعہ میں زبردست اسٹرائک کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور تقریباً تمام طلبہ اس میں شریک تھے۔ چند طلبہ جو اس سے الگ رہے، ان میں منور حسین فلاحی بھی تھے۔ (اسٹرائک کے لفظ سے غلط فہمی نہ ہو، اس زمانہ میں کبھی اس طرح کی کیفیت پیدا ہوتی تو طلبہ پورے وقار کے ساتھ، اساتذہ اور ذمہ داران کا پورا ادب واحترام ملحوظ رکھتے تھے) یہ بڑے اچھے غلیل باز تھے۔ نشانہ بڑا اچھا تھا، انھوں نے ایک بار اپنے علاقہ میں کچھ شر پسندوں کو غلیل کے ذریعہ بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بڑے خوددار اور ایثار پیشہ تھے، ساتھیوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے، متمول اور کھاتے پیتے زمین دار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ گھر سے جب آتے، بڑی مقدار میں حلوہ، خستہ اور آم وغیرہ لاتے، اکیلے نہیں ہضم کر جاتے بلکہ ساتھیوں کو شریک کیا کرتے، مجھے تو کبھی بھولتے نہیں۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود غرور اور گھمنڈ سے کوسوں دور، مزاج میں تواضع، انکسار اور خاکساری ہر شخص محسوس کرسکتا تھا۔ طبعیتاً نظافت اور نفاست پسند تھے۔ گندگی اور بے ڈھنگے پن سے جیسے چڑھ ہو، ہر کام میں سلیقہ اور تہذیب نمایاں تھی۔ ادب کا بھی ذوق تھا۔ اقبال ان کا محبوب شاعر تھا اقبالیات پر انھیں خاصا عبور حاصل تھا۔

جامعۃ الفلاح سے فراغت کے بعد ایک سال انھوں نے بقول حافظ احسان الحق فلاحی مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی کو ایک خط لکھا، جس میں تذکرہ کیا کہ فراغت کے بعد ان کے والد نے انھیں دیوبند بھیجا۔ جامعۃ الفلاح سے تعلق ہونے کی بنا پر ان کا داخلہ نہیں ہوسکا۔ اس کے بعد والد صاحب کے اصرار پر محض ان کے حکم کی تعمیل میں، اپنے مزاج کے برخلاف، تبلیغی جماعت کے ساتھ سال بھر کا چلّہ کیا، پھر اس کے بعد ان کے والد نے انھیں بھاگلپور درس گاہ اسلامی میں مولانا محمد عالم صاحب کی سرپرستی میں دے دیا، ان کا قیام درس گاہ میں ہوتا اور کھانا پینا مولانا محمد عالم صاحب کے یہاں۔

اسی زمانہ کا واقعہ ہے۔ رمضان کا آخری عشرہ تھا، درس گاہ کھلی تھی، والد صاحب تاتارپور کی مسجد میں معتکف تھے اور ہم لوگ مولانا چک میں رہتے تھے۔ ایک روز دن بھر زوروں کی بارش ہوتی رہی، اب تو اس طرح کی بارش نہیں ہوتی، ہم اور وہ خلیفہ باغ کسی کام سے گئے تھے، بارش میں پھنس گئے، گھنٹوں موسلا دھار بارش ہوتی رہی، جب ذرا تھمتی ہم آگے بڑھتے پھر بارش کا زور بڑھ جاتا ہمیں کہیں پناہ لینی پڑتی، اس بارش میں مختلف جگہ رکتے اور بھیگتے ہوئے ہم لوگ دیر رات گئے گھر آئے، کھانا کھایا اور منور صاحب والد صاحب کا کھانا لے کر گئے۔

کچھ دنوں بعد وہ کرناٹک چلے گئے جہاں تک ذہن کام کرتا ہے وہ 'سورب' کا علاقہ تھا جہاں وہ بحیثیت مدرس گئے تھے۔ غالباً دو سال سے زیادہ نہیں رہے ہوں گے۔ دوبارہ جا رہے تھے تو ہمارے یہاں تشریف لائے راستہ کا خستہ وغیرہ سب کو کھلایا، اتفاق سے ان کی روانگی کے وقت میں موجود نہیں تھا، میرا حصہ رکھ کر چلے گئے۔ اس سفر میں حادثہ یہ پیش آیا کہ بھاگلپور اسٹیشن ہی پر ان کا سارا سامان چوری ہو گیا، اس کی اطلاع ہمیں اس وقت ہوئی جب سورب پہنچ کر ان کا خط آیا، اگر اسی وقت والد صاحب کو اطلاع ہو جاتی تو بہت ممکن تھا کہ ان کا سامان مل جاتا۔

ایک تاریخی واقعہ جو والد گرامی کو آب دیدہ کرتا رہا

ایک دن کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں اندر بیٹھے تھے، ان کے چچا اپنے لڑکے کو ڈانٹ رہے تھے، ان کے والد صاحب نکلے، انھیں خبر نہیں تھی کہ منور حسین گھر میں ہیں، انھوں نے اپنے بھائی سے کہا: ایسے شریف اور اچھے بچے پر کیوں بگڑتے ہو، ایک میرا لڑکا ہے میں کہتے کہتے تھک گیا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے جاؤ اور یہ سنتا تک نہیں۔ والد صاحب کا یہ تبصرہ منور صاحب کے کانوں میں پڑا۔ انھوں نے اسی وقت طے کر لیا کہ اب علی گڑھ جانا ہے، خاموشی سے داخلہ کا فارم منگا کر بھر دیا اور جب جانے کا دن آیا تو اس روز دن بھر گھر سے غائب رہے، رات میں دیر سے آئے، والد صاحب نے پوچھا کہ کہاں تھے؟ بتایا کل علی گڑھ جا رہا ہوں، ان کے والد صاحب جب اس واقعہ کا ذکر کرتے تھے تو آب دیدہ ہو جاتے تھے۔ کہتے تھے کہ وہ دن بھر سفر اور وہاں کے اخراجات کہیں سے فراہم کرنے کے لیے غائب رہا، وہ ہم پر بار ڈالنا نہیں چاہتا تھا!

اس طرح وہ علی گڑھ پہنچے، یہاں انھوں نے ۱۹۸۴ء میں بی اے اور ۱۹۸۶ء میں اردو سے ایم اے ممتاز نمبروں سے پاس کرنے کے بعد ۱۹۸۸ء میں ایم فل کی تکمیل کی۔ مقالہ کا عنوان تھا: ''مولوی چراغ علی کی علمی خدمات''۔ ۱۹۹۷ء میں یہ مقالہ کتابی شکل میں خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے طبع ہوا۔ ۱۹۹۲ء میں ان کی پی ایچ ڈی مکمل ہوئی، مقالہ کا عنوان تھا: 'اردو میں علمی نثر (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء): سماجی علوم کے حوالے سے'۔ یہی مقالہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچنے جا رہا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ چند سطریں سپرد قرطاس کی گئی ہیں۔ قارئین اس کے مطالعہ کے بعد مقالہ نگار کے بارے میں خود فیصلہ کر لیں گے کہ وہ کس پایہ کا درنایاب تھا۔ [یہ مقالہ براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی سے کتابی شکل میں ۲۰۲۰ء میں، ۳۵۱ صفحات کے اندر شائع ہو چکا ہے۔ اس مقالے کے دو تین ریویوز بھی اس نمبر میں شامل کیے گئے ہیں۔ (مدیر)]

۱۹۸۶ء میں NET کوالیفائی کیا، اس دوران انھیں یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویٹ میرٹ اسکالرشپ اور یو.جی.سی سے جی آر ایف اور ایس آر ایف فیلوشپ ملتی رہی۔ ۱۹۸۵ء-۱۹۸۶ء میں علی گڑھ (اردو) میگزین کو ایڈیٹ کیا۔ دسمبر ۱۹۸۷ء سے دسمبر ۱۹۹۰ء تک رفیق منزل کے پہلے اعزازی مدیر رہے، مختلف موضوعات پر پندرہ مقالے ان کے شائع ہو چکے ہیں۔ سات کتابوں پر ان کے تبصرے بھی شائع ہوئے ہیں۔ دو مقالے انھوں نے ریسرچ ایسوسی ایشن میٹنگ میں پیش کیے ہیں۔ آل انڈیا مضمون نگاری مقابلہ میں دو بار حصہ لیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ایم اے میں انھوں نے گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ اے ایم یو کے سینئر سیکنڈری اور گریجویشن کے طلبہ کو پانچ سال پڑھایا ہے۔ ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی سے ۱۹۹۲ء سے وابستہ ہوئے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنیاد پر صدر ادارہ کی نظروں میں ان کا مقام بلند ہو گیا اور وہ ان کی تحقیقات اور زبان و بیان پر اعتماد کرنے لگے، ادارہ کے رفیق مولانا جرجیس کریمی کے مطابق وہ ان کے مقالوں کی ترتیب و تصنیف اور تحقیق میں ان کی اور ان کے ساتھیوں کی مدد کیا کرتے تھے۔

واقف کار بتاتے ہیں کہ علی گڑھ کی مخصوص فضا میں رہتے ہوئے انھوں نے کسی کی حاشیہ نشینی اختیار نہیں کی۔ پروفیسر منظر عباس نقوی ان کے مشرف تھے۔ ایک بار منور حسین ان کے یہاں گئے، پروفیسر صاحب کو حیرت ہوئی، خود آگے بڑھ کر آئے، پوچھا کیسے آنا ہوا۔ اور فوراً ان کی خواہش کی تعمیل کے لیے تیار ہو گئے۔ علی گڑھ میں رہتے ہوئے ان معدودے چند فلاحیوں میں تھے جنھوں نے اپنی قدیم وضع نہیں بدلی، کرتا، چوڑا پاجامہ اور شیروانی ان کا لباس رہا۔ کسی کو توقع نہیں تھی کہ ان کے جیسے آدمی کا لکچرر شپ کے لیے انتخاب ہوگا لیکن غیب کی طرف سے انتظام ہو چکا تھا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور ان کے ساتھی سبھی ان کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

جامعۃ الفلاح میں ان کے اساتذہ میں مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ، مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ، مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ، مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی، مولانا محمد سلامت اللہ اصلاحی، مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی، مولانا محمد عمران فلاحی، ماسٹر مناظر احسن صاحبؒ، ماسٹر اکرام الدینؒ صاحب، مولانا نظام الدین اصلاحی، ماسٹر عبداللہ صاحب رہے ہیں اور سب سے زیادہ ان کا تعلق مولانا شہباز اصلاحیؒ سے رہا ہے۔

ڈاکٹر منور حسین فلاحی مرحوم

محمد نہال الدین فلاحی

منور حسین ایک علمی و مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ان کا مطالعہ وسیع اور فکر بالیدہ تھی۔انہوں نے اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ مشرق و مغرب کے فلسفیانہ تصورات، تاریخ، سماجیات اور ادبیات کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا تھا۔عالمی منظرنامے پر خصوصی نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری اور تبصرہ نگاری کے فن سے بھی بخوبی واقف تھے۔مطالعہ کی یہ وسعت اور ذہنی افق کی یہ کشادگی ان کی تحریروں سے ظاہر ہے۔سادگی نفاست پسندی، بردباری، نرم خوئی، کم گوئی، معاملہ فہمی، بشر دوستی، اخلاص و ہمدردی، مہمان نوازی، ایمان داری، قول وقرار کی پاسداری، کارعبث سے دوری، لغویات سے مہجوری اور ضابطۂ اخلاق کی پابندی ان کی شخصیت کی وہ خوبیاں تھیں جنہوں نے انہیں محترم اور ہردل عزیز بنادیا تھا۔

خاندانی پس منظر

کہا جاتا ہے کہ ان کا خاندان ہزار بارہ سو برس قبل جون پور (شیراز ہند) کے محلّہ شیخ پورہ سے پیر الطیف (بہار) بحکم شاہی منتقل ہوا تھا۔ درخواست کی گئی کہ مذہبی رہنمائی کا بھی انتظام کیا جائے۔درخواست منظور ہوئی۔چنانچہ حضرت جہانگیر اشرف سمسائیؒ کے خانوادے کے ایک ولی صفت بزرگ دیوانِ صادقؒ کو قافلہ کے ہمراہ کیا گیا۔اللہ کے خاص کرم اور بزرگوں کے فیوض و برکات کے سبب آج بھی اس خاندان کا دین سے گہرا تعلق ہے۔خاندان کے ایک بزرگ محمد لطیف صاحب مرحوم پیپل کے پیڑ کے نیچے سکونت پذیر ہوئے تھے۔اس لیے قصبہ کا نام 'پیر الطیف' پڑا۔خاندان اور قصبہ کے تعلق سے مولانا محمد وقارالدین ندوی فرماتے ہیں: ''..........خاندان کے جد امجد ہزار بارہ سو سال قبل قاضی کمال الدینؒ کے خلیفۂ مجاز قاضی محمد لطیف صاحب کی قیادت میں ایک چھوٹا سا قافلہ جونپور (یوپی) کے محلّہ شیخ پورہ (جو آج بھی اسی نام سے آباد ہے جس کا مختصر ذکر شیراز ہند جونپور اور تاریخ ظفرآباد میں ملتا ہے) سے بادشاہِ وقت کے حکم پر یہاں آ کر متمکن ہوا تھا۔اس خاندان کا سلسلہ نسب سیدنا ابوبکرؓ صدیق سے جاملتا ہے۔الغرض یہ قافلہ شاہی حکم سے آباد ہوا تھا۔

دین سے بڑی رغبت تھی۔اہل قافلہ کی درخواست پر دینی رہنمائی کے لیے حضرت جہانگیر اشرف سمسائیؒ کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے ایک بزرگ دیوانِ صادقؒ کو ساتھ کر دیا تھا جو تاحیات دینی رہنمائی فرماتے رہے۔ یہ خاندان آج بھی جونپوری کے نام سے مشہور ہے۔ جونپور کے صاحب نسبت بزرگ قاضی محمد لطیفؒ کی قیادت میں یہ قافلہ یہاں پہنچا اور پیپل کے درخت کی چھاؤں میں پڑاؤ ڈالا ،کافی دنوں بعد جب اندازہ ہوا کہ مستقل سکونت اختیار کرنی پڑے گی تب اس کا الگ سے باقاعدہ نام رکھنے کا خیال ہوا۔ چنانچہ متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ چوں کہ یہ قافلہ لطیف صاحب کی قیادت میں آیا ہے اور پہلی قیام گاہ پیپل ہے اس لیے علاقہ کا نام پیپر لطیف رکھا گیا، جو بعد میں پر الطیف ہوگیا۔ نیشنل ہائی وے کے جنوب میں ۵ کلومیٹر کے فاصلے پر دوطرف سے گنگا کے کنارے سے لگنے والا یہ علاقہ جس کا ایک سرا مونگیر سے اور دوسرا سلطان گنج سے جا لگتا ہے، پربتہ تھانہ کے تحت آتا ہے۔اس کا سب ڈیویژن گوگری جمال پور ہے۔اس وقت اس کا ضلع کھگڑیا ہے(جو ۱۹۸۲ء میں ضلع بنا ہے۔اس سے قبل یہ مونگیر ضلع کے تحت آتا تھا۔) جو قصبہ سے شمال مغرب کی طرف ۳۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔اور آزادی کے بعد سے اب تک پارلیمانی حلقہ ہے۔(مولانا علاء الدین ندوی ایک یادگار شخصیت ،مرتب محمد وقار الدین لطیفی ،مطبع گیارہ ستارے، کھگڑیا،ص ۱-۲)

ولادت

نجیب الدین صاحب کے تین بیٹے عبد الحسیب، انوار الحق، محمد طاہر علی اور دو بیٹیاں رابعہ خاتون اور رضیہ خاتون تھیں۔انوار الحق کی شادی سیدہ خاتون سے ہوئی جن سے تین بیٹے منور حسین ،محمد مناظر،محمد صابر الحق اور چھ بیٹیاں کہکشاں خاتون، حبیبہ خاتون، حمیدہ خاتون، زبیدہ خاتون، قانتہ، فاطمہ خاتون ہوئیں۔ بھائی بہنوں میں منور حسین مرحوم سب سے بڑے تھے اور ہر دل عزیز بھی۔ان کی ولادت یکم اگست ۱۹۵۹ء میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت

منور حسین مرحوم کی تعلیم وتربیت ایک علمی ودینی گھرانے میں ہوئی۔ والد انوار الحق جماعت تبلیغی سے وابستہ تھے اور ملک کی موقر دانش گاہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے سند یافتہ۔ یہاں سے انہوں نے بی ایس سی کی ڈگری ۱۹۵۳ء میں حاصل کی تھی۔سائنس، ریاضی اور انگریزی گرامر پر ان کی گرفت مضبوط تھی چنانچہ علاقہ کے افراد ان کے گھر آکر فیض یاب ہوتے۔تدریس کا یہ عمل للہ وفی اللہ ہوتا۔ مجھے بھی ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔طریقہ تدریس انتہائی دل نشیں اور تحریر ایسی خوب صورت جیسے بکھرے موتی۔ بہرکیف۔منور حسین مرحوم کی شخصیت کی تعمیر میں پدرانہ شفقت اور مشفقانہ رہبری بڑی کام آئی۔

منور حسین مرحوم کی تربیت کے سلسلے میں دوسری اہم شخصیت ان کی ماں سیدہ خاتون ہیں۔ یہ زیادہ پڑھی لکھی تو نہیں تھیں لیکن نیک سیرت عالی طبیعت، خوش اخلاق اور سلیقہ شعار خاتون تھیں اور انہیں اولاد کی تربیت کا ہنر خوب آتا تھا۔ چنانچہ فرزندار جمند کی تربیت میں انہوں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ ایسی عظیم مائیں کم بچوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ جو اپنے بچوں کے ذہنی و روحانی نشو ونما پر خصوصی توجہ دیتی ہوں۔ یہ انہیں کی تربیت کا فیضان تھا کہ وہ بچپن سے ہی پاکیزہ مزاج اور خاموش طبیعت تھے اور غیر سنجیدہ حرکات انہیں بالکل پسند نہ تھیں۔

اس سلسلے کی تیسری اہم شخصیت ان کے نانا مولانا مبین الدین کی تھی جو اپنی پاکیزہ طبیعت کی وجہ سے ملا مبین الدین کے نام سے مشہور تھے۔ یہ فرنگی محل، لکھنو کے فارغ التحصیل تھے۔ ایک جید عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر طبیب بھی تھے۔ عمامہ باندھتے۔ طبیعت پاکیزہ اور شخصیت پروقار تھی۔ یہ تمام بچوں میں منور حسین مرحوم کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے۔ نواسے کو بھی ان سے بڑی انسیت تھی۔ خویش و اقارب کہتے ہیں کہ منور حسین مرحوم کی شخصیت پر ان کے نانا کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ ان کے بڑے ابا عبدالحسیب (میرے دادا) اور چھوٹے ابا محمد طاہر علی دونوں گریجویٹ تھے اور پاکیزہ طبیعت کے مالک تھے۔ انہیں پورے محلے کی خبر ہوتی کہ کون مجبور ہے، کون ضرورت مند اور کس کے گھر چولہا نہیں جلا ہے۔ یہ ان کی خبر گیری کرتے اور ان کی ضرورتیں پوری کرتے اور اس سلسلے میں ہندو مسلم کی تفریق نہیں کرتے۔ ان کی غرباء پروری اور مہمان نوازی علاقے بھر میں مشہور ہے۔ ان کے چھوٹے ابا کی علمی مجلسیں بہت مشہور ہیں۔ شام کے وقت بیساہائی اسکول کے جملہ اساتذہ ان کے پاس آتے، علمی گفتگو ہوتی، چائے نوش کی جاتی۔ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد مجلس برخاست ہوتی۔ اگلے دن ٹھیک اسی وقت پر مجلس پھر آباد ہو جاتی۔ یہ سلسلہ ان کی زندگی تک قائم رہا۔ گھر میں بعد نماز فجر تلاوتِ قرآن مجید کا رواج تھا۔ بچے بڑے، بوڑھے، سبھی نماز باجماعت کا اہتمام کرتے، منور صاحب کے والد کی آواز بہت عمدہ تھی، ان کی تلاوت سے سماں بندھ جاتا تھا۔ رمضان میں خصوصی طور پر گھر کا ماحول روح پرور ہوتا۔ آج بھی کم و بیش یہی صورتِ حال ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ گھر کے علمی و مذہبی ماحول نے ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ رشیدیہ، پیر الطیف میں درجہ ہفتم تک ہوئی۔ یہاں وہ امتیازی نمبرات سے پاس ہوتے رہے۔ اعلی تعلیم کے حصول کا مسئلہ درپیش تھا، والد کی خواہش تھی کہ اپنے لخت جگر کے لیے کسی مثالی تعلیمی و تربیتی ادارہ کا انتخاب کریں، قدرت نے ان کی رہنمائی کی اور سبب جامعۃ الفلاح کے سفیر بنے۔ والد کا بیان ہے کہ رمضان کا مبارک مہینہ تھا خوش قسمتی سے جامعہ کے سفیر آئے ہوئے تھے، ملاقات ہوئی دوران گفتگو

سفیر نے جامعۃ کے تعلیمی وتربیتی نظام کا تعارف ایسے سحرانگیز طریقے سے کرایا کہ ان کی مشکل آسان ہوتی ہوئی نظر آئی۔ دل آمادہ ہوا، تصدیق کے لیے وہ مولانا انصار الحق اصلاحی قاسمی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے تائید کی، پھر کیا تھا؟ درخواست ارسال کی گئی۔ منظوری ملی اور جامعہ میں عربی دوم میں داخلہ ہوا۔ والد بتاتے تھے کہ انگریزی مضمون میں کمزور تھے۔ انگریزی کے استاذ نے انہیں تسلی دی کہ صاحب زادے بہت جلد اپنی کمزوری پر قابو پالیں گے۔ چنانچہ ہوا بھی یہی، استاد اور شاگرد نے محنت کی، والد نے خط وکتابت کے ذریعہ انہیں گرامر پڑھائی اور جب رمضان کی تعطیل میں گھر آئے تو انگریزی کے ایک پیراگراف کا ترجمہ کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے ایسا نفیس ترجمہ پیش کیا کہ والد حیران ہو گئے۔ یہاں سے انہوں نے عالمیت (۱۹۷۴ء) اور فضیلت (۱۹۷۶ء) کی اسناد حاصل کیں۔

فراغت کے بعد ان کی شادی ہوئی، وہ حساس طبیعت کے مالک تھے، والد پر بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے چنانچہ تقریباً ۵ سال تک فکر معاش میں سرگرداں رہے۔ والد کی خواہش تھی کہ ان کی طرح وہ بھی سرسید کے چشمۂ فیض سے فیض یاب ہوں۔ فکر معاش اس کی اجازت نہ دیتی تھی۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک دن ایک واقعہ پیش آیا، جو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں حصول علم کا سبب بنا۔ ہوا یوں کہ ایک دن منور حسین کے چچا محمد طاہر علی جنہیں وہ چھوٹے ابا کہتے کسی بات پر اپنے بیٹے اطہر علی کی فہمائش بلکہ سرزنش کر رہے تھے کہ بڑے بھائی انوار الحق (منور حسین کے والد) کا ادھر سے گزر ہوا۔ وہ بھائی پر یہ کہتے ہوئے برس پڑے کہ ''آپ بلاوجہ بچہ کو بات بات پر ٹوکتے رہتے ہیں جب کہ بچہ شریف بھی ہے اور مطیع بھی۔ ایک میرا بچہ ہے کہ بات ہی نہیں مانتا۔ برسوں سے علی گڑھ علی گڑھ کی رٹ لگا رہا ہوں مگر صاحب زادے ہیں کہ مان کر نہیں دیتے۔'' انہیں مطلق خبر نہ تھی کہ جس صاحب زادے کی بات کر رہے ہیں وہ پاس ہی کے کمرے میں کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ والد کی یہ بات ان کے دل کو لگی۔ خاموشی سے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں داخلہ کی کاغذی کارروائی کی، منظوری ملی، سفر کی تیاری شروع ہوگئی۔ ایک دن صبح سے شام تک گھر سے غائب رہے جب کہ وہ گھر سے باہر نکلتے تو بتا کر جاتے لیکن اس دن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ان کا معمول تھا کہ عصر کی نماز پچھّم محلّہ کی مسجد میں پڑھتے۔ عشرت خالہ کے پاس عصر سے مغرب رہتے، مغرب کی نماز پڑھ کر سیدھے گھر آتے۔ لیکن اس دن خالہ کے یہاں بھی غیر حاضری لگی تھی اور گھر بھی اب تک نہیں آسکے تھے۔ تشویش بڑھتی رہی کہ اچانک ورود مسعود ہوا۔ سب کے لب خاموش تھے نامعلوم خوف کی وجہ سے، عشاء کا وقت ہو رہا تھا۔ دسترخوان لگا، سب کھانے پر بیٹھے۔ راز کھلا کہ علی گڑھ سے منظوری آچکی ہے۔ کل سفر درپیش ہے۔

والد کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا، پوچھا گیا یہ سب کچھ اچانک کیسے؟ جواب میں پچھلے واقعہ کا حوالہ دیا، والد یہ قصہ بار بار سناتے اور آبدیدہ ہو جاتے۔ غائب رہنے کی وجہ منور حسین صاحب نے تو نہیں بتائی مگر ان کے والد کا خیال تھا کہ وہ مجھ پر سفر اور تعلیمی اخراجات کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے وہ پیسوں کے انتظام میں لگے ہوں گے۔ بہر کیف والد کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں جامعہ سے فراغت کے تقریباً پانچ سال بعد داخلہ ہوا۔ یہاں سے ۱۹۸۴ء میں بی اے، ۱۹۸۶ء میں ایم اے (اردو)، ۱۹۸۸ء میں ایم فل اور ۱۹۹۲ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۹۴ء میں شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں تقرر ہوا۔ کچھ آسودگی آئی دوہرہ علی گڑھ میں زمین لے رکھی تھی۔ مکان بننے ہی والا تھا کہ لامکاں سے بلاوا آ گیا اور مختصر سی علالت کے بعد ۱۸ستمبر ۲۰۰۰ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ میت وطن لائی گئی۔ ۱۹ستمبر ۲۰۰۰ء کو آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت اور جنت میں درجات بلند فرمائے، آمین

ازدواجی زندگی

منور حسین صاحب ابھی انیس برس کے ہی تھے کہ ۱۹۷۸ء میں ان کی شادی پروین کوثر بنت جنید احمد صدیقی سے ہوئی جو رشتہ میں ماموں زاد بہن بھی ہیں اور خالہ زاد بہن بھی۔ پروین کوثر نیک دل، سلیقہ مند، خاموش طبیعت اور مہمان نواز خاتون ہیں۔ ان سے پانچ اولادیں ہوئیں۔ ہاجرہ خاتون (اہلیہ آصف اقبال) زہرا خاتون (اہلیہ بلال احمد میرے چھوٹے بھائی) نافعہ منور (اہلیہ محمد فیصل) محمد معظم حسین اور اعظم حسین۔ ہاجرہ زہرا، نافعہ اور معظم شادی شدہ ہیں اور اعظم کے ابھی بےفکری کے دن ہیں۔

عادات وخصائل

منور حسین سادہ مزاج، خاموش طبیعت، قناعت پسند، ہمدرد، غریب پرور اور مہمان نواز انسان تھے۔ باتیں کم کرتے، بے موقع کبھی نہیں بولتے، احباب ومتعلقین کا خاص خیال رکھتے۔ ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرتے۔ احباب ومتعلقین کا حلقہ وسیع تھا۔ سب کا خیال رکھتے۔ علی گڑھ آتے تو ان کے مہمان ضرور بنتے، وطن سے علی گڑھ بغرض علاج آنے والوں کا ایک لمبا سلسلہ تھا جو ان کی حیات تک قائم رہا۔ کبھی کبھی تو گھر میں قیام کی گنجائش نہیں ہوتی پھر بھی کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکالتے۔ مہمانوں کے قیام، طعام کا نظم انہیں کے گھر ہوتا۔ میڈیکل میں ایڈمٹ مریض کے لیے کھانا خود لے کر جاتے۔ بہت سے غریب مریضوں کے سفر اور علاج کے اخراجات خود برداشت کرتے، ان کے ایک ہم سبق اور رفیق کار مولانا ابراہیم صاحب

اصلاحی کا بیان ہے کہ انہیں ٹی بی کا عارضہ لاحق تھا، لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ صحت یابی کی امید نہ رہی۔ اتفاقاً ضیاء الدین صاحب مرحوم جو ہمارے رشتہ دار تھے اور علاقے کے امیر کبیر آدمی بھی، اپنے ساتھ مولانا ابراہیم صاحب کو علی گڑھ لے گئے۔ منور حسین فلاحی کے گھر قیام رہا۔ حکیم کلیم اللہ صاحب سے انہیں دکھایا گیا۔ برسوں علاج چلتا رہا اور وہ صحت یاب ہو گئے۔ ابھی تک الحمدللہ بقید حیات ہیں۔ علی گڑھ سے دوا وطن پابندی سے آتی رہی اور یہ سارے اخراجات منور حسین مرحوم نے برداشت کیے۔ جب بھی ان کا خیال آتا ہے دل سے دعا نکلتی ہے۔

پچھلے سال ایک قلندر صفت انسان سے ملاقات ہوئی معلوم ہوا کہ منور حسین مرحوم سے وہ عشق کی حد تک عقیدت رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر کوئی پیر کے لائق ہو سکتا ہے تو وہ منور صاحب کی ذات تھی۔ انہوں نے بتایا کہ میرے مشفق، میرے مرشد، میرے بڑے بھائی سبھی کچھ تھے وہ۔ زندگی کے مختلف معاملات میں انہیں سے رہنمائی حاصل کرتے۔ مشورے پر کلی اطمینان کے ساتھ عمل کرتے۔ انہوں نے مرحوم کے بچوں کے فون نمبر لیے، ان سے باتیں کیں ممکنہ تعاون کی پیش کش کی۔ وقفے وقفے سے وہ بچوں کی خیریت معلوم کرتے رہتے ہیں۔ موت کے بعد بھی کسی سے ایسی محبت ایک شریف انسان ہی کر سکتا ہے۔ ان کی یہ محبت قابل رشک بھی ہے اور لائق ستائش بھی۔ اللہ انہیں صحت وعافیت کے ساتھ رکھے۔ آمین۔ انہیں کی ذاتی دلچسپی اور مالی تعاون سے مرحوم کا پی ایچ ڈی کا مقالہ زیور طبع سے آراستہ ہوسکا ہے۔ اللہ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔ آمین۔ اس ذات گرامی کا نام نامی محمد عرفان ہے جو بیرون ملک دبئی میں مقیم ہیں۔

خودداری ایک بہترین انسانی صفت ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے وجود کی اہمیت کو پہچانتا ہے اور پروقار زندگی گزارتا ہے۔ منور حسین فلاحی بھی اس صفت سے متصف تھے۔ ہزار مشکل حالات آئے لیکن کسی کی طرف امید کی نظروں سے نہیں دیکھا۔ کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ وسائل اور مال وزر کی کمی اس قدر قابل افسوس نہیں ہے جس قدر انسان کا جذبۂ خودداری سے عاری ہونا۔ مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی نے انہیں مشورہ دیا کہ شعبہ کے اساتذہ سے راہ ورسم رکھیں، ان کا اشارہ دراصل اس جانب تھا کہ اس تعلق سے ملازمت میں آسانی ہوگی۔ جواب ملا: ''میں روزی روٹی کی بھیک نہیں مانگ سکتا۔''

وہ خوش مزاج، ملنسار اور ٹھنڈے مزاج کے انسان تھے۔ کبھی کسی سے الجھتے یا آپے سے باہر ہوتے نہیں دیکھا۔ جب بھی وطن آتے احباب ومتعلقین سے فرداً فرداً ان کے گھر جا کر ملتے۔ وہ بھی ان سے بے حد محبت

کرتے۔ان کی پسند و ناپسند کا خیال رکھتے۔ بیشتر ایام دعوت ہی میں گزرتے۔کھانے میں انہیں فرائڈ مچھلی بہت پسند تھی۔ان کی خوراک بہت کم تھی۔تنخواہ ملتی تو مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ گھر آتے۔انہیں میٹھا بھی بہت پسند تھا۔وطن سے علی گڑھ آنے والوں کے ساتھ حلوے اور مٹھائیاں ضرور آتیں۔گلاب جامن انہیں بہت پسند تھا۔

بچوں کے ساتھ ان کا معاملہ نہایت شفقت اور محبت کا ہوتا،ان کی ہر آرزو پوری کرنے کی کوشش کرتے، ان کا ہر بچہ یہ سمجھتا کہ ابو سب سے زیادہ پیار مجھ سے کرتے ہیں۔میرا احساس ہے کہ نافعہ اور اعظم کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے۔اس لیے کہ یہ سب سے چھوٹے تھے اور بچوں کی معصوم حرکتیں دیکھ کر کس کے دل کی کلیاں نہیں کھلتیں؟ گھر میں قدم رکھتے ہی بچوں میں خوشی کی لہر سی دوڑ جاتی اور صدا بلند ہوتی کہ ''ابو آئے ابو آئے''،لیکن ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ''

میرے والد اور منور حسین مرحوم رشتہ میں چچازاد بھائی تھے، اس طرح ان سے میرا رشتہ چچا بھتیجے کا تھا۔وہ مجھے بے حد عزیز رکھتے۔ان سے میرا رشتہ ایک اور بھی تھا،استاد اور شاگرد کا۔کلاس میں وہ بھرپور تیاری کے ساتھ آتے،طریقہ تدریس دل نشیں اور شخصیت اس سے زیادہ جاذب نظر تھی۔میرے ایک ہم سبق تھے نام ان کا آفتاب عالم تھا۔ مجھے کلاس سے دو دن غیر حاضر پاکر پوچھا: ''بھائی کہاں ہو؟'' جواب میں میں نے بس اتنا کہا'' کلاس سے میں جب بھی غیر حاضر رہوں میڈیکل یا ریلوے اسٹیشن آجایا کرو ملاقات ہوجائے گی۔میرا یہ عجیب سا جواب سن کر وہ حیران ہوئے۔پوچھا بھائی ماجرا کیا ہے؟ میں نے انہیں پہیلی سمجھائی، جواب سن کر بے ساختہ ہنس پڑے۔ان کی منور صاحب سے تھوڑی بے تکلفی تھی،انہوں نے یہ واقعہ ان سے بیان کیا۔اگلے دن چچا سے میری ملاقات ہوئی،نظر ملتے ہی مسکرانے لگے،کہا بھائی نہال! وطن سے لوگ علی گڑھ ہم سے بڑی امیدیں لے کر آتے ہیں، ہماری تھوڑی سی کوشش اور محنت سے ان کی بڑی مشکلیں آسان ہوجاتی ہیں۔جواب دیا میں نے تو یہ بات از راہ مذاق کہی تھی۔

ان کا خیال تھا زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں مگر زندگی کو زندگی کی طرح جینے سے زندگی خوب صورت،خوش گوار اور بامعنی ہوجاتی ہے اور تاریخ کے صفحات پر نقش جاوداں چھوڑ جاتی ہے۔

ان کی شخصیت علمی لیاقت،تحریکات سے وابستگی اور علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالنا احباب اور اہل قلم کا حق ہے۔ مجھے تو ان کے خاندانی پس منظر اور ان کی شخصیت کی تعمیر میں کارفرما عناصر پر گفتگو کرنی تھی سو جو کچھ ہوسکا پیش کی۔

مولوی چراغ علی کی بازیافت

امتیاز وحید

دانش کدہ علی گڑھ کے پروردہ اور شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر منور حسین فلاحی مرحوم ہمہ جہت خوبیوں کے مالک تھے۔ ادب، تحریک، تحقیق، تنقید، دینیات، صحافت اور شرافت نفسی ان کی پر کشش شخصیت کے تکوینی عناصر تھے۔ چہرے بشرے سے مولویانہ شان ٹپکتی تھی۔ دینی مدرسہ جامعۃ الفلاح سے فارغ التحصیل عالم باعمل تھے۔ شیروانی، پاجامہ اور ٹوپی پہنے علی گڑھ کی ٹھیٹھ روایتی وضع قطع میں لامبے قد کے دھان پان سے منور حسین صاحب کا علمی قد نہایت بلند تھا۔ طلبہ تحریک اور ادارۂ تحقیق وتصنیف سے وابستگی، رفیق منزل کی ادارت، مستقل تحریکی سرگرمیاں ساتھ ہی مضامین اور مقالات کی تحریر وتسوید، ترجمہ اور شعبہ جاتی تعلیمی، تدریسی اور تحقیقی امور کی انجام دہی، مرحوم کے معمول کا حصہ تھا۔ نسبتاً کم عمر پائی، اس کے باوجود موصوف نے قابل لحاظ علمی اثاثہ چھوڑا ہے۔

ڈاکٹر منور حسین فلاحی مرحوم کی کتاب 'مولوی چراغ علی کی علمی خدمات' سرسید تحریک کے ایک فعال رکن مولوی چراغ علی کی حیات اور ان کی علمی سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ کتاب دراصل مقالہ امتحانیہ ہے جو انھیں ایم فل کے لیے شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی جانب سے تفویض ہوا تھا۔ علی گڑھ کے تناظر میں مولوی چراغ علی محتاجِ تعارف نہیں۔ موصوف اپنے دور کے متحرک، زبان و بیان اور دفتری اور انتظامی امور میں طاق ایک باوقار اور ذی علم شخص تھے، جس کا اظہار دفتری امور سے متعلق ان کے مسودات، مضامین، اردو اور انگریزی تصانیف میں ان کے استدلالی طرزِ بیان اور اسلوب سے بخوبی ہوتا ہے۔ ہم عصر مشاہیر نے ان کی صلاحیت کا لوہا مانا ہے۔ ان کے انتقال پر نظام حکومت نے اپنے جریدۂ اعلامیہ احکام سرکار نظام الملک آصف جاہ میں لکھا: ''......مرحوم ایک نہایت لایق کارگزار، واقف کار، ذی علم، مستقل مزاج اور سنجیدہ عہدہ دار تھے۔ نواب مدارالمہام سرکار عالی مکرر اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ طبقہ عہدہ داران میں سے مولوی چراغ علی

صاحب مرحوم کے ایسے منتخب اور برگزیدہ شخص کے انتقال سے سرکار کو درحقیقت بہت نقصان پہنچا''۔(۱) زندگی کے آخری دو سال مولوی چراغ علی نظام حکومت میں پولٹیکل اور فائنانس کے اعلیٰ عہدہ پر فائز رہے۔ اس طرح گویا ایک کام یاب ترین زندگی گزاری۔

مولوی چراغ علی کی شخصیت کا ایک روشن باب علی گڑھ تحریک سے ان کی علمی اور فکری وابستگی ہے۔ وہ ہمیشہ علی گڑھ تحریک کے میر کارواں کے ہمدوش رہے۔ سرسید سے ان کا تعارف گرچہ سیتا پور تبادلہ کے بعد ہوا اور قربت کی ابتدا خط و کتابت سے ہوئی تاہم لکھنو میں ملاقات کے بعد وہ سرسید کے مدرستہ العلوم، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور فکر سرسید کے علم بردار ہو گئے۔ سرسید کی ایما پر علی گڑھ کا سفر کیا اور آخر کار سرسید تحریک کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ ان کے انتقال پر سرسید نے چراغ علی کی خوبیوں کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''......ان کو بجز اپنے کام کے کسی سے کچھ کام نہ تھا۔ ان کو بجز اپنے کام اور علمی مشغلے کے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حیدرآباد میں اور دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ انگریزی زبان میں بھی انھوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مذہب اسلام کے ایک فلاسفر حامی تھے۔ ہمارے بڑے دوست تھے''۔(۲)

سرسید اور علی گڑھ تحریک سے مولوی چراغ علی کی نسبتِ خاص کو ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے شمارہ ۲۱ اور ۲۸ رمئی ۱۸۷۵ء، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸/ مارچ ۱۸۹۰ء اور دی ایم اے او کالج میگزین، اگست ۱۸۹۵ کے حوالوں سے علی گڑھ سے ان کی مختلف حیثیتوں سے وابستگی کی تفصیل پیش کی ہے اور مولوی صاحب کے نام سرسید کے اس محبت آمیز مکتوب (۱۲/ جون ۱۸۹۴ء) کو بھی نقل کیا ہے جس میں سرسید نے لکھا ہے کہ ''اب حیدرآباد میں سوائے آپ کے کوئی دوست نہیں ہے اس لیے آپ کو کالج کے امور کی نسبت زیادہ تر خیال رکھنا لازم ہے۔......اس قصہ کے لکھنے سے مقصد یہ ہے کہ آپ وہاں ہیں اور کالج کے ہر ایک امر کا لحاظ اور خبرگیری صرف آپ کی ذات سے توقع کی جاتی ہے''۔(۳)

چناں چہ ۱۸۹۰ء میں لا کلاس کے لیے درکار سرمایہ کی فراہمی کے سلسلے میں مولوی صاحب کو کمیٹی کا ممبر نامزد کیا گیا۔ مولوی صاحب اے ایم او کالج کے ٹرسٹی بھی بنائے گئے اور اس حیثیت میں انھوں نے کالج کی بڑی معاونت کی۔ اس مقدس رشتے کا نقطۂ عروج سرسید کے نام مولوی چراغ علی کی کتاب Critical exposition of the popular Jihad (اردو ترجمہ: تحقیق الجہاد) کا انتساب اور اس پر تحریر کردہ یہ عقیدت مندانہ عبارت ہے:

''یہ کتاب، محترم جناب سید احمد خاں بہادر سی ایس آئی کے نام مصنف کی طرف سے ان کی

اجازت کے بغیراوران کی سراسرلاعلمی میں،اسلام کے لیےان کی طویل اورمتنوع خدمات اور ہندی مسلمانوں میں ان کی مذہبی و سماجی اصلاحات کے لیے ایک معمولی لیکن سنجیدہ اعتراف تحسین کے طور پر، نیز ان کی ذاتی شفقتوں، مہربانیوں اور دوستانہ مراسم کے سلسلے میں جذبۂ تشکر کے اظہار کی خاطر۔۔۔۔معنون کی جاتی ہے‘‘۔(۴)

اس سیاق سے یہ جاننا مشکل نہیں رہتا کہ چراغ علی کی ذات اور شخصیت کس قدر بامعنی اور علی گڑھ سے ان کا رشتہ کس درجہ پختہ اور شعوری تھا۔اپنے کام اور علم و آگہی سے ان کی والہانہ نسبت کو سمجھ پانا بھی قدرے آسان ہو جاتا ہے کہ محقق نے ایک ایسے لائق فرد کا انتخاب کیا ہے جو نہ صرف دفتری امور کا مشاق اور ماہر ہے بلکہ صاحبِ بصیرت بھی ہے؛ خود علم کا جویا ہے، ذوقِ مطالعہ سے سرشار ہے، قلم اور قرطاس سے گہری نسبت رکھتا ہے اور عملاً ایک ایسے قافلہ کا رکن رکین ہے جو علمی اور فکری محاذ پر قوم اور ملک کی بھلائی اور راہ نمائی کے لیے وقف ہے۔

پچانوے صفحات پر مشتمل ڈاکٹر منور حسین فلاحی کی یہ کتاب سرسید کے ایک ہم خیال عالم مولوی چراغ علی سے روشناس کرانے کی ایک قابل قدر کوشش ہے۔اس میں آبا و اجداد، پیدائش، تعلیم، ملازمت، قیامِ حیدرآباد، مرضِ وفات، وفات پر تعزیتی پیغامات، پس ماندگان، شخصیت، علمی خدمات، مطبوعہ تصانیف، تہذیب الاخلاق میں مطبوعہ مضامین، غیر مطبوعہ اور دیگر تصانیف، طرزِ تحریر وغیرہ تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔حسبِ ضرورت حواشی اور تعلیقات کا اہتمام بھی ہے۔تجزیہ، نقد و تنقیح یا حقائق کی توثیق میں استدلالی رویہ اپنایا گیا ہے۔قیاسی امور میں بھی قرین قیاس مفہوم کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کی سعی کی گئی ہے۔یہاں یہ جاننا بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ منور حسین کے تحقیقی رویے میں حقائق اور دلائل کی موجودگی میں بڑے عالم یا فاضل کے مفروضے یا تحریر کی تردید کی جرأت ملتی ہے اور روایت سے انحراف کے بعد خود کار راہ اپنانے اور اس کے اظہار کی جسارت بھی۔اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

مبحث کا آغاز آبا و اجداد سے ہوتا ہے۔آبائی پس منظر کے تعلق سے کہ آیا مولوی چراغ علی کے والد کا نام محمد بخش تھا یا خدا بخش، محقق ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے سید غلام پنجتن کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ چراغ علی کے والد کا نام خدا بخش تھا اور اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام جلد دوم کے مقدمہ میں تحریر کردہ سوانحی حالات کے حوالے سے مولوی عبدالحق کی تائید کی ہے کہ ان کے والد کا نام محمد بخش تھا اور جسے تقدم زمانی کی بنیاد پر ڈاکٹر کبیر احمد جائسی نے بھی راجح قرار دیا ہے۔نریش کمار جین نے Muslims in India اور ڈاکٹر حسن

الدین احمد نے اپنے سوانحی مضامین کے مجموعہ 'محفل' میں یہی لکھا ہے۔ اس طرح وہ اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ ''مولوی چراغ علی کے حالات زندگی کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کا مضمون ہی بنیادی حیثیت رکھتا ہے، تمام تذکرہ نویس ان کے خوشہ چیں نظر آتے ہیں''۔(۵)

سن پیدائش کے اختلافی مسئلہ میں بھی مختلف تذکرہ نویسوں کے علی الرغم محقق نے داخلی اور خارجی شواہد کی بنیاد پر '۱۸۴۴ء' کو پیدائش کی اغلب تاریخ تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''ان میں ایک بات کم وبیش مشترک نظر آتی ہے، وہ یہ کہ والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر دس تا بارہ سال تھی اور یہ بات بھی متفق علیہ ہے کہ ۱۸۵۶ء میں ان کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ اس طرح مولوی چراغ علی کا سنہ پیدائش ۱۸۴۴ء اور ۱۸۴۶ء کے درمیان قرار پاتا ہے''۔(ص۱۲) محقق نے اپنے موقف کو ڈاکٹر حسن الدین احمد کی رائے سے تقویت بہم پہنچائی ہے، ساتھ ہی پی۔ہارڈی کی کتاب The Muslim of British India اور نریش کمار جین کی کتاب Muslims in India کا حوالہ بھی نقل کیا ہے جس میں ۱۸۴۴ء کی تعین کی گئی ہے۔

تعلیم کے ضمن میں ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے مولوی عبدالحق کی اس رائے سے عدم اتفاق کیا ہے کہ ''مولوی چراغ علی نے اپنی دادی اور والدہ کے زیرِ سایہ میرٹھ میں تعلیم پائی، لیکن یہ تعلیم بالکل معمولی تھی اور سوائے اردو، فارسی اور انگریزی کے نہ کسی اور علم کی تحصیل کی اور نہ کوئی اور امتحان پاس کر پائے''۔(۶) محقق کی نظر اس نکتہ پر ہے کہ مولوی چراغ علی کی ملازمت ضلع بستی کے محکمہ خزانہ میں منشی گیری یا Subordinate Clerk کی جگہ پر ہوئی، جس کا حصول اس زمانے میں اطمینان بخش تعلیم کے بغیر محال نہیں تو دشوار ضرور تھا۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ''......مولوی چراغ علی والد کی زندگی میں عمر کی بارہ منزلیں یا اس سے کچھ کم طے کر چکے ہوں اور انھیں اپنے والد کے زیرِ نگرانی دورانِ ملازمت حصولِ تعلیم کا موقع نہ ملا ہو۔......ایک ایسا انگریزی تعلیم یافتہ جس کے چار بچے ہوں وہ اپنے سب سے بڑے بچے کی تعلیم وتربیت کی فکر نہ کرے، یہ ناممکن ہے۔''(۷) یہ اور اس طرح کے بیشتر امور میں محقق نے نہایت سنجیدگی سے معاملہ کے ابعاد پر ٹھہر کر غور و فکر سے کام لیا ہے اور عرف عام میں معروف یا روایتی طور پر مقبول آرا سے استدلالی انحراف کی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر منور حسین نے چراغ علی کی ملازمت کے مختلف دورانیہ کا اجمال بھی پیش کیا ہے۔ البتہ جہاں کہیں انھیں مطلوبہ مواد کی تلاش میں ناکامی ہاتھ آئی ہے، وہاں اس کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''ہمیں

افسوس ہے کہ ان کی ملازمت کی ابتدائی تاریخ ہمیں دستیاب نہیں ہوسکی''۔(۸)اسی طرح 'پس ماندگان' کے ضمن میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ''یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ان کی شادی کہاں ہوئی اور ان کی اہلیہ کا کیا نام تھا''۔(ص۲۰) یہ علمی صداقت (Academic Honesty) ہمیں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ملازمت کی نوعیت اور ترتیب کے معاملہ میں محقق کا خیال ہے کہ''مولوی عبدالحق صاحب کا بیان عام طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے لیکن ان کی تنخواہ کا بیان محلِ نظر ہے''۔(۹) اور پھر حیدرآباد کی مفصل تاریخ 'بستانِ آصفیہ' از مسٹر مانک راؤ کے بیان کو نقل کرنے کے بعد محقق رقم طراز ہیں:

''......دوسری خاص بات تنخواہوں کا ذکر ہے۔ابتدائی دو تنخواہوں کا بیان مولوی عبدالحق صاحب کے بیان سے بدیہی طور پر مختلف ہے۔غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں مولوی صاحب سے چوک ہوئی ہے۔......تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ اس مسئلہ میں ایک مشترک غلطی تمام سوانح نگاروں کے یہاں پائی جارہی ہے''۔(۱۰)

محقق نے اپنے قیاسی موقف کا استنباط اور استدلال درج ذیل شواہد وقرائن کی روشنی میں کیا ہے:

''اوّل یہ کہ معتمد اور نائب معتمد کی تنخواہوں میں اس قدر فرق ہو،اس بات پر بہ آسانی یقین کرنا مشکل ہے۔ایک بیان کے مطابق ۴۰۰ اور ۱۵۰۰ کا فرق اور اضافہ کے لحاظ سے ۷۰۰ اور ۱۵۰۰ کا فرق۔

دوم یہ کہ مولوی عبدالحق کی بیان کردہ تنخواہیں اپنے تین مختلف مدارج میں غیر فطری اور غیر متوازن معلوم ہوتی ہیں۔۴۰۰،۷۰۰،۱۵۰۰ جب کہ بستان آصفیہ کی ذکر کردہ تنخواہوں میں ایک توازن ہے۔۸۰۰،۱۲۰۰،۱۵۰۰''۔(۱۱)

تنخواہ کے صیغے میں بھی ڈاکٹر منور حسین نے مولوی عبدالحق صاحب سے اختلاف رائے کے منطقی اسباب ڈھونڈ ھے اور استدلالی انداز میں 'چوک' اور تذکرہ نویسوں کی مشترکہ غلطی کی نشان دہی کی ہے۔تحقیق اسی علمی جرأت اور حقائق کی تلاش کا نام ہے اور یہ فریضہ ڈاکٹر منور حسین نے بڑی ایمان داری سے ادا کیا ہے۔ البتہ مولوی چراغ علی کی تدفین سے متعلق دو متضاد آرا کہ آیا چراغ علی کی تدفین بمبئی کے قبرستان میں ہوئی (بحوالہ چند ہم عصر از مولوی عبدالحق) یا یہ کہ لاش بلدہ (حیدرآباد) لائی گئی اور یہیں تدفین ہوئی (مؤلف بستان آصفیہ)،کو محض نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور کسی حتمی امر کی نشان دہی نہیں کی ہے۔

پس ماندگان کے ضمن میں سب کا اتفاق ہے کہ مولوی چراغ علی کے پانچ بیٹے تھے'' البتہ اس میں

اختلاف ہے کہ دختر ایک تھی یا دو'۔(۱۲) مرزا ظفر الحسن صاحب کے مقابلے میں محقق ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے ڈاکٹر حسن الدین احمد کی رائے کو اس لیے ترجیحاً قبول کیا ہے کہ انھوں نے دونوں بیٹیوں حمیدہ بیگم اور سعیدہ بیگم کے نام کی صراحت بھی کر دی ہے اور پھر ان کے فرزندوں کے اسماء، تعلیمی لیاقت اور ملازمت وغیرہ کی تفصیلات فراہم کی ہیں اور ان تفصیلات کا ماخذ مرزا ظفر الدین کی کتاب 'دکن اداس ہے یارو'، ڈاکٹر حسن الدین احمد کی کتاب 'محفل' اور بعض امور کے تعلق سے مولوی عبدالحق کی کتاب 'چند ہم عصر' کو بتایا ہے۔

مطالعہ، مولوی چراغ علی کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ علم و آگہی سے انھیں حد درجہ لگاؤ تھا۔ تعلیم کے بہتر مواقع میسر نہ آنے کے باوجود محض ذاتی مطالعہ نے ان کی شخصیت کو قابل رشک بنا دیا تھا۔ ہم عصروں میں وہ بے حد محترم تھے اور اس توقیر میں ان کے علم و فضل اور ان کی لیاقت کا بڑا دخل تھا۔ ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے مولوی صاحب کے ذوقِ مطالعہ، کثرتِ مطالعہ اور کتب بینی میں ان کے غایت انہماک کے حیرت انگیز واقعات بھی نقل کئے ہیں۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے اپنے بالیدہ ذوق کے سبب مولوی صاحب موضوع کی جزئیات اور ابعاد تک رسائی کے ممکنہ جتن کرتے۔ معتمد فائنانس کی حیثیت سے انھوں نے فائنانس پر جملہ کتب کا مطالعہ کیا۔ تلاش کتب ان کے مطالعاتی نیچر کا ایک اہم عنصر تھا، جس کے لیے انھوں نے عبداللہ ٹونکی کو مصر بھیجا۔ ان کی لیاقت اور صلاحیت پر اعتماد کا یہ عالم تھا کہ حیدرآباد سے ترجمہ کا جو کام سرسید کو تفویض ہوا تھا، سرسید نے وہ کام انھیں سپرد کر دیا۔ ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین اور نرلیش کمار جین کے حوالوں سے مولوی صاحب کی عربی زبان و عربی علوم، فارسی زبان، عبری و کالدی زبان میں ان کی مہارت اور لیٹن اور گریک زبانوں میں بقدر ضرورت شد بد کے شواہد اور اعتراف نامے پیش کیے ہیں۔

ذوقِ مطالعہ کے سبب مولوی چراغ علی نے تصنیفی شعبہ میں بھی بڑی خود اعتمادی سے قدم رکھا۔ ابتدا 'تعلیقات' کے نام سے پادری عماد الدین کی کتاب 'تاریخ محمدی' کے جواب سے ہوئی اور رفتہ رفتہ تیز گام ہوتے چلے گئے۔ مخبر صادق اور منشور محمدی جیسے رسائل میں مضامین کا سلسلہ شروع ہوا۔ سرسید سے قربت کے بعد تہذیب الاخلاق میں مستقل چھپنے لگے۔ ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے مولوی چراغ علی کی علمی خدمات کے ضمن میں اس پس منظر پر اجمالی گفتگو کی ہے جو مغلیہ حکومت کی پسپائی کے بعد برصغیر کو سیاسی، تہذیبی اور فکری محاذ پر لاحق تھا۔ اسلامی عقائد اور مسلمات کے بیشتر امور مطاعن اور اعتراضات کی زد میں آ گئے۔ ایسے میں علماء اور دانشوروں نے اپنی قوم کی بقا کے لیے جو متعدد محاذ قائم کیے ان میں اہم محاذ مغرب کی فکری یلغار اور تہذیبی

یورش کا علمی اور عقلی یا منطقی بنیادوں پر مقابلہ ہے۔ دینی علماء کا ایک طبقہ اسلامی احکام کی منطقی توجیہ پیش کرتا ہے اور روایتی تعبیر کو مقدم گردانتا ہے، جب کہ دوسرا طبقہ ان کی عصری تعبیر کو پیش نظر رکھتا ہے اور عقلی توجیہ کی راہ اپناتا ہے۔ سرسید دوسرے طبقے کا سالار قافلہ تھے اور کم وبیش مولوی چراغ علی بھی سرسید کے موید اور ہم خیال تھے۔ سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ ''اگر نیچری کے لفظ کا اطلاق سید صاحب پر ہوسکتا ہوتو ہم مولوی چراغ علی کو ان سے کم نیچری نہیں کہہ سکتے''۔(۱۳) چناں چہ مولوی چراغ علی کا موضوعِ تحقیق بھی تقریباً وہی تھا جس پر سرسید کی تمام تر قوتیں صرف ہوئی ہیں۔ وحدتِ ذوق کے سبب ان اکابرین کی بیشتر تصانیف مابعد اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء) کے حالات کی زائدہ معلوم ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر منور حسین فلاحی لکھتے ہیں:

> ''مولوی چراغ علی کی تمام تصانیف کا پس منظر یہی حالات ہیں۔......ان میں سے کچھ کتابیں کسی کتاب کے جواب میں لکھی گئی ہیں تو کچھ اپنے اس خیال کی توضیح کے لیے کہ اسلام کی اصل تصویر کیا ہے یا اسلامی قوانین ومسائل کی اصل حیثیت کیا ہے اور یہ کہ اسلام کو دیگر مذاہب پر کیوں کر برتری حاصل ہے۔ اس ضمن میں مسلمانوں میں رائج اسلام کے روایتی تصور کو غلط اور قابلِ ترمیم و اصلاح ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اسی لیے اسلام کے روایتی تعبیر و تشریح کرنے والے علما کے جواب میں انھوں نے مضامین لکھے''۔(۱۴)

تالیفات اور تصانیف مولوی چراغ علی کے ضمن میں ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے ابتدا مولوی صاحب کی تصنیف 'تعلیقات' کے سلسلے میں ایک غلط فہمی کے ازالہ سے کی ہے کہ یہ پہلی نہیں بلکہ 'ردشہادت قرآنی برکت ربانی' ان کی اولین تصنیف ہے اور یکے بعد دیگرے پھر ان کی جملہ کتب ورسائل پر جامع تعارفی نوٹ، مرکزی نکتہ یا تھیم اور ماخذات کی نشان دہی، پس منظر، نصوص اسلامی سے استدلال کی نوعیت، موضوع سے متعلق رائج غلط فہمیوں کا ازالہ، اہل یہود کی علمی بددیانتی، صحائف سماوی میں تحریفات اور اس سے پیدا شدہ غیر ثقہ تاویلات، استنادِ قرآن کا حقیقی مفہوم اور اس غیر محرف صحیفہ سے اخذ و استفادہ کے ثمرات جیسے خالص علمی ڈسکورس کی تفاصیل فراہم کی ہیں۔ یہاں ڈاکٹر مرحوم کے مستفادات سے مولوی چراغ علی کے علمی کارناموں کا اجمالی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) 'تعلیقات': میں حضرت محمد ﷺ کی سیرت اور نبوت پر کیے گئے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ اس زمانے کی تصنیف ہے جب عیسائی مشنریز کا کام زوروں پر تھا اور مختلف مفادات کے پیش نظر غیر مسلمین کی

ایک تعداداور اکّا دُکّا مسلم عیسائیت کو قبول کر رہے تھے۔ ماسٹر رام چندر اور عمادالدین کے عیسائی ہونے کا زمانہ یہی ہے۔ عمادالدین نے 'تاریخ محمدی' لکھ کر حضورﷺ کی سیرت کو مسخ کرنے کی مذموم کوشش کی تو مولوی چراغ علی نے مسلمانوں کی جانب سے اس کا مدلل جواب لکھا اور دفاعِ دین کی اہم خدمت انجام دی۔

(۲) 'بشارت مثیل موسیٰ': بارہ صفحات پر مشتمل اس رسالے میں مولوی چراغ علی نے یہ ثابت کیا ہے کہ توریت کی بشارت میں مثیل موسیٰ کا مصداق صرف اور صرف محمدﷺ ہیں۔ یہ ایک محققانہ تالیف ہے۔ اس رسالہ میں متعلقہ مضمون کے تعلق سے اہل کتاب کی تحریفات کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔

(۳) 'مجموعہ رسائل': حسبِ ذیل چار مضامین کا مجموعہ ہے:

۱۔ تہذیب الاسلام فی حقیقۃ الاسلام

۲۔ مجموعہ روایات استرقاق وتسری

۳۔ تدبیر الاسلام فی تحریر الامۃ والغلام

۴۔ تحقیق مسئلہ تعدد زوجات

مولوی چراغ علی کے متذکرہ رسائل کے جملہ فقروں (Paras) اور مباحث سے متعلق ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے نفس مضمون کے ابعاد، قابل اعتراض پہلو اور اس کی ماہیت، سببِ تالیف، شق درشق تعاقت اور حقائق کی روشنی میں مولوی صاحب کے ازالۂ شبہات کے طریقۂ کار اور اس ضمن میں ان کے استدلال پر بڑی عمدہ بحث کی ہے۔

(۴) 'اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام': یہ کتاب مولوی چراغ علی کی انگریزی تصنیف Proposed Political, Legal, and Social Reforms under Muslim Rule کا اردو ترجمہ ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ دراصل ایک یوروپین عالم ریورنڈ میلکم کے اس اعتراض کی تردید میں ہے کہ مذہب اسلام مانع ترقی ہے۔ اس میں قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ زندگی ہے، روحانی، اخلاقی اور دماغی ترقی کا حامی، تغیراتِ زمانہ اور زندگی کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہے اور ہر قسم کے قوانین کی بنیاد بننے کی صلاحیت رکھنے والا مذہب ہے۔ اسی ضمن میں اسلام کے متعلق دوسرے یوروپین مصنفین مثلاً ولیم میور اور باسورتھ اسمتھ وغیرہ کی غلط بیانیوں پر عالمانہ ومجتہدانہ بحث کی گئی ہے۔ یعنی یہ دول اسلام میں سیاسی اور قانونی اصلاحات کے امکان کے لیے مختص ہے، جب کہ حصہ دوم میں تمدنی اصلاحات کے امکان پر بحث کی گئی ہے۔

(۵)حیدرآباد انڈر سر سالار جنگ: چار ضخیم جلدوں پر مشتمل انگریزی زبان میں یہ کتاب سلطنت حیدرآباد کی مستند دستاویز ہے، جس میں ۱۲۹۰ فصلی مطابق ۱۸۸۰-۸۱ء میں نظام آصف جاہ کی مملکت کے سول، فوجی اور رفاہِ عام کا بیان ہے۔ اس میں ان اصلاحات کی مختصر تاریخ بھی ہے، جو ہز ایکسیلنسی کے انتظام حکومت کی ۲۸ سالہ عرصہ میں عدلیہ، پولیس، مال گزاری وخزانہ اور رفاہِ عام کے محکمہ جات میں عمل میں آئیں۔

(۶)تحقیق الجہاد: یہ کتاب Critical exposition of the popular Jihad کا اردو ترجمہ ہے۔ ''یہ بتاتی ہے کہ محمد ﷺ کی تمام جنگیں دفاعی تھیں اور قرآن اقدامی حملہ کرنے یا جبراً مذہب تبدیل کرانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس میں چند ضمیمے بھی ہیں جن میں اس کا ثبوت ہے کہ لفظ 'جہاد' کے معنی 'جنگ' نہیں ہیں اور پیغمبر اسلام نے غلام بنانے کی اجازت نہیں دی ہے''۔ (ص ۵۱)

'تہذیب الاخلاق میں شائع ہونے والے مضامین' کے عنوان سے ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے مولوی چراغ علی کے آٹھ مضامین کی فہرست فراہم کی ہے، وہ حسبِ ذیل ہیں:

(۱)احسانِ عام، ص ۵ تا ۱۵، (۲) اسلام کی دنیوی برکتیں، ص ۱۴ تا ۸۹، (۳) ہاجرہؑ، ص ۹۸ تا ۱۰۳، (۴) تصویر، ص ۱۰۳ تا ۱۰۵، (۵) یورپ اور قرآن، ص ۱۰۵ تا ۱۳۱، (۶) پیغمبر پر سحر، ص ۱۳۱ تا ۱۳۷، (۷) سلیمان علیہ السلام، ص ۱۳۷ تا ۱۷۵، (۸) حضرت عیسیٰ مسیح ابن مریم رسول اللہ اور صلیب، ص ۱۷۵ تا ۱۸۴۔

مضامین کے عناوین سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان نگارشات میں مولوی چراغ علی نے تقاضائے وقت کے تحت اسلامی مسائل کی مجتہدانہ اور استدلالی تعبیر پیش کی ہے۔ ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے ہر ایک مضمون پر اختصار کے ساتھ تبصرہ کیا ہے اور اس میں بیان کردہ مبحث کی افادیت اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔

'غیر مطبوعہ تصانیف' کے تحت مولوی چراغ علی کی غیر مطبوعہ تحریروں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر منور حسین فلاحی کا اندازہ ہے کہ ان رسائل و مضامین کی تعداد چالیس یا پینتالیس تک ہوسکتی ہے۔ یون ورسٹی آف حیدرآباد میں ۳۲ اور آندھرا پردیش اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری میں انھیں ۳ مسودات ملے، جن میں بیشتر مسودات ناقص ہیں۔ بہ اعتبار مضامین یہ مسودے طبعیتاً دینی امور ومحتویات سے علاقہ رکھتے ہیں۔ یہ اسلام کے متنوع پہلوؤں پر اٹھنے والے شبہات اور اشکالات کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان میں اپنے عہد کے مزاج اور اس کے مسائل سے نبرد آزمائی کی متکلمانہ کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ غالباً اسی تناظر میں سرسید نے مولوی چراغ علی کو مذہب اسلام کا ایک فلاسفر حامی بتایا ہے۔ محقق ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے ان

میں سے بعض منتخب اور لائق ذکر مسودات کا تعارف کرایا ہے اور عمدہ ریویو بھی لکھا ہے۔

'اسلوب' کتاب کا اختتامی مبحث ہے۔ مولوی صاحب کی تحریروں کا غالب عنصر چوں کہ مذہبیات بالعلوم اختلافی موضوعات سے علاقہ رکھتا ہے لہٰذا ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے چراغ علی کے اسلوب میں موضوع کی ترتیب، اور اس کے ہر حصہ کے ذیلی اجزا کی خاکہ بندی میں افہام و تفہیم کی راہ ہموار کرنے والے ان کے تجزیاتی اور منطقی انداز کو نمایاں اہمیت دی ہے اور بتایا ہے کہ مولوی صاحب ذہن اور عقل کی ڈور جذبے کے ہاتھ میں نہیں دیتے؛ نہ ہی ان کی گفتگو خرد سے عاری محض 'دعاوی' ہوتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر استدلال کے مردِ میدان ہیں اور یہی ان کے سلوب کا وصف بھی ہے۔ ان کی تحریریں ابہام اور اغلاق سے پاک ہوتی ہیں اور اس کا بنیادی محرک مولوی صاحب کا وہ رویہ ہے جو پیش قدمی سے قبل انھیں موضوع اور اس کی جزئیات سے کما حقہ واقفیت حاصل کرنے اور پھر اسی وساطت سے اپنے ذہنی افق اور تصورات و خیالات کو واضح کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ مسئلہ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ یا کسی تاریخی واقعہ پر حقیقت پسندانہ نظر بھی ان کا خاصہ ہے۔ ان کے یہاں خواہ مخواہ کی جانب داری اور متعصّبانہ رویہ بھی مفقود ہے۔ لہجہ پروقار اور متین ہوتا ہے۔ علمی مباحث کا تقدس انھیں تخیلی نثر اور رنگینیِ عبارت سے دور رکھتا ہے۔ منور صاحب کی یہ بحث ڈاکٹر حامد علی قادری کی اس رائے سے قوت کشید کرتی ہے کہ ''طریقہ استدلال سرسید کا ہے۔ ہر مسئلہ کے ایک ایک پہلو پر بحث کرتے ہیں۔ ہر ممکن ذریعہ عقل و نقل سے دلائل لاتے ہیں۔ نہایت متانت اور قوت سے لکھتے ہیں''۔ (۱۵) ڈاکٹر فلاحی نے جابجا مولوی صاحب کے علمی، عقلی، تحقیقی اور مجتہدانہ رویے کو سراہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اپنے خیالات کی تائید و توثیق کے لیے انھوں نے جو عقلی اور نقلی دلائل فراہم کئے ہیں، ان کی تردید بہ آسانی نہیں کی جا سکتی۔ ان کے دلائل جہاں کثرتِ غور و فکر پر دلالت کرتے ہیں، وہیں ان کا مستحکم اسلوبِ بیان اپنے نتائج فکر پر ایمانِ کامل کی دلیل بھی ہے۔ حوالہ جات کی کثرت اور تنوع قاری کو حیرت و استعجاب میں ڈال دینے کے لیے کافی ہے۔'' (۱۶)

'کتابیات' کے ضمن میں بنیادی ماخذ کے بطور چراغ علی کی کتب، رسائل اور حیات و خدمات کے سلسلے میں ثانوی ماخذ، انگریزی کتب اور دیگر وسائل سے استفادہ کی تفصیل دی ہے۔ یہ حصہ کتابیات کے جدید تحقیقی اصول کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے کتابِ ہٰذا کی تسوید و تحقیق میں اپنے بھرپور علمی مذاق کا مظاہرہ کیا ہے۔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ کسی علمی فرد کا انتخاب جس فکری رکھ رکھاؤ کا متقاضی ہے، اس میں

انھیں بجا طور پر کام یابی ہاتھ آئی ہے۔ تحقیقی آداب کا خیال اور اختلافی امور میں متضاد آرا کے مابین حقائق کی توثیق میں عاجلانہ رویے سے گریز منور صاحب کی تحریر کی نمایاں خوبی ہے۔ ان کا دل نشیں اسلوب ان کے اظہارِ مطالب کی راہ کا کانٹا نہیں۔ وہ اس سے حسبِ منشا کام لینے کا ہنر جانتے ہیں۔ مقامِ حیرت ہے کہ یہ صاحبِ کتاب کا مقالہ امتحانیہ ہے۔ کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ خدابخش خاں لائبریری کی مطبوعات میں شامل ہے۔ چراغ علی کے علمی کارنامے کے بقدر اس کام میں پھیلاؤ اور وسعت کی ہنوز گنجائش موجود ہے۔ صاحبِ کتاب نے جابجا اختصار سے کام لیا ہے اور چراغ علی کے غیر مطبوعہ مسودات اور کام کے ضائع ہونے کا خدشہ بھی ظاہر کیا ہے۔ یہ توجہ طلب امور ہیں۔ سرسید کے قافلہ میں شامل چراغ علی کی علمی خدمات پر مرحوم منور حسین فلاحی کی یہ کتاب دراصل سرسید اور ان کی تحریک کے اساسی تصورات کی بازیافت کا عمل ہے۔ لہٰذا اپنے قافلہ کے علمی اور فکری تحفظات کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو کلیاتِ چراغ علیؒ کے ایک جامع پروجیکٹ کے تحت ان کے جملہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سرمائے کی تدوین کی فکر کرنی چاہیے۔ سرسید ہاؤس کا دائرہ وسیع ہو اور اس میں فکرِ سید اور ان کی ہمہ جہت علمی اور اصلاحی کارناموں کے پہلو بہ پہلو رفقائے سرسید اور نامورانِ تحریکِ علی گڑھ کی جملہ کدوکاوش بھی سمٹ آئے۔ ماضی سے نئی نسل کا رشتہ مزید مستحکم ہو اور وہ ایک کام یاب تحریک کے سو سالہ سفر میں عملاً خود کو شریک پائے۔ غالباً سرسید تحریک اور فکرِ سرسید کی توقیر کا اصل مفہوم یہی ہے اور خراجِ عقیدت کی عمدہ سبیل بھی۔

حواشی و مراجع

۱۔ ڈاکٹر منور حسین فلاحی، مولوی چراغ علی کی علمی خدمات، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۷ء، ص۱۹

۲۔ ایضاً، ص۱۹ ۳۔ ایضاً، ص۳۸ ۴۔ ایضاً، ص۵۲

۵۔ ایضاً، ص۱۱ (حاشیہ نمبر۱) ۶۔ ایضاً، ص۱۳ ۷۔ ایضاً، ص۱۳

۸۔ ایضاً، ص۱۴ ۹۔ ایضاً، ص۱۵ ۱۰۔ ایضاً، ص۱۶

۱۱۔ ایضاً، ص۱۶ ۱۲۔ ایضاً، ص۲۰

۱۳۔ سید عبداللہ، سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۶ء، ص۸۰

۱۴۔ ڈاکٹر منور حسین فلاحی، مولوی چراغ علی کی علمی خدمات، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۷ء، ص۳۰

۱۵۔ ایضاً، ص۸۹ ۱۶۔ ایضاً، ص۳۰

مولوی چراغ علی کی علمی خدمات: از ڈاکٹر منور حسین فلاحی

محمد غطریف شہباز ندوی

نابغہ روزگار شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں، مگر زمانے کی ناقدری کے باعث گوشۂ خمول میں چلی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس ایسا بھی ہوتا ہے کہ نسبتاً کم ذہین لوگوں کو بھی اگر حالات سازگار میسر آجائیں، کوئی لائق جانشین مل جائے تو وہ چمک جاتی ہیں۔ اس کلیہ کی مثالیں ایک دو نہیں دسیوں بلکہ سیکڑوں میں مل جائیں گی۔ اسلاف میں ایک مثال یہ ہے کہ امام مالکؒ عظیم محدث وفقیہ ہیں اور امام لیث بن سعدؒ ان کے معاصر ہیں جو علم وتفقہ میں ان پر فائق تھے۔ ان دونوں کے تعلق سے تذکرہ نگار لکھتے ہیں: الليث افقه من مالك الا ان اصحابه لم يقوموا به (۱) یعنی لیث مالک سے بڑے فقیہ تھے۔ مگر ان کو اچھے تلامذہ نہ مل سکے جو ان کی فقہ کو پھیلاتے، مالک کو مل گئے جنہوں نے ان کی فقہ وحدیث کو مدون کردیا۔ ہر زمانہ اور ہر عہد میں اس کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ زمانہ قریب میں سرسید احمد خان کے معاصرین میں ایک مولوی چراغ علی بھی ایسے ہی نابغہ عصر تھے جن کو قدرداں نہ مل سکے۔ مولوی چراغ علی کی خصوصیت یہ تھی کہ علوم اسلامیہ کا بڑا وسیع وعمیق مطالعہ رکھتے تھے اور وقتِ وفات تک کتاب ان کے سینہ پر رکھی ملی۔ (۲)

اسی طرح وہ اسلاف کے اندھے مقلد نہ تھے بلکہ بڑی تنقیدی بصیرت رکھتے تھے اور اسی طرح جرأت اظہار بھی۔ ان کی وفات سرسید کی زندگی میں ہی ہوگئی تھی۔ کئی لحاظ سے وہ خود سرسید پر بھی فائق تھے۔ مثلاً انہوں نے کلدانی، عبرانی کے علاوہ انگریزی بھی ایسی سیکھی کہ اس میں کتابیں لکھیں، اردو، عربی اور فارسی کے تو وہ ماہر تھے ہی۔ انگریزی میں لکھنا اس وقت کے لحاظ سے علما کے حلقہ میں خاصی نامانوس بات تھی۔ اس زبان میں ان کی اوریجنل دو ضخیم تصانیف موجود ہیں۔ جن میں ایک جہاد کے موضوع پر ہے جس کو حال ہی میں گلوبل میڈیا نئی دہلی نے دوبارہ طبع کرایا ہے۔ بیرونی زبانوں کے علم کے معاملہ میں وہ سرسید، شبلی اور سید سلیمان ندوی وغیرہ پر بھی فوقیت رکھتے ہیں۔ البتہ سرسید اور بعد میں مولوی عبدالحق بابائے اردو کے علاوہ کوئی ان کا قدرشناس نہ تھا نہ کوئی شاگرد یا ادارہ ہی ان کو نصیب ہوا جو ان کی کتابوں کو پھیلاتا اور ان کے علم وتحقیقات کی اشاعت

کرتا۔ پھر چراغ علی انگریز گورنمنٹ کی سروس میں تھے اور علی گڑھ کالج یا کسی دوسرے ملی ادارے سے براہ راست وابستہ نہ تھے اس لیے باوجود علی گڑھ تحریک کا علمی اور سرگرم رکن رکین ہونے کے علی گڑھ والوں نے بھی ان سے وہ اعتنا نہیں کیا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس عمومی تغافل کی فضا میں خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور پٹنہ کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ پہلی بار اچھے گیٹ اپ میں تفسیر سرسید اور مقدمہ تفسیر سرسید (جس میں اہم مقالات شامل ہیں) اس نے چھاپا۔ اسی طرح اُس نے مولوی چراغ علی پر ایک مونوگراف بھی شائع کیا۔ یہ مونوگراف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ایک لیکچرر ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے لکھا تھا، جنہوں نے عمر عزیز کی کم ہی بہاریں دیکھی اور غالباً 42 سال میں داعی اجل کو لبیک کہہ دیا تھا۔ اسی مونوگراف پر اگلی چند سطور پیش کی جائیں گی۔

اس یک موضوعی مقالہ کا عنوان ہے: مولوی چراغ علی کی علمی خدمات۔ یہ 1977 میں شائع ہوا۔ اور 95 صفحات کے اس مختصر سے کتابچہ کی اس وقت قیمت پچاس روپے رکھی گئی تھی۔ کتابچہ کے شروع میں خدابخش کے ڈائرکٹر حبیب الرحمان چغانی صاحب کا ایک صفحہ کا حرف آغاز ہے۔ اس کے بعد اصل کتابچہ شروع ہوتا ہے۔ شروع میں مولوی چراغ علی کی سوانح عمری پر مختصراً روشنی ڈالی ہے جو کتابچہ کے ۲۲ صفحات تک چلی گئی ہے۔ تاہم پیدائش سے موت تک کے اس پورے سفر میں قاری کو یہ پتہ نہیں لگ پاتا کہ مولوی چراغ علی اہل سنت میں تھے یا اہل تشیع سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ حال ہی میں علی گڑھ کے ہی پروفیسر شافع قدوائی نے بغیر کسی حوالہ کے مولوی چراغ علی کو اہل تشیع میں سے قرار دیا ہے جو ان کی تصنیفات کو دیکھتے ہوئے بظاہر ایک غلط دعویٰ معلوم ہوتا ہے۔ شافع صاحب لکھتے ہیں:

> ''سرسید نے اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک میں شیعہ اور سنیوں کو مساوی اہمیت دی اور ان کے ایک اہم رفیق مولوی چراغ علی کا، جو انگریزی، عربی، فارسی اور اردو پر ماہرانہ دسترس رکھتے تھے اور مختلف علوم پر حاوی تھے، تعلق فرقہ امامیہ اثنا عشری سے تھا''۔ (۳)

مولوی چراغ علی کی علمی خدمات کے جائزہ میں سب سے پہلے ان کی کتابوں کے تذکرے اور ان پر تبصرے ہیں۔

۱۔ تعلیقات: یہ مشنری پادری عمادالدین کی کتاب تاریخ محمدی کا جواب ہے۔ اور سیرت پر پادری مذکور کے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب ہے۔

۲۔ بشارت مثیل مسیح: چھوٹا سا کتابچہ ہے، جس میں بائبل میں آئی ہوئی بشارات کا مصداق نبی اکرم

ﷺ کو تحقیقی طور پر ثابت کرتا ہے۔

۳۔ مجموعہ رسائل: اس میں چار رسائل شامل ہیں اور وہ یہ ہیں:

ا۔ تہذیب الکلام فی حقیقت الاسلام، ۲۔ مجموعہ روایات استرقاق وتسری، ۳۔ تدبیر الاسلام فی تحریر الامۃ والغلام، ۴۔ تحقیق مسئلہ تعدد زوجات۔ اصل میں سر سید احمد خان نے مفصل رسالہ ابطال غلامی لکھا تھا، جس کے جواب میں ایک عالم سید محمد عسکری نے حقیقۃ الاسلام کے نام سے ایک کتاب لکھی، اسی حقیقت الاسلام کے جواب میں مولوی چراغ علی صاحب نے اپنا رسالہ تہذیب الکلام لکھا تھا۔ دوسرے رسالہ یعنی مجموعہ روایات استرقاق وتسری میں انہوں نے مستشرقین ومعاندین کے اس اعتراض کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نبی ﷺ کے پاس کوئی لونڈی غلام تھے اور آپ بغیر نکاح کے لونڈیوں سے استمتاع فرماتے تھے۔

سر سید ہی کی طرح ایسی تمام روایات وآثار کو مولوی چراغ علی قرآن کے خلاف بتا کر مسترد کر دیتے ہیں۔ وہ ان کا کوئی منہجی مطالعہ نہیں کرتے اور یہی تقریباً تمام متجددین واہل قرآن مصنفین چودھری غلام احمد پرویز، احمد الدین امرت سری اور مولانا عرشی وغیرہ کا انداز تحقیق ہے۔ اپنی تائید میں مولوی چراغ علی نے آٹھ حدیثیں بھی نقل کی ہیں۔ یہ بھی تمام اہل قرآن ومتجددین کی مشترکہ غلطی ہے کہ جہاں حدیثیں ان کے مزعومات کے خلاف پڑتی ہیں وہ ان کو بالکل مسترد کر دیتے ہیں اور جہاں ان کی تائید کرتی ہیں ان کو لے لیتے ہیں۔ احادیث کے اخذ ورد کا کوئی اصل الاصول ان حضرات نے ایسا اختیار نہیں کیا جس سے عام علما مطمئن ہو سکیں اور علمی دنیا میں وہ قابل تسلیم ہو۔

رسالہ سوم تدبیر الاسلام فی تحریر الامۃ والغلام: یہ رسالہ بھی سر سید کے ایک مخالف مولوی محمد علی بچھرایونی کے رسالہ کا جواب ہے جو انہوں نے سر سید احمد خان کی کتاب رسالہ ابطال غلامی کے جواب میں رد الشقاق فی جواز الاسترقاق کے نام سے لکھا تھا۔ منور حسین صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''سابقہ دو رسائل کی طرح ہی اس رسالہ میں بھی وہی دلائل ومباحث ہیں۔ کوئی نئی بات استدلال کے قبیل سے اس میں نہیں ہے۔ البتہ دسویں اور تیرہویں فقرہ میں احادیث کے رد وقبول کی بحث لائق مطالعہ ہے۔''(۴) راقم کے خیال میں ڈاکٹر منور صاحب نے یہاں سخت بخل سے کام لیا ہے اور اس بحث کو درج نہیں کیا حالانکہ علمی تحقیق کا تقاضا تھا کہ اس اہم بحث کو لکھتے۔ مگر پروجیکٹ پر مبنی کتابوں اور مقالوں کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں اس لیے وہ اس میں معذور متصور کیے جا سکتے ہیں۔ چوتھا رسالہ ہے تحقیق مسئلہ تعدد زوجات: اس رسالہ میں تین

مسائل پر بحث آئی ہے: (۱) تعدد ز وجات کا جواب (۲) تعدد زوجات میں عدالت کی شرط (۳) تعدد زوجات اور انبیاء سابقین ۔اہل حدیث عالم مولوی محمد حسین بٹالوی مدیر اشاعۃ السنہ کے خیالات کی تردید بھی کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا تمام کتابوں اور کتابچوں کی مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب کسی نہ کسی جہت سے رسول اللہ ﷺ کے دفاع میں لکھے گئے ہیں۔اور سیرت مطہرہ کے جن پہلوؤں پر معاندین ومستشرقین اعتراضات کرتے ہیں مصنف نے اپنی دانست میں ان کا جواب دیا ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح معتزلہ قدیم اصلاً اسلام کے دفاع کے طور پر ہی سامنے آئے تھے اور ان کی کلامی بحثیں اسلام،قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے دفاع کے نیت سے کی گئی تھیں گرچہ ان کے اسالیبِ بحث سے ہمیں اتفاق نہ ہو اور بہتوں کو وہ انحراف محسوس ہوتی ہوں،اسی طرح سے معتزلہ جدید سرسید اور ان کے تمام پیروکار اور اہل قرآن وغیرہ بھی اسی حسن نیت سے میدان میں آتے ہیں کہ وہ دین کا،قرآن کا اور رسول اللہ ﷺ کا دفاع کررہے ہیں۔ان کے طریقۂ کار سے اختلاف ہوسکتا ہے مگر ان کو معاندین کے خانہ میں ڈال دینا،ان کو سازشی کہہ کر مطعون کرنا اور یہ کہنا کہ یہ سب لوگ استعمار کے ایجنڈے پر کام کررہے تھے ایک غلط رویہ ہے اور روایتی علما کی اس تنقید میں کوئی جان نہیں ہے۔

اس کے علاوہ چراغ علی کی ایک مشہور کتاب جہاد کے اوپر ہے جو اصلاً انگریزی میں لکھی گئی ہے۔حال ہی میں جناب عبیدالرحمٰن چیرمین گلوبل میڈیا پبلیکیشنز نے اس کو اپنے مقدمہ کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام میں جہاد دفاعی ہے ہجومی نہیں ۔آج اس موضوع پر بہت سالٹریچر اردو میں دستیاب ہے لیکن جس وقت یہ کتاب لکھی گئی اس وقت یہ بالکل ایک نئی بات تھی۔اس کتاب کا انگریزی نام ہے:Critical exposition of Popular Jihad۔اس کا اردو ترجمہ خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے تحقیق جہاد کے نام سے کیا تھا۔ایک اور کتاب اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام میں چراغ علی نے یہ ثابت کیا ہے کہ مذہب اسلام تمدنی ترقی میں مانع نہیں ہے۔اصلاً یہ کتاب ایک مستشرق ریونڈ میکم میکال کے اعتراضات کی تردید میں لکھی گئی ہے۔

ایک اور کتاب انہوں نے انگریزی میں سالار جنگ کے کارناموں کے بیان میں لکھی ہے اور دکن کی ایک مفصل تاریخ ہے جس کا عنوان ہے : Hyderabad Under Salar jang ۔یہ تین جلدوں میں ہے اور بہت مفصل ومحقق ہے اور بتاتی ہے کہ چراغ علی کو تحقیقی معلومات پیش کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت حاصل تھی۔ڈاکٹر منور حسین صاحب نے ان تمام کتابوں کے مندرجات،ان کی

خصوصیات اور نادر معلومات کا جامع تعارف بھی کرایا ہے اور اگر کوئی پہلو نیا معلوم ہوا تو اس کی نشان دہی کی ہے اور ناقدانہ بصیرت سے کام لیا ہے۔

اگلی فصل میں ڈاکٹر منور حسین فلاحی صاحب نے چراغ علی کے تہذیب الاخلاق شائع ہونے والے مضامین کا جائزہ لیا ہے۔ مولوی صاحب رسالہ کے مستقل اور اہم مضمون نگاروں میں سے تھے۔ اس فصل میں ان کے جن اہم مضامین کا تذکرہ ہے وہ یہ ہیں: (۱) احسان عام (۲) اسلام کی دنیوی برکتیں (۳) ہاجرہ (۴) یورپ اور قرآن (۵) پیغمبر پر سحر (۷) سلیمان علیہ السلام (۸) حضرت عیسیٰؑ اور صلیب۔ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ حضرت ہاجرہ کے بارے میں مولوی چراغ علی کی تحقیق اور علامہ فراہی کی تحقیق میں حیرت انگیز طور پر توافق اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ مولوی چراغ علی چونکہ مقدم ہیں اس لیے امکان ہے کہ علامہ فراہی نے یہ فکر انہی سے اخذ کیا ہو پھر اپنی تحقیقات سے اس میں مزید اضافے کیے ہوں۔ تاہم انہوں نے کہیں بھی مولوی چراغ علی کا حوالہ نہیں دیا۔ اسی طرح سرسید کی تفسیر سے بھی بعد کے مفسرین نے خوب استفادہ کیا ہے، مگر کوئی ان کا حوالہ دینا پسند نہیں کرتا۔ (۵) علمی دنیا میں یہ کوئی اچھی روایت نہیں ہے۔ اگلی فصل میں ڈاکٹر منور صاحب نے بتایا ہے کہ مولوی چراغ علی کی تحریروں کا غالب عنصر مذہبیات پر مشتمل ہے۔ بالعموم اختلافی موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔......ان کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کا تجزیاتی اور منطقی انداز ہے۔ (۶)

ڈاکٹر منور حسین فلاحی بڑا تحقیقی ذوق رکھتے تھے، انہوں نے مولوی چراغ علی کی متعدد مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں، ان کو پڑھا اور ان کی بنیاد پر یہ کتابچہ ترتیب دیا۔ اس مختصر سی کتاب کی کتابیات پانچ صفحوں میں آئی ہے جس میں خود مولوی چراغ علی کی اپنی تصنیفات، ان پر لکھی گئی کتابیں اور مقالے وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر منور حسین صاحب کی تحریر میں بڑی روانی، سلاست اور علمیت ہے۔ ان پر sobrity اور سنجیدگی کی فضا طاری رہتی ہے۔ وہ لفاظی بالکل نہیں کرتے نہ بہت مبالغہ آمیز تعبیرات استعمال کرتے ہیں۔ نہ ہی بہت اونچے مقام سے ارشاد کرتے ہیں بلکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ نرم اور دھیمے اسلوب میں اور شائستہ و مہذب زبان میں کہتے ہیں۔ البتہ جو بات کہتے ہیں وہ پورے اعتماد سے کہتے ہیں۔ موضوعیت اور Objectivity کو پوری طرح برقرار رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ مولوی چراغ علی پر لکھ رہے ہیں مگر ان کی وکالت بالکل نہیں کرتے، بلکہ حقائق کو جیسے کہ وہ ہیں قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور اُسے فیصلہ کرنے کے لیے بالکل آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ ایک خوبی کی بات ہے۔ مولوی چراغ علی پر ان کی بھاری بھرکم اور وسیع المطالعہ شخصیت کو دیکھتے ہوئے

سوصفحات سے بھی کم کی یہ کتاب بڑی مختصر اور تشنہ محسوس ہوتی ہے، مگر اِس میں انہوں نے لوازمہ ایک بہت بڑی اور ضخیم تصنیف کا دے دیا ہے جس کو سامنے رکھ کر اگر کوئی محقق واسکالر دل چسپی لے تو ایک بڑی کتاب تصنیف کی جاسکتی ہے۔

علماءکرام اور بہت سے دانشور بھی سرسید اوران کے رفقاء کو آج لعن طعن خوب کرتے ہیں مگر اصل میں یہ معترضین یہ بھول جاتے ہیں کہ سرسید اوران کے رفقاء کی نئی تحقیقات کا اصل ہدف ومقصد اسلام پر ہونے والے حملوں کا دفاع ہی تھا وہ کوئی مغربیت سے متاثر لوگ نہیں تھے ۔جیسا کہ پروفیسر عمرالدین نے سرسید پر اپنے طویل مقالہ میں اس کی بخوبی وضاحت کی ہے ۔اور یہی خیال مولانا سعید احمد اکبرآبادی جیسے جید عالم ومحقق نے بھی ظاہر کیا ہے ۔(۷) کل ملاکر علمی لحاظ سے یہ رسالہ نہایت قدر وقیمت کا حامل ہے اور مولف کے ذوق تحقیق اور ذرف نگاہی کا شاہد عدل ۔

حواشی ومراجع

۱۔ ابوزہرہ الامام الشافعی فقہہ وآراہٗ۔ص ۷۴، بحوالہ ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی، عالم اسلام کے چند مشاہیر، ص۲۴، فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی

۲۔ ملاحظہ ہو، پروفیسر محمد سلیم، مغربی علوم کے ماہر علماء اٹھارہ سوستاون سے پہلے (مقدمہ)، شائع کردہ تنظیم اساتذہ پاکستان

۳۔ تہذیب الاخلاق اکتوبر۲۰۲۰ء، سرسید نمبر، ص۷۶

۴۔ مولوی چراغ علی کی علمی خدمات صفحہ۴۰، خدابخش لائبریری پٹنہ، سنہ۱۹۹۷ء

۵۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مولانا رضی الاسلام ندوی، سرسید کی تفسیر القرآن اور مابعد تفاسیر پر اس کے اثرات فکر ونظر کا سرسید نمبر

۶۔ مولوی چراغ علی کی علمی خدمات، ص۸۴

۷۔ علی گڑھ میگزین ۵۵۔۱۹۵۳ء، علی گڑھ نمبر بحوالہ مقدمہ تفسیر سرسید مجموعہ مقالات شائع کردہ خدابخش لائبریری

یادوں کے نقوش: منور حسین فلاحی

شفیق الرحمٰن

ڈاکٹر منور حسین کو ہم سے رخصت ہوئے بیس (۲۰) برس ہو گئے۔ جن حالات میں وہ اس سرائے فانی سے رخصت ہوئے وہ صرف ان کے اور ان کے اعزا کے لیے ہی تکلیف دہ اور اذیت ناک نہیں تھے بلکہ دوست، احباب اور ہمدرد و بہی خواہ بھی اس سے پریشان اور رنجیدہ تھے۔ انتقال سے کچھ ہی عرصہ پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بہ حیثیت استاد ان کی تقرری عمل میں آئی تھی، تقرری کا پروانہ ملے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے، ابھی تو وہ اس کے لازمی تقاضوں کے تکمیلی مراحل سے ہی گزر رہے تھے کہ وقت اجل آ پہنچا اور وہ راہیِ ملک عدم ہو گئے۔ گویا ابھی بستر کھولا ہی تھا کہ اسے لپیٹنے کا پروانہ مل گیا، یہ پڑاؤ اتنا مختصر ہو گا کسے خبر تھی۔ جس نے سنا حیران پہلے ہوا، ملول بعد میں، مگر ملک عدم کو جانے والا مسافر ہر طرح کے اندیشوں، تمام تفکرات اور ہر قسم کی الجھنوں اور پابندیوں سے آزاد ہو چکا تھا، کلفتوں اور اذیتوں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔

ڈاکٹر منور حسین جس وقت علی گڑھ پہنچے تھے وہ جناب سید حامد کی وائس چانسلری کا ابتدائی زمانہ تھا، اس سے پہلے یونیورسٹی نے پروفیسر علی محمد خسرو (مرحوم) کا دور دیکھ لیا تھا، مرحوم پروفیسر کی وِداع اور موجود سابق بیوروکریٹ کی آمد کے درمیان بھی چند ماہ کا ایک دورانیہ ہے، جس کو بلا مبالغہ پُر آشوب دور کہا جا سکتا ہے۔ اس آشوب نے سید حامد کا بھی پیچھا کیا اور جانے کتنوں کو آشفتہ سر بنا دیا، کچھ اگر سلامت رہ گئے تو اپنی سلامتی طبع کی بنا پر رہے۔ انہی سلامت رہنے والوں میں ایک ڈاکٹر منور حسین بھی تھے۔ علی گڑھ کو ان کی یہ ادائے دل ربا ایسی بھائی کہ اس نے انہیں اپنا بنا لیا اور شاید وہ بھی کچھ اسی ارادے سے یہاں وارد ہوئے تھے کہ یہیں کے ہو رہے، یہ ان کی کتاب زندگی کا آخری ورق ثابت ہوا اور حیات مستعار کا آخری پڑاؤ۔

ڈاکٹر منور حسین ایک دنیا کو چھوڑ کر علی گڑھ آئے تھے، یقیناً انہوں نے کچھ خواب بسائے ہوں گے، یہ قدم اٹھانا اور اس طرح کا فیصلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا، ہر کوئی اس قسم کے فیصلے نہیں کر سکتا ہے اور اگر کر بھی

لے تو اس راہ پر قدم آگے بڑھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، یہ اولوالعزم ہی کر سکتے ہیں، جن کے حوصلے بلند ہوں، جن کے ارادے پختہ ہوں اور جو کچھ خواب بھی دیکھنا جانتے ہوں۔ ڈاکٹر منور حسین بلند حوصلہ بھی تھے، دُھن کے پکے بھی تھے اور مضبوط قوت ارادی کے مالک بھی۔ انہیں خواب دیکھنے اور اس کو زندہ تعبیر میں بدلنے کا ہنر آتا تھا، انہیں ورثہ میں امارت نہیں شرافت ملی تھی، وہ جب علی گڑھ آئے تھے اس وقت وہ ایک عالم دین تھے، مدارس میں تدریس کا ان کے پاس ایک تجربہ بھی تھا، وہ چاہتے تو اسی دنیا میں رہ سکتے تھے، کیوں کہ وہ اس وقت ایک متاہل کی زندگی جی رہے تھے، ایسی صورت میں زندگی کو نئے تجربات سے دوچار کرنے کا عزم کرنا کم ہمت لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

ڈاکٹر منور حسین کو قریب سے دیکھنے اور جاننے والوں پر یہ حقیقت عیاں ہے کہ ان کی طبیعت میں ٹھہراؤ بھی تھا اور جماؤ بھی۔ جس نے ان کی شخصیت کو جہاں ایک طرف جاذب و پُرکشش بنادیا تھا، وہیں ان کی پہچان کو آخر دم تک قائم اور باقی بھی رکھا تھا۔ ان کے مزاج میں تلون نہیں تھا، جس کی وجہ سے ان کی پہچان کبھی گم نہیں ہوئی۔ انہوں نے اگر کوئی چیز اختیار کی یا اپنے لیے کسی روش کو پسند کیا تو محض فیشن یا زمانے کے چلن کی وجہ سے ایسا نہیں کیا بلکہ سوچ سمجھ کر اور پورے شعور وآگہی کے ساتھ ایسا کیا، کسی موقف پر قائم اور جمے رہنے کی یہ کلید انہیں ہاتھ لگ گئی تھی، ایسے لوگوں کو اپنی روش پر شاذ و نادر ہی نادم ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے، انہیں اس پر نظر ثانی کی ضرورت بھی کم ہی پیش آتی ہے۔ مرحوم قدر شناس بھی تھے اور قدرداں بھی، ان پر زندگی کا یہ رمز کھل چکا تھا کہ یہ ایک بہتا ہوا دریا ہے، یہاں فرق وامتیاز کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

ڈاکٹر منور حسین ایک فکرمند انسان تھے، ان کی یہ فکرمندی دائمی تھی، جس میں ذات بھی سمائی ہوئی تھی اور کائنات بھی، یہ فکرمندی بسا اوقات درد میں بدل جاتی تھی، یہ درد تا عمران کا رفیق رہا، اس جہان ناپیدا کنار میں وہ زندگی کی فقط ۶۳ بہاریں ہی دیکھ سکے۔ ان میں کتنی خزاں رسیدہ تھیں ان کا شمار کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ درد سے خالی تو کوئی ذی روح نہیں کجا کہ وہ ذی روح جسے شعور کی دولت ملی ہو، درد بانٹنے کی چیز ہے انسان جن تصورات، جن آئیڈیلز کے لیے جیتا ہے اگر وہ اس کا درد بن جائیں تو اس کی زندگی بامعنی بن جاتی ہے اور حسین و دلکش بھی، کائنات کو اپنی ذات میں سمیٹ لینے سے درد سوا ہو جاتا ہے۔ یوں یہ ایک قیمتی اثاثہ بھی بن جاتا ہے اور ابلنے لگتا ہے۔ دانا درد کے اظہار کا ایک وسیلہ پرورش لوح وقلم کو بناتے ہیں، ڈاکٹر منور حسین نے بھی یہی کیا، انہوں نے لوح وقلم کی پرورش کا فیصلہ بھی ایک مقصد کو سامنے رکھ کر کیا تھا، وہ نہ محض آذری کے قائل

تھے نہ بے سبب صنم تراشی کو انہوں نے اپنا ہنر بنایا تھا، انہوں نے فن کو مقصدیت کے سانچے میں ڈھالنے کا سبق پڑھا تھا۔

ڈاکٹر منور حسین ایک انسان تھے، خاکی مخلوق، مثبت اور منفی عناصر کا مرکب مادی وجود، اس لیے ان کی شخصیت و کردار کے جہاں روشن پہلو ہیں وہیں یقیناً کچھ تاریک پہلو بھی ہوں گے، ان کو یاد رکھنا اور گاہے یاد کر لینا اس لحاظ سے تو بلاشبہ مفید ہوسکتا ہے کہ اس سے داغ دھبّوں سے محفوظ رہنے میں مدد ملتی ہے لیکن ان کا شمار اگر مشغلہ بن جائے تو پھر کردار کا حسن، توانائی اور دل کشی رخصت ہوجاتی ہے۔ قدرت کا طریقہ بھی یہی ہے، قدرت نے کائنات کو انسان کے لیے مسخر کردیا ہے، اس میں اس کے لیے بے پناہ وسائل خام مال کی صورت میں موجود ہیں، زمین کا سینہ چیر کر جو خام مال برآمد کیا جاتا ہے کارآمد بنانے کے لیے اس کی صفائی ضروری ہوجاتی ہے، پھر انہیں کام میں لیا جاتا ہے۔ انہیں اس بنا پر بے مصرف نہیں گردانا جاتا کہ ان میں کچھ گندگیاں لپٹی ہوتی ہیں، ڈاکٹر منور حسین مرحوم کی شخصیت و کردار کے کچھ روشن اور ابھرے ہوئے نقوش یادوں کے سہارے حوالۂ قرطاس ہیں، مرحوم تو تاریخ کا حصہ بن چکے، ہمیں بھی اسی کی آغوش میں پناہ لینی ہے۔ کچھ روانہ ہوچکے کچھ منتظر ہیں، یہ ایک ناتمام سلسلہ ہے جو ازل سے جاری ہے، تا ابد جاری رہے گا اور جدائی کے درد سے آشنا رکھے گا، یہ ایک ایسا درد ہے جو بقول کسے ؎

درد منت کش دوا نہ ہوا

علامہ اقبال کا ایک فارسی شعر ہے:

چو می گویم مسلمانم بہ لرزم
کہ دانم مشکلات لاالٰہ را

مشتاق یوسفی نے ایک شام نظر امروہوی کے نام میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا:

ان کے رکھ رکھاؤ اور لہجے میں ایک مٹتی ہوئی ایک رخصت ہوتی ہوئی تہذیب کا لوچ، نکھار اور رچاؤ ہے جس کا انہیں خود بھی احساس ہے:

دلوں پہ نقش رہے گا میرے زمانے کا
میں اختتام ہوں ایک عہد کے فسانے کا

حضرات وہ سانچے جن میں ایسی شخصیتیں اور انوکھے البیلے کردار ڈھلتے تھے گردش دوراں کے ہاتھوں

شکست وریخت کی نذر ہو گئے۔

ہمارے بعد نہ آئے گا کوئی ہم جیسا
ہم ایسے خاک نشینوں کا احترام کرو

جون ایلیا کی ایک بہت خوب صورت غزل کا ایک بہت خوبصورت شعر ہے:

وفا، اخلاص، قربانی، محبت
اب ان لفظوں کا پیچھا کیوں کریں ہم

لیکن منور حسین صاحب جیسے لوگوں کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ابھی ان میں زندگی کی رمق باقی ہے، ان کی معنویت ابھی پوری طرح گم نہیں ہوئی ہے، اگر ان کی آبیاری کی جائے تو خزاں کے اس دور کو بہار سے ایک بار پھر معطر کیا جا سکتا ہے۔

''ملک کی موجودہ صورت حال جیسی کچھ ہے وہ تمام لوگوں کے سامنے ہے۔ بے شمار قسم کی خرابیوں میں فرقہ وارانہ منافرت کا بڑھتا ہوا رجحان خاص طور پر بڑی سرعت سے ایک نامناسب رخ اختیار کرتا جا رہا ہے۔ مختلف مذہبی رسوم کے حوالوں سے تنازعات کا اٹھ کھڑا ہونا اور لاتعداد جانی و مالی اتلاف کا نتیجہ تو ایک معروف سی چیز بن گئی تھی، لیکن اب تو باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے والے معاملات بھی آپسی منافرت کا ایک نیا اور مؤثر ذریعہ بنتے جا رہے ہیں۔ یہ وہ خطرناک رجحان ہے، جس کے سد باب کی اگر سنجیدہ اور فوری کوشش نہیں ہوئی تو اس کے تباہ کن نتائج کا تصور بھی کرنا مشکل ہے۔''

(**ڈاکٹر منور حسین فلاحی**، اداریہ ماہ نامہ رفیق منزل، جنوری ۱۹۸۸ء]

ڈاکٹر منور حسین۔ چند باتیں، چند یادیں

جاوید اختر علی آبادی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ایم۔اے (اکتوبر ۱۹۸۵ء) میں میرا داخلہ ہوا۔اس وقت منور بھائی ایم۔اے سال دوم کے ایک فعّال طالب علم تھے۔چونکہ ہم دونوں کا شعبہ ایک ہی تھا، اس لیے جلد ہی ایک دوسرے سے متعارف و مانوس بھی ہو گئے اور باہمی شناسائی کی ابتدا ہوئی۔تعارف کے بعد تعلق ہوا اور کچھ ہی عرصہ میں تعلقِ خاطر بھی قائم ہو گیا۔روزانہ شعبہ میں ملاقاتیں ہوتی رہیں، گفتگو بھی ہوتی رہی لیکن یہ سلسلہ شعبہ کی حد تک قائم رہا۔اس عرصہ میں ہم دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل رہا جسے یونیورسٹی کی تہذیبِ روایت میں جونیئر اور سینیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔حالانکہ منور بھائی اس روایت سے عاری تھے۔لیکن میرے اندر اس تہذیب کا احساس شدید تھا، شاید اس کی وجہ یونیورسٹی کا وہ ماحول تھا جس نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔بہر کیف اس تہذیب کی پاس داری میں چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔اس دوران منور بھائی کی شرافت، سادگی، انکسار، تواضع اور بُردباری کا بارہا مطالعہ و مشاہدہ کرتا رہا۔سلام و کلام کا سلسلہ ہنوز جاری رہا اور مجھے یہ اندازہ کرنا مشکل ہو گیا کہ منور بھائی کے لیے کون سا ایک لفظ استعمال کروں جو ان کے جملہ اوصاف کو محیط ہو۔

منور بھائی سے جب بھی گفتگو کا موقع ملتا تو ایک عجیب کیف حاصل ہوتا۔ان کی گفتگو میں ایسی نرمی، حلاوت اور کشش تھی کہ دل و دماغ متحیر ہو جاتے۔زیرِلب تبسم ایسا کہ دل کہتا کاش! یہ لمحے قید و بند سے آزاد ہو جائیں۔ایک دن شعبہ میں ملاقات ہوئی۔سلام و کلام ہوا پھر میرا ہاتھ پکڑا اور کینٹین کی طرف چلنے لگے۔راستے میں خود تو خاموش تماشائی بنے رہے اور مجھے بات کرنے پر اُکساتے رہے۔اس دن مجھے یہ علم ہوا کہ منور بھائی میں ذوقِ گویائی اور کم سخنی کس درجہ تھی۔

منور بھائی سے ملاقاتوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا۔شعبہ کی ملاقات صرف سلام اور مختصر کلام تک محدود

ہوتی لیکن شام کے وقت اکثر ان کے کمرے پر حاضر ہوتا۔کبھی کمرے پر تنہا ہوتے تو کبھی چند احباب ان کے گرد ہوتے۔موضوعِ گفتگو مسلمانوں کی تعلیمی،معاشرتی،اقتصادی اور اخلاقی پستی زیرِ غور ہوتا۔احباب کو بات کرنے کا موقع زیادہ دیتے اور ان کی باتوں کو غور سے سنتے،درمیان میں کبھی کبھی کچھ اظہارِ خیال کرتے اور پھر ہمہ تن گوش ہو جاتے۔منور بھائی جب کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو ایسا لگتا کہ اللہ نے انھیں کتنا عمیق علم دیا ہے جس میں تہہ در تہہ اسرار و رموز پوشیدہ ہیں۔ساتھ ہی گفتگو میں سلیقہ و اعتدال ہوتا۔باتوں سے فراست ایمانی ظاہر ہوتی۔اصلاح کا پہلو مقدم ہوتا۔یہاں منور بھائی کے عقیدہ کے بارے میں ایک وضاحت کر دوں کہ ان کا عقیدۂ اسلامی بڑا راسخ تھا اور ہر موضوع میں یہ عقیدہ مقدم ہوتا۔

منور بھائی کی چند خوبیوں کا ذکر نا گزیر ہوگا۔انسانیت کی تعلیم ان کا مزاج اور شیوہ تھی اسی لیے تعمیرِ سیرت و اخلاق کے پہلو پر اکثر گفتگو کرتے۔دورانِ گفتگو باہمی اُخوت و رواداری کی اہمیت و افادیت پر زور دیتے۔کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کرتے۔ایس۔آئی۔او اور جماعتِ اسلامی سے براہ راست تعلق تھا لیکن مذہبی جماعتوں کے باہمی اختلافات پر وہ کبھی لب کشائی نہیں کرتے۔بہ الفاظ دیگر فرقہ بندی پر کبھی ان کی زبان وا نہ ہوتی۔

منور بھائی کی ایک اور خوبی بے لوث خدمت کی تھی۔وہ جو بھی کام کرتے بے لوث کرتے۔کبھی ذاتی منفعت کے لیے کوئی کام نہیں کرتے۔ان کے ظاہر و باطن میں یکسانیت تھی اور قول و فعل میں مماثلت تھی۔ایفائے عہد کا پاس و لحاظ رکھتے۔کبھی کسی سے ملاقات کا وقت طے ہوتا تو قبل از وقت تیار ہو کر مقررہ مقام پر پہنچ جاتے۔

موجودہ دور میں عیب جوئی ایک وبائی شکل اختیار کر گئی ہے جس میں کسی خاص و عام کا امتیاز باقی نہ رہا۔لیکن منور بھائی اس فعلِ قبیح سے مبرّا تھے۔میں نے ان کی زبان سے کسی کے معائب نہیں سنے بلکہ ان کے سامنے اگر کوئی کسی کے عیوب پر زبان دراز کرتا تو ایک لمحے کے لئے وہ خاموش ہو جاتے،چہرے پر ایک اضطرابی کیفیت آشکار ہو جاتی اور پھر عیب جو کو عیب بیان کرنے سے منع کر دیتے۔

منور بھائی کی زندگی سادگی کا اعلیٰ نمونہ تھی۔یہ سادگی ان کے لباس،طرزِ معاشرت،گفتگو اور وضع قطع سے صاف ظاہر ہوتی۔خودنمائی و خودستائی سے عاری تھے۔مزاج میں انکسار بدرجۂ اتم موجود تھا جو ہر ملنے والے کو متاثر و مرعوب کرتا۔

ان کی سادگی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے پاس غالباً دو شیروانیاں تھیں جو بدل بدل کر

زیبِ تن کرتے۔کھانے میں بھی سادگی اختیار کرتے۔جب کبھی مغرب کے وقت ملنے پہنچ جاتے تو عشاء تک باتیں کرتے، پھرعشاء کی نماز ادا کرتے اور شمشاد مارکیٹ کا رُخ کرتے۔وہاں رامپور کا ایک ہوٹل تھا جہاں اکثر کھانا کھاتے۔ویٹر کھانے کی اقسام بتانا شروع کرتا، جب وہ خاموش ہو جاتا تو مجھ سے کہتے کہ جاوید جو کھانا ہو، منگوائیں۔کبھی خود سے کسی کھانے کی فرمائش نہیں کی، یہ ان کی اعلیٰ ظرفی کی بہترین مثال تھی۔

منور بھائی مزاجاً تنہائی پسند تھے،لیکن ملنے والوں پر کبھی یہ آشکار نہیں کرتے۔اچانک کبھی ملنے پہنچ جاتے تو ان کو غور و تدبّر میں منہمک پاتے گویا خلوت میں ایک عجیب اضطرابی کیفیت میں رہتے،کوئی سوزِ دروں تھا جو انھیں متفکر رکھتا۔بدلتے ہوئے عالمی منظر نامے اورعصری تقاضوں سے نہ صرف باخبر رہتے بلکہ اس کے مداوا کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے۔

حلقۂ احباب میں بھی اس پر تبصرہ کرتے،احباب کی آراء پر غور کرتے اور اگر آرا صحیح ہوتی تو اس پر عمل کرنے کی تلقین کرتے۔اپنی اضطرابی کیفیت اورغور و تدبّر کے باوجود جلوت میں زیرِلب تبسم کا پیکر تھے۔ دورانِ گفتگو مسکراہٹ اور کبھی کبھی ہلکی ہنسی ان کے مزاج کا خاصّہ تھی۔خودنمائی اور اپنی تشہیر فطرتِ انسانی کا خاصّہ ہے،لیکن اس کے برعکس اخفا ایک ایسی صفت ہے جو ہر کس و ناکس میں نہیں پائی جاتی، کیوں کہ انسان کی فطرت اظہار کی طالب ہے، جب بھی اسے موقع ملے گا۔یہ خودنمائی کا مظاہرہ کرے گی۔لیکن منور بھائی کی فطرت اخفا سے عبارت تھی۔ایک بار منور بھائی کے ساتھ شعبہ میں بیٹھے ہوئے تھے،اتنے میں کچھ دوست بھی آ گئے اور آتے ہی مجھ سے شعر پڑھنے کی فرمائش کر بیٹھے۔چوں کہ منور بھائی موجود تھے،اس لیے ان کے سامنے شعرخوانی سے گریز کیا۔اتنے میں منور بھائی نے کہا: جاوید مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم بھی شاعری کرتے ہو۔کچھ اشعار سنائیں، میں بھی سنوں گا۔منور بھائی سے اجازت ملی تو چند اشعار پڑھے۔دوسرے دن منور بھائی نے کہا، جاوید اپنی ایک غزل مجھے بھی دو، میں رسالہ میں شائع کراؤں گا۔اگلے دن میں نے ایک غزل ان کو دے دی۔آئندہ ماہ ’رفیق منزل‘(اپریل ۱۹۸۹) میں شائع ہوئی اور مجھے وہ شمارہ دے دیا۔شمارہ لیتے ہی پہلے میں نے اپنی غزل دیکھی اور پھر رسالہ کا پہلا صفحہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ منور بھائی پچھلے ایک سال سے اس کے مدیر ہیں، لیکن مجھے کبھی نہیں بتایا۔اس کے علاوہ بھی وہ اس زمانے میں بیک وقت کئی علمی و ادبی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

ایک بار ایس۔آئی۔او کے کام کے سلسلے میں مجھے مراد آباد (جماعت اسلامی کے دفتر) بھیجا۔آمد و رفت

کا خرچ دیا، ساتھ میں چند دستاویزات اور ایک رُقعہ بھی دیا جو جماعت کے دفتر میں دینا تھا اور وہاں سے کچھ رقم بھی لانی تھی۔ منور بھائی مجھے علی گڑھ کے ریلوے اسٹیشن تک پہچانے آئے۔ چوں کہ رات کا سفر تھا، اس لیے کچھ احتیاطی مشورے بھی دیے جو میرے علم و تجربہ میں نہیں تھے۔ تیسرے دن مرادآباد سے واپس آئے اور ان کے کمرے پر ملنے گئے۔

یقین جان یے ایسے بغل گیر ہوئے کہ جیسے عرصہ دراز کے بعد ملاقات ہوئی ہو۔ سفر کی مختصر روداد سنی اور شمشاد مارکیٹ لے گئے۔ وہاں چائے نوش کی، مغرب کی نماز ادا کی اور پھر اپنے اپنے کمرے کی جانب روانہ ہو گئے۔ منور بھائی کے اس عمل و اخلاق سے میں بہت متاثر ہوا اور یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ان کی سرشت میں انتہائی درجہ علم دوستی اور انسان دوستی تھی۔ آخر میں حفیظ میرٹھی کا ایک شعر درج کرتے ہوئے مضمون کو ختم کر رہا ہوں جو کسی حد تک منور بھائی کی شخصیت کی ترجمانی کرتا ہے۔

تحریر سے ممکن ، نہ تقریر سے ممکن
وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

علی گڑھ میگزین (۸۶-۱۹۸۵ء) کی یاد میں

سید شہاب الدین

ڈاکٹر منور حسین مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۳ء میں ہوئی جب وہ بی اے آنرز (اردو) سال آخر کے طالب علم تھے اور میں شعبہ قانون سال اول میں تھا۔لیکن بنیادی طور پر میں ان سے متاثر ہوا ان کی فطری سادگی، طبع زاد ذہانت اور حد درجہ متانت وسنجیدگی سے جو شاید انھیں ورثے میں دویعت ہوئے تھے۔ستمبر ۲۰۰۰ء میں ان کی اچانک موت پر جو صدمہ میرے دل پر گزر گیا وہ لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔میں نے صرف یہ جانا کہ ان کی موت شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے ایک نا قابل تلافی نقصان سے کم نہ تھی۔میں نے انھیں دیکھا تھا اور دوسروں سے سنا بھی کہ وہ شعبہ میں طلبہ واساتذہ اور غیر تدریسی عملہ کے درمیان مقبول تھے۔ وہ محنت سے تدریسی فرائض انجام دینے والے، سمیناروں کی پروسیڈنگ تیار کرنے والے، شعبہ کے رسائل وجرائد میں مقالات کے علاوہ ان کی ترتیب وتدوین کرنے والے تھے۔چنانچہ ان کے انتقال پر اساتذہ شعبہ نے تعزیتی اجلاس میں اس نقصان اور خسارے کا ذکر کیا تھا۔

منور حسین صاحب سے قربت کی ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۹۸۵ء میں ہم اور وہ ایک مقابلے میں حریف بن گئے تھے۔معاملہ علی گڑھ میگزین اردو کی ایڈیٹر شپ کا تھا۔دیگر ساتھیوں کی طرح ہم دونوں بھی امیدوار تھے۔مجھے قوی امید تھی کہ میں مدیر علی گڑھ میگزین بن جاؤں گا کیوں کہ میرے پوائنٹس سب سے زیادہ تھے، میں سر ضیاء الدین ہال کی میگزین کا مدیر بھی رہ چکا تھا، شعبہ قانون سے مسلم یونیورسٹی کورٹ کا بلا مقابلہ ممبر منتخب ہوا تھا، لٹریری اینڈ کلچرل سوسائٹی سے وابستگی بھی تھی۔نیز کچھ غزلیں، افسانے اور دیگر مضامین بھی تھے۔ لیکن ایڈیٹر شپ کا قرعہ فال منور حسین صاحب کے نام نکلا۔ہوا یوں کہ میں والدہ کو پہنچانے علی گڑھ سے آسنسول آ گیا اور دن دس دنوں کے درمیان میں انٹرویو ہو گیا! واپسی پر جب شعبہ اردو پہنچا تو معلوم ہوا کہ انٹرویو تو ہو چکا ہے اور منور صاحب اس کے مدیر بن چکے ہیں! یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری لیکن یک گونہ طمانیت کا احساس بھی ہوا کہ حق بحق دار رسید۔اور منور حسین صاحب نے ثابت کر دیا کہ ان کی ارادت میں شائع

ہونے والا شمارہ معیاری مقالات کی وجہ سے ایک نشان اور معیار قائم کر گیا۔ میں نے منور حسین صاحب کو مبارک باد پیش کی اور انھوں نے اسے قبول کیا لیکن معاً انھوں نے یہ سوال کیا کہ آپ انٹرویو میں کیوں نہیں شامل ہوئے؟ میں نے اپنی معذوری کی وجہ معصومیت کے ساتھ بتادی۔آج جب کہ سیوان بہار سے بیٹھا یہ سطور لکھ رہا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کلچر میں مبارک بادیوں کی بھی اپنی ایک شان ہوتی تھی۔دوست اور دشمن یا منافق نما دوستوں کے درمیان خلیج اور دوریوں کو پاٹنے میں یہ مبارک بادیاں اپنی ایک تاریخ رکھتی ہیں۔میری مبارک بادی بھی انہی اقسام میں سے ایک تھی۔کچھ ہی دنوں میں جناب ڈاکٹر سید محمد ہاشم صاحب سے ملاقات پر علی گڑھ میگزین کا تذکرہ نکل آیا تو انھوں نے بے تکلفی سے فرمایا کہ شہاب الدین صاحب! آپ چیرمین شعبہ اردو کو ایک درخواست دے دیجیے تاکہ مجلس ادارت میں آپ شریک ہو سکیں۔ میں نے کہا حضور والا! اس سے قبل وسیم الرحمٰن صاحب اس میگزین کے مدیر تھے اور ان کی مجلس ادارت میں بندہ لطف اندوز ہو چکا ہے۔ایڈیٹری چاہیے تھی جو نہیں ملی، سو کوئی گلہ بھی نہیں۔

۸۶-۱۹۸۵ء میں طلبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا علمی وادبی رجحان علی گڑھ میگزین پروفیسر عتیق احمد صدیقی کی سرپرستی اور ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی کی نگرانی میں، منور حسین صاحب نے پوری آن بان اور شان کے ساتھ نکالا۔اس اہم شماروں کی دیگر تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے منور حسین صاحب کے اداریے اور ان کے ایک مضمون 'تدریس کی بعض مسائل' کے چند تراشے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، جن کے ذریعہ موصوف کی علمی، تحقیقی اور ادبی صلاحیتوں کا ایک عکس ہمارے سامنے آسکے گا۔ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

> ''ادارت کی ذمہ داری قبول کرتے وقت میرا یہ احساس تھا کہ اس علمی دنیا میں مضامین کا حصول چنداں مشکل نہیں اور بعد کے مراحل تو آسان تر ہوں گے لیکن عملی دنیا سے سابقہ نے میرے خیال کی حقیقت منکشف کردی اور اس راہ کے مراحل کی دشواریوں کا کچھ اندازہ ہوا کہ بعد کا ہر مرحلہ شاید ماقبل کے مرحلہ سے دشوار تر تھا جس کا صحیح اندازہ اگر پہلے ہوتا تو شاید اس ذمہ داری کو انجام دینے کا حوصلہ میں نہ کر پاتا۔تاہم یہ خدا کا فضل وکرم ہے کہ اسے تکمیل کی منزل تک پہنچانے کے لائق ہوسکا'۔
>
> ......مضامین کی فراہمی کے دوران اس کا واقعی احساس ہوا کہ مضمون کے لیے وعدہ کرلینا جتنا آسان ہے شاید اس کا ایفا اس قدر آسان نہیں۔ میں ان تمام مضمون نگاروں کا ممنون ہوں بالخصوص اساتذہ کرام کا جنھوں نے میری درخواست کو قابل اعتنا سمجھا۔ میں ان کا بھی

شکر گزار ہوں جنھوں نے وعدے تو کیے گرچہ ان کے ایفا کی نوبت نہ آسکی، مجھے ان اساتذہ کرام کا بھی ممنون ہونا چاہیے جن کی صاف گوئی نے مجھے دوبارہ حاضری کی سعادت سے محروم رکھا۔ میرے شکریے کے مستحق وہ احباب بھی ہیں جن کے مشورے، رہنمائی اور ہمت افزائی شامل حال رہی۔ ممبرانِ مجلس ادارت کا شکریہ اس لیے غیر ضروری ہے کہ کسی رسالہ کی اشاعت انہی کی کوششوں کی مرہونِ منت ہوا کرتی ہے اس کا بہرحال اعتراف ناگزیر ہے کہ میں نے انھیں ہمہ وقت تعاون کے لیے آمادہ پایا''۔

''یہ شعبہ اردو کا اختصاص ہے کہ اس کے زیر اہتمام علی گڑھ میگزین (اردو) کے توسط سے یونیورسٹی کی نمائندگی ہوتی ہے۔ یہ شرف اس کے لیے فطری بھی ہے اور باعث افتخار بھی۔ اردو میگزین کے حوالہ سے ذہن خود بخود زبان اردو کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ بے موقع نہ ہوگا اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے اردو کی صورت حال پر غور کریں۔ حقیقت پسندانہ جائزہ یہ بتاتا ہے کہ اس ملک میں اردو کا مستقبل شاید کچھ زیادہ تابناک نہیں۔ جس زبان کا رشتہ معاش سے کاٹ دیا جائے تو مادہ پرستی کی موجودہ فضا میں اس کی حفاظت کی ضمانت مشکل ہی معلوم ہوتی ہے۔ کچھ یہی صورت حال اس ملک میں اس زبان کی ہے، اردو کی ترقی، حمایت، اشاعت اور فروغ کے تمام تر دعوؤں کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے روز بروز اس کا دائرہ سمٹتا جارہا ہے۔ خود اس زبان کے مولد و منشا میں اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ نئی نسل کی بڑی تعداد بڑی تیز رفتاری سے اس زبان سے اپنا رشتہ کاٹ رہی ہے۔ اردو کی موجودہ صورت حال پر ایک مشہور ادیب کے یہ الفاظ انتہائی قابل عبرت ہیں۔ میں بذات خود بہت سے اردو ادیبوں سے واقف ہوں جن کی معاش اسی زبان سے وابستہ ہے لیکن ان کی اولاد انگلش اسکولوں میں زیر تعلیم اور افسوس ناک حد تک اردو سے ناواقف و بیزار ہے۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

زبان کے اس جائزہ کے پس پشت کوئی موہوم اندیشہ یا احساس کمتری ہرگز نہیں، خود مسلم یونیورسٹی جہاں اس زبان سے وابستہ افراد کی کریم (Cream) رہتی بستی ہے ان کا سروے موجودہ احساس کو تقویت بخشتا ہے۔ یہ ادارہ ایک بیرومیٹر ہے جس سے اس سے وابستہ روایات، اقدار، لسانی و تہذیبی ورثے کے عروج و انحطاط کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ درمیانی سطح کی اردو کو سن کر سر پر سے گزر جانے کی باتیں اس لسانی زوال و انحطاط کی بین ثبوت ہیں، اور اب تو بڑی تعداد ایسی ہے جو اردو پڑھنے اور لکھنے سے بیگانہ ہے یا ہوتی جارہی ہے۔

اس صورت حال میں بعض محبانِ اردو کی یہ دلی خواہش ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دلائیں، لیکن ان کے بقول، ان کی سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اردو میں نصابی کتابیں موجود نہیں اور جو ہیں وہ اس قدر فرسودہ وروایتی طرز کی کہ بچے ان میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتے۔ گویا جدید طرز پر نصابی کتابوں کی تیاری کی ضرورت ہے تاہم صورت حال کچھ اتنی زیادہ خراب نہیں۔ اردو میں ایسی کتابیں بھی تیار ہوئی ہیں جو بڑی حد تک اپنے اندر بچوں کی دل چسپی اور کشش کا سامان رکھتی ہیں۔ ضرورت صرف دائرۂ نظر کو وسعت دینے کی ہے۔ لیکن اگر واقعی بحران کچھ ایسا ہی ہے تو اردو اکیڈمی، ترقی اردو بورڈ، شعبہ ہائے اردو اور محبانِ اردو کو اس طرف سنجیدگی سے توجہ کرنی چاہیے، لیکن اس زبان کی واقعی ترقی ممکن نہیں جب تک اسے باضابطہ ایک سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم نہ کرلیا جائے اور تعلیم اور ملازمتوں کی وہ تمام سہولتیں اسے بھی حاصل نہ ہو جائیں جو قومی زبان کو حاصل ہیں۔ آج مسئلہ یہ ہے کہ کہیں تعلیم کے لیے یہ زبان منظور کرلی گئی ہے تو اساتذہ نہیں ملتے اور اگر اساتذہ ہیں تو طالب علم نہیں اور اگر یہ دونوں موجود ہوئے تو مناسب نصابی کتب کا فقدان ہے اور اگر یہ سب کچھ میسر ہوں تو ملازمتوں اور ترقیوں کے دروازوں پر تعصب کے پہرے ہیں۔ اردو زبان کی ترقی کی خاطر اگر مطلوبہ مراعات حاصل نہ کی جاسکیں تو اسے دینی درس گاہوں تک محدود ہوجانے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ آج اگر واقعی اردو کی تعلیم وفروغ کی کوئی کوشش ہورہی ہے تو وہ مخصوص اداروں یا علاقوں سے وابستہ ہے۔

زبان کی موجودہ صورت حال کی اصلاح کے لیے اگر کبھی آواز اٹھتی ہے تو اولاً اسے کچھ بہتر تصور نہیں کیا جاتا۔ ثانیاً دانا دشمنوں اور نادان دوستوں کی طرف سے ایک آسان، دل فریب اور سستا نسخہ یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ اردو اور ہندی جب اصل میں ایک ہی زبان ہیں تو پھر اس کے درمیان سے مغائرت کی غیر ملکی دیوار کو ڈھا دینا ضروری ہے۔ صرف فارسی رسم خط ہی ان کے درمیان بیگانگی کے رشتے قائم کرتی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اردو کو دیوناگری رسم خط دے کر صحیح معنوں میں سیکولر کردار عطا کیا جائے اور اس کے لیے اپنی فضا میں پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے لامحدود امکانات پیدا کردیے جائیں۔ یہ تجویز جس قدر معقول بنا کر پیش کی جاتی ہے کم از کم اسی قدر غیر منطقی، سطحی اور غیر فطری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو، دیگر زبانوں کی طرح اپنے رسم خط ہی سے ممتاز ہوسکتی ہے اور اس کے رسم خط کو ختم کردینے کا انجام اس کی موت پر مہر تصدیق ثبت کردینے کے مترادف ہوگا لیکن معاملہ صرف اسی قدر نہیں، یہ زبان اپنی پشت پر صدیوں کی تہذیب وتمدن کی روایت رکھتی ہے اس زبان کی خمیر میں وہ تہذیبی وثقافتی عناصر گھل مل گئے ہیں، دوسرا کوئی رسم خط یا زبان شاید ان

تہذیبی وثقافتی تقاضوں کی ادائیگی کی اہل نہیں ہوسکتی، ہر زبان کی ایک انفرادیت ہوتی ہے اور وہ بڑی حد تک صرف رسم خط ہی سے قائم رہتی اور رہ سکتی ہے جب کہ بعض دیگر لسانی تقاضے بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ اردو کے رسم خط کے سلسلے میں غیر ملکی ہونے کا حوالہ اور اس بیرونی عنصر کو خارج کر دینے کی تجویز سازشی ذہن کی ترجمانی ہے۔ ورنہ یہ ایک میں حقیقت ہے کہ ہم نے اپنی تہذیب وثقافت میں بے شمار بیرونی عناصر شامل کر لیے ہیں، جن کے بدیسی ہونے کا خیال تک نہیں ہوتا، ہم مغربی تہذیب میں سرتاپا اس طرح غرق ہیں کہ اس سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ ذہنی غلامی ہم پر اس قدر مستولی ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ تقلید ہمارے لیے باعثِ فخر ہوگئی ہے، ان معاملات میں کسی کو غیر ملکی اثرات کبھی نہیں کھٹکتے تو پھر صرف فارسی رسم خط کے معاملے میں یہ جانبدارانہ رویہ کیوں جب کہ مشرق کے برعکس مغرب سے ظلم وبربریت اور استحصال ومضرت کے سوغات ہی ملے ہیں:

بریں عقل ودانش بباید گریست' (اداریہ، علی گڑھ میگزین)

منور حسین صاحب نے اپنے مضمون 'تدریس کے بعض مسائل' میں جن فکری نکات کی طرف نشان دہی کی ہے اگر ارباب حل وعقد انہیں عملی جامہ پہنانے میں یکسو ہو جائیں تو یقین جانیے نہ صرف مسلم یونیورسٹی بلکہ دیگر تعلیمی اداروں میں نصاب ونظام تعلیم کو ایک زندگی عطا ہو جائے گی۔ ان کے چند اقتباسات ملاحظہ کریں:

''زندہ قومیں اپنی ضرورتوں کے کماحقہ احساس کے ساتھ اپنے پروگرام وضع کرتی ہیں، تعلیم جس کی اہمیت قوموں کی زندگی میں ناقابل فراموش ہے، اس سلسلے میں بھی زندہ قوموں کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ضرورتوں کا صحیح ادراک کریں۔ اور ایسا نظام تعلیم اختیار کریں جو ان کی ضرورتوں کا کفیل ہو، اگر کسی قوم میں اپنی اصل ضرورت کے احساس کا فقدان ہو جائے تو اس قوم پر فاتحہ پڑھ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تعلیمی اداروں میں تدریس کا وہی مقام ہے جو جسم انسانی میں روح کا۔ اقامتی ادارے تدریس کے ساتھ اور بھی تقاضے رکھتے ہیں۔ تدریسی مسائل کے ذکر میں ان سے تعرض ناگزیر ہے۔ معیار تعلیم کی بلندی اداروں کی نیک نامی کی اہم بنیاد بنتے ہیں۔ اس معیار کی بلندی وپستی میں متعدد عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن میں طلبہ، اساتذہ، نصاب تعلیم، انتظامیہ وغیرہ اہم ہیں۔'' (علی گڑھ میگزین، ص ۶۷)

ڈاکٹر منور حسین کہتے ہیں کہ تدریس کے تشفی بخش ہونے میں اساتذہ وانتظامیہ کے مابین تعلق کی بہت اہمیت ہے۔ اگر انتظامیہ کی نگاہ میں اساتذہ کے محترم منصب کا پاس ہے تو یہ تدریسی عمل کے قابل اطمینان

ہونے کی ضمانت ہے۔ اس کے برعکس جہاں اساتذہ ملازمین کی صف میں شامل ہوں وہاں بہتر تدریس کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ اطمینان بخش تدریس کے لیے جہاں یہ انتہائی ضروری ہے کہ ماہر اور لائق اساتذہ کی خدمات حاصل کی جائیں، وہیں یہ بھی کم اہم نہیں کہ ان کی صلاحیتوں کو انتظامی امور میں مصروف کر کے ضائع نہ کیا جائے... مختلف مضامین کے لیے ایسے اساتذہ کی نامزدگی جو ان موضوعات پر درک رکھتے ہوں انتہائی اہم ہے۔ (ص: ۶۸) صرف تجربہ کی خاطر کسی مضمون کی تفویض استاد، طالب علم اور پیشہ تدریس سب کے ساتھ ظلم ہے۔ استاد طالب علم کے درمیان رابطہ کی نوعیت کا انحصار بڑی حد تک طریقہ تدریس پر ہے۔ اس پر بھی تقریباً تمام ماہرین تعلیم متفق ہیں کہ تعلیم کا وہ طریقہ جو طالب علم کو Active Thinker بنائے اس طریقہ سے بہتر ہے جو اسے سامع مجہول (Passive Listener) بنادے۔ (ص: ۶۹)

آج کے تدریس کی ایک بہت اہم ضرورت مصنفین کی کثرت اور کتابوں کی فراوانی میں محتاط انتخابی رویہ کا اختیار کرنا ہے۔ آج کا دور علمی فیضان (Explosion of Knowledge) کا دور کہلاتا ہے۔ ایک شعبہ علم میں دوسرے علوم اس طرح شامل ہوگئے ہیں کہ کسی بھی مضمون کا مطالعہ In Isolation ممکن ہی نہیں۔ اس لیے آج یہ انتہائی ضروری ہے کہ کسی شعبہ علم کے ساتھ متعلقہ شعبہ ہائے علوم کی کچھ بنیادی معلومات ضرور ہوں۔ اس طرح زبان وادب میں مختلف زبان وادب اور علوم سے واقفیت کا مطالعہ کرنے میں بالخصوص ان زبانوں یا علوم کا مطالعہ تو ناگزیر ہے جو عناصر ترکیبی کی حیثیت اختیار کر چکے ہوں۔ آج کی درجہ بند تدریس تعلیم کے بہتر فروغ کے لیے ایک درجہ میں یکساں معیار کے طلبہ کی طالب ہے... ایک مشفق استاد اپنے وقت کی طرح طلبہ کے وقت کی قدر کرتا ہے اور وہ انھیں مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے وقت کا ہر لمحہ استعمال میں لائے، چنانچہ وہ ایسے کام میں کلاس کا وقت صرف نہیں کرتا جو کلاس کے علاوہ اوقات میں انجام دیے جاسکتے ہوں۔ (ص: ۷۰-۷۱)

اس مقالہ کا آخری حصہ ملاحظہ کریں:

''ہر دور کی طرح شاید آج بھی ہمہ دانی یا اکملیت کے دعوے ناپسندیدہ ہی ہیں اس لیے کہ ترقی اس دعویٰ کے فقدان ہی سے وابستہ ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ تاہم اس کی سفارش کی جاتی ہے کہ ایسے باصلاحیت اور ماہر اساتذہ کو نیچے کے درجات سپرد کیے جائیں جو ان میں متعلقہ مضمون سے دل چسپی پیدا کرسکیں۔ اس طرح کی بہتر ابتدا اعلیٰ تعلیم کی بہتری کی ضمانت بن سکتی ہے جب کہ اس طرف سے خاطر خواہ بے توجہی آج کے تعلیمی معیار کو پست کرنے کی بڑی وجہ ہے۔ ابتدائی منزلوں میں غیر موزوں اساتذہ سے سابقہ کسی بھی مضمون

سے طلبہ کو متنفر کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اسی طرح کسی مضمون کی تدریس کے وقت حقیقت پسندی کا ثبوت دینا انتہائی ضروری ہے۔ اس مضمون کو زمانہ کے سیاق میں رکھ کر برتنا اور طلبہ پر بھی زمانہ سے اس کے تطابق کو آشکارا کرنا انتہائی ضروری ہے، عہد کے تقاضوں سے کاٹ کر یا مثالی دنیا میں پہنچ کر کسی مضمون کی تدریس کم از کم طالب علم کے نقطۂ نظر سے سخت نقصان دہ ہے۔ حقائق کا پاس رکھنے کی ایک بہتر مثال شعبہ اردو کے ایک استاذ کی ہے جو بی اے میں اردو تدریس کے دوران اکثر یہ فرمایا کرتے کہ ''تم میں سے کون BUMS میں بیٹھنا چاہتا ہے یہ ان کا استفسار نہیں بلکہ ترغیبی جملہ تھا جس کی تکرار ایک سال میں کئی بار ہوتی تھی۔ اسی طرح تدریس کی انتہائی منزل پر بھی طلبہ کی استعداد کے مطابق ان کی بہتر رہ نمائی طالب علم، ادارہ اور خود اساتذہ کی کام یابی کی ضامن ہیں، جب کہ طلبہ کی صلاحیتوں کا استحصال خود ادارہ کے لیے باعث ننگ و عار ہے۔

یہ وہ چند مسائل ہیں جن پر خاطر خواہ توجہ کے ذریعہ طالب علم میں خود اعتمادی، موضوع کی بصیرت اور اظہار رائے کی قوت پیدا ہو سکتی ہے جو تعلیمی معیار کی بہتری کے لیے لازمی و ناگزیر ہیں۔ تعلیمی معیار سے وابستہ عوامل میں استاد کا مقام غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ صرف استاد ہی کا یہ منصب ہے کہ وہ دیگر تمام عوامل کی خامیوں اور نقائص پر قابو پا سکتا ہے، اگر استاد باصلاحیت ہو، اپنے مقام و منصب سے آگاہ ہو اور تدریس سے مطلوبہ مقاصد کے حصول کا کما حقہ شعور رکھتا ہو تو وہ بالکل مخالف حالات میں بھی اپنے مقاصد کے حصول میں کام یاب ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں کسی کی یہ رائے بڑی وقیع ہے کہ کسی استاد کے ذمہ اگر رامائن یا داس کیپٹل کی تدریس ہو اگر وہ باصلاحیت ہے تو ان کتابوں کی تدریس کے ذریعہ بھی طلبہ میں اسلامی تعلیمات کی معقولیت، صداقت، ابدیت، ہمہ گیری اور برتری کا یقین پیدا کر سکتا ہے۔''

(علی گڑھ میگزین، تدریس کے مسائل، ص: ۷۲-۷۳)

الغرض میرے منور صاحب تو علمی شان والے تھے، سمیناروں میں ان کے مقالات، کتابوں پر ان کے تبصرے اور تجزیے نیز تدریس میں مفوضہ موضوعات پر ان کا درک اور عبور، آج کے طلبہ، اساتذہ اور محققین کے لیے اپنے اندر بے شمار دروس و اسباق رکھتے ہیں۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

برادر اکبر منور حسین۔ رفتید و لے نہ از دل ما

نوشاد عالم فلاحی

دنیا سرائے فانی ہے جو یہاں آیا ہے اسے واپس جانا ہی ہے۔ جسے ماں کا گود میسر ہوا اسے قبر کی آغوش میں جانا ہی ہے۔ ہم سب شہر افسوس کے باشندے ہیں۔ ہمارے پاس اگر کوئی دولت ہے تو وہ یادوں کی دولت ہے۔ کوئی سرمایہ ہے تو وہ زخموں کا سرمایہ ہے۔ کوئی متاع ہے تو وہ صرف متاع درد ہے۔ درد کا رشتہ بھی عجیب رشتہ ہے۔ یوں بھی زندگی صرف اپنے وجود کے احساس کا نام نہیں۔ بزرگوں سے عقیدت ومحبت، عزیز واقارب کی دردمندی وغم گساری احباب سے خلوص ومحبت اور حالات کے دھوپ چھاؤں کے تار حریر صد رنگ سے جو قبا تیار ہوتی ہے، زندگی اس کا نام ہے۔ انسان جب تک زندہ رہتا ہے جانے انجانے میں بے شمار یادوں کو تخلیق کرتا رہتا ہے۔ جب انسان مرجاتا ہے تو بظاہر ایک زندگی ختم ہوجاتی ہے ایک دنیا خاموش ہوجاتی ہے۔ ایک جہاں ویران ہوجاتا ہے لیکن مرنے والے سے وابستہ تمام یادیں زندہ ہوجاتی ہیں۔ یادوں کا سارا عہد متحرک ہوکر رواں دواں ہوجاتا ہے۔

علی گڑھ کے ایام طالب علمی میں منور بھائی شعبۂ اردو میں ہمارے سینئر تھے۔ اکثر ان سے کسب فیض حاصل رہا۔ سرسید ہال (نارتھ) میں بھی وہ ہمارے سرپرست رہ نما اور غم گسار تھے۔ سادہ طبیعت، منور کردار، باضمیر اور متعدد اوصاف کے حامل وہ سچ مچ اسم با مسمیٰ تھے۔ میں سمجھتا ہوں سرسید کے ارکان خمسہ میں جو حیثیت مولوی ذکاء اللہ کی تھی وہی مرتبہ منور بھائی کا تھا۔ وہی مشرقی انداز تمدن، شیروانی چوڑی مہری کا پاجامہ زیب تن کرتے اور خستہ سائیکل پر سوار ہوکر شعبۂ اردو جایا کرتے۔ اکثر راستے میں سلام علیک ہوجایا کرتی۔ مشرقی تہذیب وتمدن کے پرستار اور تحریکی مزاج ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑا کرتا۔ مجھے یاد ہے ایس آئی او کی ماہانہ نشست سرسید ہال کے جامع مسجد میں ہوا کرتی۔ منور بھائی راقم الحروف اور فیض الرحمٰن فلاحی کو اکثر نشست میں آنے کی ترغیب وتلقین کرتے۔ ہم دونوں کبھی کبھار نشست میں شامل ہوتے اور ان کے ارشادات دردمندی تعمیری سوچ سے فیض یاب ہوتے۔ منور بھائی قدرے اصول پسند (Idealist) تھے۔ ڈسپلن شکنی ان کے یہاں جرم تھا۔

جب ہم اور فیض الرحمٰن UGC کے لیے تیاری کر رہے تھے تو منور بھائی کے کمرے میں گئے۔ انہوں نے بڑی محبت اور شفقت سے UGC کے نوٹس ہم کو دیے اور JRF میں کام یاب ہونے کے کارگر (Tips) ہم کو سمجھائے۔ ان کی رہ نمائی اور نوٹس کو پڑھ کر ہم اور فیض الرحمٰن دونوں UGC SRF کے لیے منتخب ہوئے اور نہ جانے کتنے احباب کو منور بھائی کے نوٹس کو افادۂ عام سمجھ کر Viral کیا گیا اور کئی لوگ کام یاب بھی ہوئے۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب شعبۂ اردو میں Selection committee چل رہی تھی۔ ہم دونوں منور بھائی کے لیے بہت فکرمند رہتے کہ کاش ان کا تقرر شعبۂ اردو میں ہوجائے۔ سرسید ہال کے Mess میں کھانا کھانے کے بعد ہال کے میدان میں ہم لوگ ٹہلتے رہے۔ میں نے دورانِ گفتگو منور بھائی سے خلیل الرحمٰن اعظمی کا یہ شعر سنایا:

یاروں نے خوب بڑھ چڑھ کے زمانے سے صلح کی
میں ایسا کم نصیب یہاں بھی پچھڑ گیا

منور بھائی میرا اشارہ سمجھ گئے اور برجستہ یہ شعر پڑھا:

کیا غم ہے اگر ساری خدائی ہو مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہو

جو لوگ علی گڑھ سے وابستہ رہے ہیں انہیں بخوبی علم ہے کہ علی گڑھ میں تقرری کے معاملات میں جوڑ توڑ اور اقربا پروری کا عمل دخل زیادہ رہتا ہے۔ معیار اور لیاقت ثانوی چیز ہوجایا کرتی ہے۔ اکثر پروفیسر صاحبان کو ہم نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو طلبہ ذہین اور اہل ہیں ان کے لیے ہندوستان کی دیگر جامعات میں بھرپور گنجائش ہے لیکن AMU خدمت خلق کے جذبے سے معمور صرف کم لیاقت والوں کے دروازے ہمیشہ وا کیے رہتا ہے۔ نہ جانے وہاں تقرری کے اب کون سے معیار چل رہے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

منور بھائی کا شعبۂ اردو میں بحیثیت لیکچرار تقرر ہوا تو ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے اپنے کو جگہ ملی۔ حق بحق دار رسید۔ ہماری آنکھوں میں چمک آ گئی اور ہم بھی شعبۂ اردو میں اپنے لیے خواب بننے لگے۔ کبھی کبھار خالی پیریڈ میں منور بھائی ہم لوگوں کی MA کی کلاس بھی لیتے۔ ان کا اندازِ تعلیم موثر تھا۔ منور بھائی شعبۂ اردو سے ۲۰۰۰ء تک منسلک رہے اور تدریسی فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ ان کی کرم فرمائی اور رہ نمائی ہمیشہ ہمارے ساتھ رہی۔ پھر ایک دن یہ جانکاہ خبر دل ودماغ کو سرخستہ کر گئی کہ منور بھائی اس دنیا میں نہیں رہے۔ یہ خبر بجلی بن کر آئی۔ راقم الحروف اور فیض الرحمٰن فلاحی دونوں منور بھائی کے جسد خاکی کو دیکھنے کے لیے جو جواہر لال نہرو میڈیکل کالج

کے عقب میں دھورامیں کسی کے مکان میں رہتے تھے۔ منور بھائی کو دیکھ کر ان سے وابستہ تمام یادیں روشن ہوگئیں۔ اگلے دن شعبہ اردو میں ایک تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا اور ان کے کارہائے نمایاں کو یاد کیا گیا۔ خاص طور پر رفیق منزل کے پرمغز اداریے زیر بحث آئے اور ان کی علمی لیاقت کا اعتراف پروفیسر شہریار، پروفیسر ابوالکلام قاسمی وغیرہ نے کیا۔ منور بھائی شعبۂ اردو میں ہمارے سینئر تھے۔ ہمارے سامنے ہی ان کی تقرری ہوئی۔ لوگ کہتے ہیں زندگی لمبی نہیں بڑی ہونی چاہیے۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے یہ شعر شکایتاً اکثر یاد آتا ہے ؎

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی
تم جیسے گئے ویسے بھی نہیں جاتا کوئی

ان کی علمی لیاقت اور صحافتی فتوحات کا اعتراف پروفیسر شہریار مرحوم اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی وغیرہ نے کیا۔

دنیائے ادب کا پرانا دستور ہے کہ کبھی کبھی وہ ایسے قلم کاروں کو نظر انداز کر دیتی ہے جس کا افسوس تا قیامت ہوتا ہے۔ اس عالم آب و گل میں بے شمار شخصیات ہیں جنہوں نے اپنے خون جگر سے علمی گلستان کی آبیاری کی ہے لیکن وہ آج تک گوشۂ گمنامی میں پوشیدہ ہیں لیکن مرنے کے بعد ان کی تخلیقات کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ کبھی کبھی تو احساس ہوتا ہے کہ بے شمار ایسے افراد ہیں جن کے متعلق بے جا لکھا گیا اور مبالغہ سے کام لیا گیا اور بہتوں کے بارے میں کما حقہٗ نہیں لکھا گیا۔

منور حسین کی شخصیت کثیر جہاتی اور متنوع اوصاف پر مبنی تھی۔ وہ بیک وقت داعی، خطیب، نثر نگار اور محقق تھے۔ رفیق کے اداریے ان کی علمیت، حالات حاضرہ کی کامیاب عکاسی اور ذکاوت کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے اداریے کے مطالعہ سے یہی مجموعی تاثر ابھرتا ہے کہ ان کا رشتہ ابوالکلام آزاد کے الہلال والبلاغ اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے صدق جدید کے تعمیری و اصلاحی صحافت کی یاد دلاتا ہے۔ وہ زرد صحافت (Yellow Journalism) کے بجائے مقصدی صحافت کے علم بردار تھے۔ انہوں نے اپنے اداریوں میں اسلامائزیشن (Islamization) کو بطور خاص جگہ دی ہے۔ جو کہ عام طور پر صحافتی ادب میں تشنہ ہی رہتا ہے۔ عام طور پر اداریے میں ہنگامی و فروعی موضوعات پر خامہ فرسائی کی جاتی ہے، مگر منور بھائی نے اپنے اداریے میں علمی مباحث، نظریاتی تصادم اسلامی نظریات کی ترجمانی سے اسے دو آتشہ بنا دیا ہے۔ استمراری و منطقی انداز، علمی نثر، خلوص و دیانت داری پر مبنی ان کے اداریے نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہیں۔ آج جب کہ مفاد پرستوں، خود پسندوں اور مصلحت اندیشوں کا چاروں طرف ایک میلہ سا لگا ہوا ہے ایسے وقت میں منور بھائی جیسے باعمل، مخلص، غم گسار اور تحریکی مزاج سے سرشار آفتاب منور کی یاد ہمیشہ آئے گی۔

●●

مولانا منور حسین فلاحی

سکندر علی اصلاحی

رضاء الٰہی مقصود و مطلوب ہو تو انسان بڑی سے بڑی مشکلات میں صبر کی راہ اختیار کرتا ہے اور اس پر جما رہتا ہے۔قرآن مجید کی آیت سے واضح ہوتا ہے کہ صبر کی اساس اللہ کی رضا ہے اور اسی رضاء الٰہی کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہی کامیابی روشن علامت ہے۔وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاء وَجْهِ رَبِّهِم(الرعد-۲۲)''اجواپنے پروردگار کی رضا کی خاطر صبر کرتے ہیں۔''

ایک مسلمان کا تصور ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کا آغاز ہے۔

برادر مکرم مولانا منور حسین فلاحی (۱۹۵۹-۲۰۰۰) جامعۃ الفلاح بلریا گنج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نامور فرزند تھے، جو زندگی کے صرف ۴۱ برس دنیا کی نیرنگی کا تماشہ دیکھ کر دنیا رنگ و بو سے رخصت ہو گئے۔ بہت کم عمر پائی، مگر اپنے حلقۂ احباب کے درمیان اپنے اخلاق و کردار، علم و فضل اور خلوص و محبت کے گہرے نقوش قائم کر گئے۔ برادر موصوف مروت و شرافت، ہمدردی واپنائیت، سوز و گداز سے معمور دل کے مالک اور کفایت شعاری و سادگی و تسلیم و رضا کا پیکر تھے۔ چوڑے مہری کا پاجامہ، معمولی قسم کا کرتا اور اس پر شیروانی زیب تن کئے ہوئے ایک پرانی سائیکل پر پورے اطمینان و وقار کے ساتھ، عثمانیہ ہاسٹل کے کمرہ نمبر ۱۴، نارتھ ایسٹ ایس ایس ہال سے جلوہ افروز ہوتے اور آرٹس فیکلٹی، مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری، ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی پان والی کوٹھی دودھ پور، سنٹر فار ریلیجس اسٹڈیز اینڈ گائیڈنس، مزمل منزل وغیرہ کے درمیان سرگرم عمل نظر آتے۔شام کے اوقات میں اسلامک لائبریری شمشاد مارکیٹ میں پابندی سے حاضر ہوتے اور مطالعہ کے علاوہ دوست و احباب سے ملاقات کرتے۔

میں ان کے گھر، خاندان اور ابتدائی تعلیم وغیرہ سے واقف نہیں ہوں، مگر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں زیر تعلیم رہتے ہوئے اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا (ایس آئی او قیام ۱۹۸۲) کے ترجمان رفیق پٹنہ اور رفیق منزل دہلی کے ذریعہ ان کے نام سے واقف ہو چکا تھا۔ضلع اعظم گڑھ کے جماعت اسلامی

ہند کے ضلعی اجتماعات میں پابندی سے شرکت کرتا تھا۔ وہیں اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا (ایس آئی ایم قیام ۱۹۷۷) سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اس کے چند سال بعد ایس آئی او کی سرگرمیوں سے واقفیت ہوئی۔ مولانا منور حسین فلاحی ایس آئی او کے ابتدائی وابستگان اور ذمہ داران میں سے تھے۔ ۱۹۸۹ء میں، میں مدرسۃ الاصلاح سے فضیلت مکمل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے علی گڑھ حاضر ہوا، مگر نئے سیشن کے آغاز میں ابھی کئی ماہ باقی تھے، بعض بزرگوں اور بہی خواہان کا مشورہ تھا کہ میں ادارۂ تحقیق وتصنیف سے تصنیفی تربیت حاصل کرنے کے لیے وابستہ ہو جاؤں، مگر ادارہ کے خشک، صبر آزما اور حوصلہ شکن ماحول میں رہنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ البتہ مولانا سید جلال الدین عمری اور مولانا سلطان احمد اصلاحی و ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی سے قلبی وتحریکی تعلق ہونے کی وجہ سے اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا۔ مولانا منور حسین صاحب سے زیادہ تر ملاقاتیں اسی ادارہ میں ہوا کرتی تھیں، جہاں وہ محوِ مطالعہ وتحریر وتصنیف رہا کرتے تھے۔ ان دنوں وہ رفیق منزل کے ایڈیٹر، تحقیقات اسلامی علی گڑھ کے مضمون نگار تو مترجم، ایس ایس ہال نارتھ کی طلبہ میگزین کے ایڈیٹر تھے اور اس طرح وہ خوب مصروف رہا کرتے تھے۔

مولانا منور حسین فلاحی بظاہر زاہد خشک نظر آتے، مگر وہ خوش گفتار اور ظریف تھے۔ مجلس میں بھرپور حصہ لیتے اور شریک گفتگو رہتے، متعدد بار شعبۂ اردو، آرٹس فیکلٹی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ان کے ساتھ جانا ہوا اور بعد میں جب وہ لکچرر منتخب ہو گئے تب بھی ملاقات کے لیے گیا تو وہ اپنے احباب کی محفل میں ہنستے مسکراتے مختلف موضوعات پر علمی گفتگو کرتے اور اس طرح کی بات بھی کرتے کہ لوگ قہقہے لگاتے۔ اسلامک اسٹڈیز میں پروفیسر کبیر احمد جائسی مرحوم، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی اور دیگر اساتذہ کی محفل میں موجود ہوتے اور علمی گفتگو کے علاوہ ظرافت ومزاح کا ماحول بھی رہتا تھا۔

موصوف تبلیغ دین، امر بالمعروف والنھی عن المنکر، شہادت حق اور دعوت دین کے جذبۂ فراواں سے سرشار تھے اور اسی راہ پر گامزن تھے۔ حق و باطل کی کشمکش میں دنیا کو غالب کرنے اور غالب دیکھنے کا حوصلہ رکھتے تھے اور عملاً سرگرمِ عمل تھے۔ اُن کا یہ خواب ان شاء اللہ ضرور شرمندۂ تعبیر ہو کر رہے گا۔

میں ان سے کافی جونیئر تھا اور عمر میں بھی کم وبیش بارہ سال کا فرق تھا اس لیے بے تکلف تو نہیں ہو سکا، البتہ مراسم بڑھتے بڑھتے اس قدر ہو گئے تھے کہ ان کے گھر تک رسائی ہو گئی تھی اور ان کے دسترخوان سے استفادہ کا موقع ملا۔ وہ بھی کبھی کبھی میرے روم پر تشریف لاتے۔ ایک سے زائد بار ان کے بچے بیمار ہوئے اور

میڈیکل کالج میں ایڈمٹ رہے۔اس وقت رات میں جب وہ اپنی اہلیہ اور بچے کے ساتھ میڈیکل کالج میں قیام کرتے تو میں نے بھی کئی رات ان کے ساتھ گزاری۔ایک مرتبہ ان کے ایک چھوٹے بچے کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی، ایمرجنسی وارڈ میں تھا۔مسلسل کئی ہفتے میڈیکل کالج ہی میں رات گزارنی پڑی، بالآخر بچے کا انتقال ہوگیا۔مولانا بہت صابر وشاکر انسان تھے۔عسرت وتنگ دستی کا دور تھا۔کئی بچے بھی تھے مگر نہایت خاموشی اور اطمینان سے مشکل اوقات میں گزربسر کر رہے ہوتے۔

ان کا اصل میدان تحریر وتصنیف تھا چنانچہ اکثر وہ اسی کام میں مصروف رہتے، ہر وقت کوئی نہ کوئی مسودہ ان کے ہاتھ میں رہتا۔اپنے ہاسٹل کے کمرہ میں، ادارۂ تحقیق میں یا اپنے شعبۂ اردو کے چیمبر میں، ہمیشہ پڑھتے لکھتے رہتے تھے۔تحریر کے علاوہ تقریر اور درس قرآن کے میدان میں بھی نمایاں تھے۔ایس آئی او اور جماعت اسلامی کے ہفتہ وار اجتماع میں مختلف علمی وتربیتی موضوعات پر تقریر بھی کرتے اور درس قرآن مجید بھی پیش کرتے۔ان کے انداز گفتگو میں نرمی کے علاوہ سوز بھی ہوتا تھا۔وہ باعمل انسان تھے اس لیے ان کی تقریر میں لذت تقریر کے علاوہ تاثیر بھی ہوتی تھی، اجتماع کے علاوہ انفرادی طور پر بھی طلبہ اور وابستگان ایس آئی او کی تحریکی وتنظیمی تربیت پر توجہ دیتے تھے۔

اس زمانے میں میں نے قریب سے دیکھا کہ وہ طلبہ سے ہمدردی کرتے، ان کے درمیان رہتے۔بعض طلبہ کے مسائل ومشکلات کو حل کرنے میں اپنا وقت دیتے اور ان کا تعاون کرتے۔جماعت اور ایس آئی او کے بیت المال سے غریب وضرورت مند طلبہ کی مالی مدد فراہم کرتے۔اپنے علاقہ کے متعدد طلبہ کی مدد کی اور ان کی تعلیمی سہولیات کے لیے کوشش کی۔

منور حسین فلاحی کی طبیعت میں سنجیدگی اور وقار تھا۔مزاج سلجھا ہوا تھا گفتار ورفتار میں اعتدال تھا۔خرچ کرنے میں بھی سلیقہ واعتدال رہتا۔بردباری، نرمی وشفقت، استغنا وتوکل جیسی بہت ساری صفات سے آراستہ تھے۔اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو آزماتا ہے تاکہ کھرے کھوٹے کا امتیاز ہوسکے۔منور حسین صاحب بھی معاشی تنگ دستی، اپنی بیماری، بچوں کی بیماری جیسے مسائل سے گزرے، مگر صبر وشکر کے ساتھ آزمائش میں ثابت قدم رہے۔ان کی بچیاں بڑی تھیں اور بچے چھوٹے تھے جو جسمانی وذہنی کمزور بھی تھے، مگر مولانا اللہ کی مشیت پر راضی تھے اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔

میں تو ۱۹۹۸ء میں لکھنؤ آگیا تھا۔وہ لکچرر ہوچکے تھے اب امید تھی کہ خوش حالی کے دن آئیں گے اور ان

کواوران کے اہل خانہ کوسکون وراحت کے ایام میسر آئیں گے،مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں کچھ اور ہی فیصلہ درج ہو چکا تھا۔جلد ہی بلاوا آ گیا اور مولانا منور حسین صاحب اپنے مالک کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اپنے اور اس جہاں کے رب کے حضور جا پہنچے۔وہ تو رخصت ہو گئے مگر احباب کے دل میں ان کی یادیں بہت دنوں تک بسی رہیں گی۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ان کے درجات بلند کرے۔ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور کوتاہیوں سے عفوودرگزر کرے۔آمین۔

بعد از وفات مرتبہ مادر زمیں جو
درسینہ ہائے مردمِ عارف مزارما

●◘●

’’اسلامی طریق زندگی میں جس طرح نفسانیت اور نفاق مہلک امراض قرار دیے گئے ہیں، اسی طرح ہنگامہ پروری،تشدداور جذباتیت کو بھی بنظر تحسین نہیں دیکھا گیا ہے۔جوش وجذبہ سے کبھی کبھی بڑے مشکل کام آسان ہوجاتے ہیں اور کبھی بڑے مرحلے بھی طے ہوجایا کرتے ہیں۔مگر اگر اس جوش کے ساتھ ہوش وخرد کی لگام نہ ہوتو یہ سارے کارنامے غیر پائیدار اور بے سود ثابت ہوتے ہیں۔ ہر انقلابی تحریک کی خمیر میں جہاں نوجوانوں اور جوانوں کا جوش اور کارکنوں کا اخلاص کارفرما ہوتا ہے، وہیں اس کی قیادت کی ہوش مندی کا بھی اہم رول ہوتا ہے۔ دنیا کے عام انقلابات اور ررسول اکرمؐ کے ذریعے برپا ہونے والے انقلاب میں ایک بین فرق یہ ہے کہ آپ جن اصولوں کے نفاذ کے علم بردار تھے، کارکنان تحریک کوان پر نہ صرف یہ کہ پورا ایمان تھا بلکہ عملی زندگی اس یقین کی شاہد تھی۔یہی وجہ ہے کہ قائد تحریک کی بصیرت وقیادت پر انہیں مکمل اعتبار واعتماد تھا۔آپ کی تحریک کے علم برداروں میں حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ جیسے جیالوں اور جاں بازوں کے جوش وجذبے کا کون منکر ہوسکتا ہے؟ لیکن کیا یہ جذبے رسول اکرم ﷺ کی ہوش مندانہ قیادت کے بغیر وہ نتائج پیش کر سکتے تھے،جن کا مشاہدہ تاریخ انسانی نے کیا ہے۔‘‘

[**ڈاکٹر منور حسین فلاحی**، اداریہ ماہ نامہ رفیق منزل، جون ۱۹۸۸ء]

ڈاکٹر منور حسین فلاحی کے بعض تراجم وتبصرے

محمد کمال اختر قاسمی

تبصرہ نگاری اور تراجم کا مفید سلسلہ عرصے سے جاری ہے۔ ان گنت اہل علم نے ان فنون کی افادیت کو پروان چڑھایا۔ ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر منور حسین فلاحیؒ کا ہے، جنہوں نے بہت سے قیمتی مقالات کے ترجمے کئے اور بہت سی مفید تصانیف پر تبصرے کیے۔ مجلّہ تحقیقات اسلامی سے مولانا منور حسین کا گہرا تعلق رہا ہے۔ آپ کے ترجمے تبصرے اور شخصیات کا تعارف پر مشتمل متعدد مضامین ومقالات شائع ہوئے ہیں۔ احسن البیان فی علوم القران (حسن الدین حمد) جولائی تا ستمبر 1992ء) ایرانی تصوف (کبیر احمد جائسی) جنوری تا مارچ 1995ء، تحدیث نعمت (مولانا محمد منظور نعمانی) اکتوبر تا دسمبر 1997ء، راستے کی تلاش (عتیق الرحمن سنبھلی) جولائی تا ستمبر 1994ء، زکوٰۃ کے مصارف (عتیق قاسمی) اپریل تا جون 1993ء، عکس رموز بے خودی (عصمت جاوید) اکتوبر تا دسمبر 1998ء، عہد نبوی کا نظام حکومت (محمد یٰسین مظہر صدیقی) اپریل تا جون 1996ء، قرانی مقالات (ادارہ علوم القران علی گڑھ) جنوری تا مارچ 1993ء، ماہنامہ الفرقان لکھنو (اشاعت خاص بیاد بانی الفرقان مولانا محمد منظور نعمانی) اپریل تا جون 1999ء، مجھے ہے حکم اذاں (عتیق الرحمن سنبھلی) اکتوبر تا دسمبر 1995، مولانا مودودی کے معاشی تصورات (محمد اکرم خاں) جنوری تا مارچ ۱۹۹۲ء۔ Education in early IslamicPeriod (ظفر عالم) اپریل تا جون ۱۹۹۲ء۔ یہ سب بیش قیمت کتابوں پر کیے گئے آپ کے اہم تبصرے ہیں۔ آپ نے متعدد علمی شخصیات کا تعارف، ان کی خدمات اور ان کے افکار کا جائزہ پر مشتمل متعدد مقالے تحریر کیے، ان میں بعض اہم مقالات تحقیقات اسلامی میں شائع ہوئے، جیسے شیو برت لال کے بعض افکار کا جائزہ، :تحقیقات اسلامی، اپریل تا جون ۱۹۹۲ء۔

ترجمہ نگاری میں بھی آپ کو درک حاصل تھا۔ عربی اور انگریزی کے متعدد مقالوں کو اردو میں منتقل کیا، ان میں 'اعضا کی پیوند کاری۔ ایک نقطۂ نظر'، یہ مقالہ انگریزی سے ترجمہ کیا، جو تحقیقات اسلامی جنوری تا مارچ

۱۹۹۵ء میں شائع ہوا ہے۔امام مالک بن انسؒ اور ان کی تصنیف الموطا۔یہ عربی مقالہ کا اردو ترجمہ ہے، تحقیقات اسلامی، اپریل تا جون ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا ہے۔ان کے بعض کا مختصر جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

اعضا کی پیوندکاری۔ایک نقطۂ نظر

یہ انگریزی سے ترجمہ ہے۔مقالہ کی ابتدا میں فقہ اسلامی کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فاضل مترجم نگار نے بتایا کہ اسلامی فقہ کا مقصد انسانیت کا فروغ ہے،قران وسنت میں کسی مسئلہ کا واضح حل موجود نہ ہوتو فقہاء کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ شرعی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلہ میں راہ نمائی فرمائیں۔مقالہ میں اس کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی گئی ہے کہ کسی بھی مسئلہ کا حل پیش کرتے وقت اس بات کا مکمل لحاظ ضروری ہے کہ اسلام ہر زمانہ کے انسانی تقاضوں کی تکمیل کی صلاحیت رکھتا ہے،اس دعویٰ کے اثبات کے لیے ضروری اصولوں کی نشان دہی کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ زندگی کے کسی بھی پہلو سے متعلق مسئلہ درپیش ہو اور اس میں نئے حالات اور تقاضوں کی روشنی میں غوروفکر کی ضرورت ہو تو اس پر توجہ کرنا اور اس پہلو سے غوروخوض ضروری ہے۔طبی دنیا میں جو ترقیاں ہوئی ہیں اور دن بدن ان میں اضافہ ہوتا جارہا ہے ان میں غوروخوض کرنا اور متعلقہ مسائل کا حل پیش کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے، چنانچہ مقالہ میں طبی دنیا میں ہونے والی ترقیوں میں اسلامی نقطۂ نظر سے غوروفکر کرنے کے متعدد پہلوؤں کا تعارف کرایا گیا ہے: بقاء نفس، لاش کی چیڑ پھاڑ، اعضاء کی پیوندکاری، زندہ شخص کے عضو کی پیوندکاری، دفع مضرت کی جلب منفعت پر فوقیت،متصام مفادات، ضرورت مثل مجبوری، ایثار کا پہلو، تعاون کا پہلو۔مقالہ نگار کے مطابق طبی دنیا کی ترقیوں کے یہ سب اہم پہلو ہیں جن کو نئے مسئلے کے حل کے لیے پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔آخر میں اعضا کی پیوندکاری کے حوالہ سے سات اہم علمی اعتراضات اور ان کے جوابات ذکر کیے گئے ہیں۔مثلا اس عمل سے مردے کو تکلیف ہوتی ہے، یہ خود کو ہلاک کرنے کا عمل ہے، ان اعضا سے آخرت میں بھی کام لیا جائے گا، اعضاء اللہ کی امانت ہیں، اعضا کے ہبہ کرنے کی کوئی قطعی دلیل موجود نہیں ہے، اعضا کا ہدیہ ایک بدعت ہے، عضو کا عطیہ قبول کرنے والا عطیہ دینے والے شخص کے ساتھ جنت میں جائے یہ کوئی ضری نہیں ہے۔اس طرح کے اعتراضات کا تفصیل کے ساتھ علمی جواب دیا گیا ہے۔

امام مالک بن انسؒ اور ان کی تصنیف الموطا

یہ ڈاکٹر محمد کامل حسین کا عربی مقالہ ہے جس کو موصوف نے اردو میں منتقل کر کے تحقیقات اسلامی میں

شائع کرایا ہے۔ مقالہ کی ابتدا میں انسانی تاریخ کے حوالہ سے بتایا گیا کہ عظیم شخصیات کے احوال وکوائف کو محفوظ رکھنے کا رواج ہمیشہ سے رہا ہے البتہ مسلمانوں نے اپنی علمی شخصیات کی سیرت وسوانح اور کارناموں کو محفوظ رکھنے کا بطور خاص اہتمام کیا ہے۔ امام مالکؒ کی فقہ اوران کا علمی ذخیرہ موطا کے متعارف ہونے کی وجہ سے ان کے سوانح اور کارناموں کا تعارف اورتشریح وتوضیح کی طرف مسلمان اہل علم کا انہماک زیادہ رہا۔ زیر مطالعہ مقالہ میں امام مالک بن انس رحمہ اللہ کی شخصیت، اساتذہ وشیوخ اورآپ کی سیاسی وثقافتی سرگرمیوں کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے، آپ کے علمی مقام ومرتبہ کے ذکر کے ساتھ آپ کی گراں قدر تصنیف موطا کے علمی وفنی اعزاز کا تذکرہ کیا گیا ہے، موطا حدیث کے اولین مجموعوں میں سب سے زیادہ مشہور ومتداول ہے، عہد نبوی میں احادیث لکھنے کی عام اجازت نہیں تھی، خلیفہ ثانی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں احادیث کی تدوین کا ارادہ کیا اورصحابہ کرام کی طرف سے بھی اس فیصلہ کی تائید کی گئی، لیکن قرآن اورحدیث میں باہمی التباس کے خوف سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس ارادہ کو ترک کردیا تھا، اگرچہ اس دور میں انفرادی طور پر بعض صحابہ نے احادیث جمع کی تھی، لیکن احادیث کی تدوین وتبویب کا اصل سلسلہ تابعین کے آخری عہد میں شروع ہوا۔ دوسری صدی میں طبقہ ثالثہ کے علما نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اوراحکام دین کی تدوین کی، امام مالکؒ نے بھی الموطا تصنیف کی اوراس میں اہل حجاز کی قوی احادیث، اقوال صحابہ اورتابعین و تبع تابعین کے فتاویٰ بھی درج کئے۔ زیر نظر مقالہ میں موطا کی تصنیف، روایات کی قبولیت میں حد درجہ احتیاط، متن وسند کی باریکی سے تحقیق وتنقید میں موطا کے خصوصی مقام کا تعارف کراتے ہوئے اس کی متنوع خصوصیات وامتیازات اوراس کی تصنیف کا پس منظر کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔

اسپرٹ آف اسلام کا تنقیدی مطالعہ

'اسپرٹ آف اسلام' سید امیر علی کی انگریزی تصنیف ہے، جس پر ڈاکٹر مقصود احمد نے تنقید کی ہے۔ یہ تنقید انگریزی میں تھی اس کا ترجمہ ڈاکٹر منور حسین فلاحی نے کیا ہے۔ سید امیر علی کی یہ کتاب مستشرقین کی طرف سے اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا مدلل اور مسکت جواب ہے، اس میں عقلی وفکری سطح پر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی حقانیت وصداقت اورافضلیت کو ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخی طور پر ان الزامات و اعتراضات کی تردید کی گئی ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ اورآپ کی شان اقدس پر مستشرقین کی طرف سے لگائے گئے۔ مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ سید امیر علی کی یہ تصنیف مستشرقین اور انگریزی طبقوں کو اللہ

کے رسول ﷺ کی حقیقی زندگی اور آپ کی تعلیمات سے واقف کرانے کی غیر معمولی کوشش ہے۔کتاب کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ رسول اکرم ﷺ کی سیرت اور حکومت پر مشتمل ہے،حکومت کے بیان کے ضمن میں مسئلہ امامت پر بھی بحث کی گئی ہے،کتاب کے دوسرے حصہ میں اسلام کی تعلیمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعثت نبوی کے عہد کی سماجی صورت حال، عالم گیر معلم ومربی کی ضرورت اور دیگر تاریخی شخصیات کی تحقیق پر مشتمل ہے۔

تبصرہ نگار نے کتاب کے مکمل خاکے کا تعارف کراتے ہوئے کتاب کی حسن ترتیب وتبویب کا جامعیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے جس سے کتاب کی بنیادی تفہیم اور اس کے مباحث کا بآسانی استحضار ہوجاتا ہے۔تبصرہ نگار نے مصنف کی بعض فکری غلطیوں کی بھی گرفت کی ہے جو کہ کسی تبصرہ کا نہایت اہم حصہ ہوتا ہے، مثلاً کتاب کے دوسرے باب عقبہ اولیٰ وثانیہ اور ہجرت مدینہ کے ذیل میں مصنف نے واقعہ معراج کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے خواب میں پیش آنے والا واقعہ قرار دیا، مصنف کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے ڈاکٹر منور حسین لکھتے ہیں:

> ''مصنف کا خیال ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے، مصنف کا یہ خیال ناقابل اعتبار معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ یہ واقعہ بیداری کی حالت میں پیش آیا ہے جس پر سورۂ بنی اسرائیل کا ابتدائی لفظ''عبد'' دلیل ہے، اگر یہ واقعہ خواب میں پیش آیا ہوتا یا اس وقت اسے ایسا سمجھا جاتا تو مکہ کے کافروں کے انکار وتکذیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ خواب میں پیغمبر خدا کا معاملہ تو جدا ہے، ایک عام پرہیز گار انسان کو بھی اس طرح کی چیزیں نظر آجاتی ہیں۔''

اسی طرح تبصرہ میں جا بجا یہ بھی نظر آتا ہے کہ مصنف کی رائے مناسب ہے لیکن کسی مضبوط دلیل کے ذریعہ اسے مدلل نہیں کیا گیا ہے تو اس کی دوسری دلیل کی طرف نشان دہی کی گئی ہے۔

ڈاکٹر منور حسین فلاحی غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے، آپ کے متنوع علمی کارنامے ہیں، اس مضمون میں ان کے تحقیقات اسلامی میں شائع شدہ تراجم کا مختصر تعارف پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور آخرت میں بلند مقام ومرتبہ نصیب کرے۔ (آمین)

ڈاکٹر منور حسین اوران کے اداریے

عبید اقبال عاصم

۱۹۹۰ء میں علی گڑھ آنے کے بعد اولین ساعتوں میں جن حضرات نے اپنے علم وعمل، گفتار وکردار سے بہت زیادہ متاثر کیا ان میں ایک نام ڈاکٹر منور حسین کا ہے۔ جو اُن دنوں 'ڈاکٹر' نہیں بلکہ 'مولانا' کے سابقے سے پہچانے جاتے تھے۔ ہر ہفتہ ایک مینار مسجد سرسید نگر میں درس قرآن ہوتا جس میں وہ شریک ہوتے اور اکثر وبیشتر درس کی سعادت اُنھیں کے حصے میں آتی۔ دُبلے پتلے، درمیانہ قد، مہین آواز، منحنی وجود لیکن جب وہ درس دیتے تو علم کی گہرائیوں کا پتہ چلتا۔

حالاں کہ مرحوم سے بس درس تک کی شناسائی تھی لیکن اُن کے اخلاق نے مجھ جیسے ہیچ مداں کو ان کا گرویدہ کردیا۔ وہ جب بھی ملتے اس انداز سے ملتے جو 'شناسائی' کو اپنائیت سے بدلنے کے لیے کافی تھا۔ اسے اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ جب بھی ملاقات ہوئی سرِ راہ ہی ہوئی۔ ان دنوں اتنا ضرور معلوم تھا کہ موصوف اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن (ایس آئی او) کے حلقہ سکریٹری ورکن جماعت اسلامی ہند ہیں اور ایس آئی او کے ترجمان 'رفیق منزل' کے مدیر ہیں۔ جو اکثر وبیشتر راقم کے مطالعہ میں رہتا۔ تقریر وتذکیر کے ساتھ ساتھ مرحوم کی طرف ملتفت ہونے کا ایک سبب رفیقِ منزل کی تحریریں بھی تھیں چوں کہ اس سے پیشتر اُن کے درس قرآن کا تاثر بھی راقم قبول کیے ہوئے تھا۔

کچھ ہی عرصہ بعد معلوم ہوا کہ ڈاکٹر منور حسین صاحب اے.ایم.یو. کے شعبہ اردو میں لکچرر ہوگئے ہیں۔ اس سے اُن کی دوسری مصروفیات یقینی طور پر متاثر ہوئیں اس باعث مرحوم سے رابطہ برائے نام ہی رہا لیکن ملنساری کا جذبہ حسب سابق ہی رہا۔ جب بھی کہیں ملتے نہایت تپاک سے ملتے۔ کوئی علمی اشکال درپیش ہوتا اور ڈاکٹر صاحب مرحوم سے اُس پر کوئی گفتگو ہوجاتی تو وہ اشکال ضرور رفع ہوجاتا۔ اعتراضات کا جواب خندہ پیشانی اور نہایت نرم لب ولہجہ میں دینا مرحوم کا ایسا وصف تھا جو طبقہ علماء میں شاذ ونادر ہی پایا جاتا ہے۔

مرحوم اپنی عمر کی اکتالیس منزلیں طے کرنے کے بعد بیالیسویں کے پائیدان پر ہی تھے کہ ۱۸ر ستمبر ۲۰۰۰ء کو ایک مختصر سی بیماری کے بعد اُس رب کائنات کے حضور حاضر ہو گئے جس کے پیغام کو عوام وخواص تک پہنچانے کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کے کم وبیش پچیس سالہ شب وروز وقف کر دیے تھے۔

موت کے سامنے کوئی چارہ ہی نہیں یہ زندگی کی اصل حقیقت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ''بے اعتبار زندگی کا اعتباری وحقیقی نام موت ہے'' تو یہ بے جا نہیں ہوگا یہ بات ضرور ہے کہ 'نفس مطمئنہ' کے ساتھ زندگی گزارنے والے 'خالق حقیقی' کے سامنے جب 'لوٹتے' ہیں تو اُن کا حال 'راضی مرضیۃ' ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُن کا رب ان کا شمار اپنے (اطاعت گزار) بندوں میں کرتے ہوئے 'دخولِ جنت' کا پروانہ ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ ہمیں اللہ رب العزت، رحمان ورحیم کی شانِ کریمانہ سے یہ امید ضرور ہے کہ ان شاء اللہ اُس نے ڈاکٹر منور حسین صاحب مرحوم کے ساتھ یہی سلوک کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اُنھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام اور انھیں دائمی انعامات واکرامات سے نوازے۔ آمین

ڈاکٹر منور حسین مرحوم کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے بیس سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ مرحوم کے تعلق سے جس کام کو بیس سال قبل ہونا چاہیے تھا وہ اب برادرِ محترم ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی صاحب کی سربراہی میں اس وقت انجام دیا جا رہا ہے جب کہ مرحوم کی یادیں اُن کے عزیز ترین لوگوں کے دلوں سے بھی محو ہو چکی ہوں گی لیکن 'صبح کا بھولا' اگر 'شام' کو منزلِ مقصود پر آ جائے تو اُسے 'بھولا' نہیں کہا جا سکتا۔ یہ امر ہی ہم جیسے مبتدئین کے لیے حوصلہ افزا ہے کہ مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے اُن کی حیات وخدمات سے نئی نسل کو روشناس کرایا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور ان مخلصانہ جدوجہد سے سبھی کو مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر منور حسین مرحوم نے طالب علمانہ زمانے میں ہی اپنی فکر کے زاویے درست کر لیے تھے اور وہ ایسی تحریکوں سی وابستہ ہو گئے تھے جن کا مقصد حیات 'غم روزی' نہیں بلکہ 'غم دوراں' تھا۔ 'اعلائے کلمۃ اللہ' کی خاطر 'کلمۂ حق' کا اظہار واعلان اور اُسے برپا کرنے کی کوشش میں اگر انھیں جان کا نذرانہ بھی پیش کرنا پڑے تو وہ اسے بھی ہنسی خوشی قبول کر لیں اور اگر 'سلطان جابر' کے سامنے اس کلمہ کی بازگشت کا تقاضا ہو تو اُس میں بھی انھیں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہو۔ کم وبیش پچیس سالہ تحریکی سفر انھوں نے انتہائی خاموشی کے ساتھ طے کیا۔ اس درمیان انھوں نے جو تحریریں آنے والی نسلوں کو بطور سوغات دیں وہ ملت کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

مرحوم نے 'مولوی چراغ علی کی علمی خدمات' پر ۱۹۸۸ء میں اپنا ایم فل کا مقالہ تیار کیا جسے بعد میں خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے ۱۹۹۷ء میں اپنی مطبوعات میں شامل کیا۔ اس میں انھوں نے انیسویں صدی کے نصف آخر کے متبحر عالم دین مولوی چراغ علی (پیدائش ۱۸۴۴ء- وفات ۱۱رجون ۱۸۹۵ء) کی حیات وخدمات کو اردو دنیا کے سامنے ایک نئی تحقیق کے ساتھ پیش کیا۔

'اردو میں علمی نثر (۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک)' ان کی پی ایچ ڈی مقالے کا عنوان ہے، جسے انھوں نے ۱۹۹۲ء میں اے ایم یو علی گڑھ کے شعبہ اردو میں پیش کر کے 'ڈاکٹریٹ' کی ڈگری حاصل کی۔ دونوں کتابیں خالص علمی نوعیت کی ہیں، جو مرحوم کے علمی وتحقیقی مزاج کی شہادت فراہم کرتی ہیں۔ ان سے قطع نظر راقم مرحوم کے اُن اداریوں کو ہی اپنی اس تحریر کا محور بنانا چاہتا ہے جو گاہے بہ گاہے 'رفیقِ منزل' کے ذریعہ مرحوم کے جذبہ اتحاد ملت، ایثار وقربانی، منکسر المزاجی وکسر نفسی جیسے اوصاف کی شہادت دیتے ہیں۔

منور صاحب غالباً دسمبر ۱۹۸۷ء میں اس تحریکی رسالے کی ادارت کے لیے منتخب ہوئے جو اتفاق سے ربیع الاول ۱۴۰۸ھ سے مطابقت رکھتا تھا۔

اس اداریے میں مرحوم نے اس مبارک مہینے کی مناسبت سے رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ والا صفات پر مختصر ترین جامع گفتگو کرتے ہوئے اپنی کسر نفسی کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ مرحوم کی منکسر المزاجی کے ساتھ اُن کے بلند عزائم اور مستقبل میں نئی نسل کے لیے کچھ کرنے کی دُھن کے جذبے کو بھی ابھارتا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''ہم اس موقع پر اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ رفیق کو اب تک جس قدر لائق وفائق مدیر کی خدمات میسر تھیں وہ لیاقت وصلاحیت موجودہ مدیر کے پاس موجود نہیں۔ تاہم اس کی حتی المقدور کوشش ہوگی کہ رفیق کا سابقہ معیار برقرار رکھا جائے''۔ (اداریہ رفیق منزل، نئی دہلی، دسمبر ۱۹۸۷ء)

آگے فرماتے ہیں:

> ''ہم نے جہاں اپنے تمام بہی خواہوں سے ترجمان کو بہتر بنانے کے سلسلے میں مشورے طلب کیے ہیں وہیں ہم ان بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جنھوں نے اولین مرحلے میں قولی یا عملی طور پر ہمارا تعاون فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس کی بہترین جزا دے اور ہمیں اس کی توفیق دے کہ ہم اپنا فرض منصبی کما حقہ ادا کر سکیں''۔ (ایضاً)

بیسویں صدی عیسوی کے آخری دہے اور اس سے چند سال قبل ملک میں فرقہ پرست فسطائی عناصر نے 'مسجد و مندر' کو قضیہ بنا کر نفرت کا جو ماحول تیار کیا اس کے نتائج وعواقب دیر میں نظر آئے لیکن دور بیں دانشوروں کی نظریں حالات کی سنگینی ونزاکت کو اسی وقت محسوس کر رہی تھیں۔ منور حسین صاحب مرحوم حالات کا تجزیہ کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ جن دنوں حالات کو گرمایا جا رہا تھا اُس وقت انھوں نے اپنی تشویش کا اظہار اشارتاً کنایتاً ہی نہیں بلکہ صراحتاً بھی کر دیا تھا۔ اس ضمن میں رفیقِ منزل کے جنوری ۱۹۸۸ء کے اداریہ کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''ملک کی موجودہ صورت حال جیسی کچھ ہے وہ عام لوگوں کے سامنے ہے۔ بے شمار قسم کی خرابیوں میں فرقہ وارانہ منافرت کا بڑھتا ہوا رجحان خاص طور پر بڑی سرعت سے تنازعات کا اٹھ کھڑا ہونا اور لاتعداد جانی و مالی اتلاف کا نتیجہ گو ایک معروف سی چیز بن گئی تھی لیکن اب تو باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے والے معاملات بھی آپسی منافرت کا ایک نیا اور موثر ذریعہ بنتے جا رہے ہیں۔ یہ وہ خطرناک رجحان ہے جس کے سد باب کی اگر سنجیدہ اور فوری کوشش نہیں ہوئی تو اس کے تباہ کن نتائج کا تصور بھی کرنا مشکل ہے۔''

ان حالات سے گھبرانے کی بجائے ڈاکٹر صاحب مرحوم اس کو مثبت رخ دینے کا مشورہ دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''حالات کے خراب ہونے اور کر دینے میں اس بات کا بھی خاصا دخل رہا ہے کہ یہ پیامِ امن وعافیت (اسلامی تعلیمات) پردوں میں چھپا رہا ہے اور مذہب کے نام پر لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد واغراض کے حصول کی مذموم کوششیں کی ہیں۔ ضرورت ہے کہ باشندگان ملک اس خدائی پیغام کی صحیح شکل دیکھ سکیں۔ اس کے اوپر شکوک وشبہات، اندیشوں اور غلط فہمیوں کے جو پردے پڑے ہوئے ہیں انھیں ہٹانا اور آب وہوا کی طرح اس سے استفادہ کو انسانی برادری کے لیے آسان بنانا ہماری اولین ذمہ داری ہے''۔ (ایضاً)

کاش کہ ڈاکٹر منور حسین صاحب مرحوم کے اس مفید مشورے پر وقت پر توجہ دی جاتی تو آج حالات کا دھارا اپنے منافرتی پہاڑ میں پیار محبت کے متوالے انسانوں کو اس طرح نہ بہالے جاتا۔

اسلام کی بنیادی تعلیمات پر زندگی کا ہر ہر پل نچھاور کرنے والے ڈاکٹر منور صاحب مرحوم کی تحریروں کا محور اس کے ارکان خمسہ کی خوبیوں وفضائل کے ارد گرد تو گھومتا ہی رہا۔ انھوں نے کوئی ایسا موقع کبھی ہاتھ سے

جانے نہیں دیا جب ان کے فضائل ومحاسن بیان کرنے کا وقت ہوا اور انھوں نے ان کی طرف 'اشہب قلم' کا رُخ نہ موڑا ہو، رمضان المبارک کا مہینہ ہو یا حج کے ایام، قرآن مجید کی آیات ہوں یا زکوٰۃ کے تذکرے، اپنی تحریر کا عنوان بنا کر انھیں خوبصورت عام فہم انداز میں پیش کرنا، مرحوم کا طرۂ امتیاز تھا۔ صحیح بات یہ ہے کہ اگر صرف ان مذہبی تحریروں کو یکجا کر دیا جائے تو وہ ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کر جائے۔ ان کا اسلوب نگارش دل کش ہوتا اور وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی بات کہہ جاتے۔

ڈاکٹر منور حسین مرحوم کے ان اداریوں پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاست کا شعور وفہم بھی پوری طرح رکھتے تھے۔ اس لیے جب کبھی کوئی ایسا واقعہ رونما ہوتا جس کے اثرات دور تک پہنچتے دکھائی دیتے تو وہ ان کے عواقب ونتائج سے قارئین کو آگاہ کرنا اپنا فریضہ تصور کرتے۔

اگست ۱۹۸۸ء میں اس وقت کے پڑوسی ملک کے سربراہ جنرل ضیاء الحق کی پرتجسس موت (جسے حادثہ کی شکل دی گئی تھی) کا واقعہ پیش آیا تو ڈاکٹر صاحب مرحوم اس سے مضطرب ہوئے بنا نہیں رہے۔ انھوں نے اس پر جہاں افسوس کا اظہار کیا وہیں اس حادثہ کو ایسی بین الاقوامی سازش قرار دیا جس کے پس پشت وہ بڑی طاقتیں تھیں جن کے مفادات پر اس سربراہ کی وجہ سے کاری ضرب پڑ رہی تھی۔ فرماتے ہیں:

> ''یہ بات بالکل واضح ہے کہ جہاز کے اس افسوس ناک حادثے کے پس پشت ایک منظّم تخریبی کارروائی تھی جس میں ان طاقتوں کے ملوث ہونے کا بڑا امکان ہے جن کے مفادات پر ان کی پالیسیوں کے ذریعہ ضرب پڑ رہی تھی''۔

قارئین کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ ۱۹۸۹ء کے اوائل میں ایک ملعون نام نہاد بدبخت یہودی ایجنٹ نے اپنے مسلم نام کی آڑ لے کر قرآنی آیات کے تعلق سے ہرزہ سرائی کی تھی۔ اس ملعون نے نہ صرف یہ کہ قرآن مجید بلکہ اس کے واسطے سے رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کو بھی سب وشتم کا نشانہ بنایا۔ عالمی پیمانے پر اس منحوس کی بدبختیوں کا علمی جواب بھی دیا گیا اور مسلمانوں کی ہونے والی دل آزاری پر اس کے خلاف احتجاج بھی درج کرایا گیا لیکن مغربی ذرائع ابلاغ اور اُن کے پس پشت اسلام دشمن حکومتوں نے اس 'بدبخت' کو جس طرح 'پریس کی آزادی' کے عنوان سے تحفظ وحمایت فراہم کی وہ مسلمانوں کے لیے سوہانِ روح سے کم نہ تھی۔ ہندوستان میں بھی کچھ مسلم دشمن صحافیوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے 'دی سیٹنک ورسیز' کو ایک علمی کاوش قرار دیا اور اس کے مصنف کے خلاف کیے جانے والے ہندوستانی مسلمانوں کی آئینی ودستوری احتجاج کی

مخالفت کی۔ اس موقع پر مولانا مرحوم نے اس کتاب کی مخالفت کے جواب میں خود ساختہ نام نہاد ہندوستانی دانشوروں کو مثبت جواب دیتے ہوئے طویل اداریہ قلم بند فرمایا جس میں انھوں نے اس بدبخت مصنف سے اظہار ہمدردی کرنے والوں کو منھ توڑ جواب دینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا:

''جب یہ بات درست ہے کہ مواد کا حقیقت سے کوئی رشتہ نہیں اور یہ صرف مصنف کے دماغ کی پیداوار ہے تو خود کتاب کے نام کی مناسبت سے مصنف کو شیطان کا نام دینا اور کتاب کے موضوع کی نوعیت کی مناسبت سے اس کی تخلیقی صلاحیت کو ذہنی خباثت قرار دینا بہت موزوں اور مناسب ہے''۔ (اداریہ دسمبر ۱۹۸۸ء)

علاوہ ازیں مارچ ۱۹۸۹ء کے اداریے میں بھی اس بے ہودہ کتاب اور اس کے قابل اعتراض حصوں کو اجمالاً ذکر کر کے اس ملعون کی شیطانیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

منور حسین صاحب مرحوم کی مختصر تحریروں میں بھی ہمیں قرآن وحدیث کا وہ پیغام مل جاتا ہے جو اُن کے دل ودماغ میں سمایا ہوا تھا۔ یوں تو اُن کے بیشتر اداریے اسلامی تعلیمات وعبادات سے بھی معنون ہیں لیکن سیاست وملت اور سفر وحضر سے متعلق تحریروں میں بھی یہی ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

''جنوبی ہند کا ایک سفر'' اُن کے اگست ستمبر ۱۹۸۹ء کے اداریے کا عنوان ہے جو دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ مذکورہ دونوں اداریوں میں مرحوم نے اس تحریکی سفر کو تعلیمی وتذکیری سفر بنا دیا ہے۔ جنوبی ریاستوں بالخصوص کیرالا میں مسلم نوجوانوں کے اسلامی ذوق کو تحسین بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے آپ نے وہاں کے تعلیمی اداروں کے نظاموں پر بطور خاص پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''یہ تعلیمی ادارے جہاں نئی نسل کی دینی تعلیم وتربیت کا ایک قابل اطمینان وسیلہ ہیں وہیں تحریک اسلامی کے لیے کارکنان کی فراہمی کا مستقل اور پائدار ذریعہ بھی۔ اس طرح اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے طلبہ کے لیے بورڈنگ ہاؤس کا نظم ان بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے ایک بہت ہی موثر طریقہ ہے۔ اس طرح ان اداروں کے ذریعہ دینی علم وفکر کے بقا کا ایک عمدہ نظم کر لیا گیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہاں کی طلبہ تنظیم میں نصف سے زائد ایسے نوجوان ہیں جو قرآن مجید کو اس کی اصل زبان میں سمجھ سکتے ہیں''۔ (اگست ۱۹۸۹ء)

منور حسین مرحوم کو جس چیز نے بہت زیادہ تشویش واضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا وہ ان کا وہ احساس تھا جس کی بنا پر وہ موجودہ دور میں مادہ پرستی کو فروغ پاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ وہ نئی نسل کو اس شیطانی حصار سے

نکالنے کا مشورہ بہت خوب صورت انداز سے دیتے تھے۔تذکیر بالقرآن میں بھی وہ ایسی ہی آیات کا انتخاب فرماتے جن سے دنیا اور جہان کی ظاہری چمک دمک والی چیزوں کے فنا ہونے اور اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذاتِ والاصفات کی بقاودوام کے نتائج سامنے آسکیں۔

تنظیم(ایس آئی او) کے کارکنان کو تنظیمی پیغام دیتے ہوئے وہ یہ تحریر کرنے سے نہیں چوکتے:

''آج کے دور میں مادیت اور کیریئر پرستی ایک وبا کی شکل اختیار کرچکی ہے۔انسانوں کی تمام ترترجیحات کا مرکز وہی ہیں۔گویا اللہ کی جگہ نعوذ باللہ اس نے لے لی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ ہم بھی غیرشعوری طور پر اس بات کی اطاعت کرنے لگے ہیں۔ہمارا شعار یہ ہونا چاہیے کہ اس دام سے دوسروں کو نکالنے کی فکر کریں اور ہم اپنی ساری توجہات کا مرکز اللہ ہی کو بنائیں''۔

(اداریہ اکتوبر ۱۹۸۹ء)

حالات سے کسی بھی طرح نہ گھبرانا اور مشکل ترین وقت میں بھی اللہ کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانا اولوالعزم بندگانِ خدا کی خاص شناخت ہے۔موجودہ حالات میں منور حسین صاحب مرحوم کا انیس برس قبل (دسمبر ۱۹۸۹ء) کے اداریے کا یہ اقتباس موجودہ حالات میں انتہائی افادیت واہمیت کا حامل ہے۔

''حالات انتہائی صبرآزما اور حوصلہ شکن ضرور ہیں بلکہ کبھی کبھی تو مستقبل بھی غیر یقینی نظر آتا ہے،مگر یہی وہ حالات ہیں جن میں صبر اور جرأت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔اور یہ صفات صحیح معنوں میں 'عزم الأمور' بن جاتے ہیں۔ہمارے اندر اعتماد اور یقین ہونا چاہیے کہ ہمیں اس ملک کو کچھ دینا ہے جواب تک ہم نہیں دے سکے ہیں۔ایک خدا کی بندگی کی دعوت ملت کی نئی نسل سے ملت کی بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں۔موجودہ حالات کا جواب بھی اس نئی نسل کے پاس ہے۔بشرطیکہ وہ اپنی حیثیت اور اپنی ذمہ داری کو سمجھ لے''۔

آج منور حسین صاحب مرحوم ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کے تحریروں کا قیمتی سرمایہ ہمارے پاس محفوظ ہے جن کی روشنی میں زندگی کے ناہموار راستوں کو بھی ہموار کیا جاسکتا ہے اور اپنی بے سمتی کو بھی ایک مثبت سمت دی جاسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ملت کو مرحوم کی تحریروں سے بھرپور استفادہ اور اُن کی قابل عمل مشوروں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔اور ملت کو اس بھنور سے نکال دے جس میں وہ گزشتہ کئی صدیوں سے پھنسی ہوئی ہے۔

ماہنامہ رفیق منزل کے پہلے مدیر منور حسین فلاحی

(پختہ فکر، منفرد اسلوب، متنوع مضامین)

ابوالاعلیٰ سید سبحانی

مولانا منور حسین فلاحی مرحوم ماہنامہ رفیق منزل نئی دہلی کے پہلے مدیر تھے، آپ کا زمانہ ادارت ماہ دسمبر ۱۹۸۷ء سے شروع ہوکر ماہ دسمبر ۱۹۹۰ء پر ختم ہوتا ہے، رفیق کی ادارت کے مختلف ادوار رہے ہیں اور ہر دور اپنی کچھ انفرادیت رکھتا ہے، لیکن رفیق کو ایک رخ اور ایک جہت دینے کا کام منور حسین صاحب نے انجام دیا تھا، آپ کے اداریوں میں علمی و تحقیقی رنگ، فکری و نظریاتی پختگی، عصری آگہی، اسلوب کی پختگی، اور مضامین کا بہترین تنوع نظر آتا ہے۔ طلبہ اور نوجوانوں کو مخاطب بنانے کا اولین تقاضا تھا کہ ان کی ضرورتوں، ان کے مزاج اور ان کے رجحانات کو ایڈریس کیا جائے، اور ان کی صلاحیتوں اور ان کی ذہانتوں کو صحیح رخ پر لگایا جائے، چنانچہ رفیق کے اداریے اور مضامین دیگر مجلّات اور رسالوں کے مقابلے میں اس پہلو سے یک گونہ انفرادیت رکھتے ہیں۔ آپ کی ادارت میں پہلا شمارہ دسمبر ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آیا تھا، عربی کلینڈر کے اعتبار سے یہ ربیع الاول کا مہینہ تھا، چنانچہ پہلے اداریے میں عید میلادالنبی کے حوالے سے بہت ہی فکر انگیز گفتگو کی گئی ہے، لکھتے ہیں:

> ''روایتوں کے مطابق اس مہینہ میں اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ پیدا ہوئے، اس موقع کی مناسبت سے پوری دنیا میں عید میلادالنبی اور سیرت کے جلسوں کا انعقاد اہتمام سے کیا جاتا ہے۔ اور شیدائیان رسول اپنی زبانی عقیدتوں اور محبتوں کے خوب خوب نذرانے پیش کرتے ہیں اور اس طرح پورے سال آپ کی تعلیمات سے کی گئی ناقابل تلافی غفلتوں کی تلافی کی جاتی ہے۔ عہد جدید کے لوگوں کا یہ ایک فرسودہ طریقہ ہے۔ جس کی تقلید آج ہر مذہب کے ماننے والے کر رہے ہیں۔ تاریخ انسانی کے وہ افراد جو کسی خاص وقت کے لیے پیغام لے کر آئے ہوں اور اپنے زمانے میں انہوں نے اصلاح و تعمیر کا کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو اور بعد میں ان کی ذات کے ساتھ ان کے پیغام کی افادیت بھی ختم ہوگئی ہو تو ایسے نامور

افراد کے ساتھ اس طرح کا مروجہ سلوک بجا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ شخصیت جو ابدی تعلیمات کی امین و پیامبر رہی ہو اور جس کی تعلیمات پر مبنی پیش آنے والا انقلاب دور اور دیر تک انسانیت کو مستفید کرتا رہا ہو۔ عقل اور عقیدت کی کسوٹی پر آج بھی اس پیغام کی افادیت واثر انگیزی جوں کی توں باقی ہو، اس شخصیت کے ساتھ عام افراد تاریخ انسانی کا سا سلوک موزوں نہیں''۔

منور حسین صاحب کی ادارت کا زمانہ وہی زمانہ تھا جب ملک بھر میں رام مندر کو لے کر فسطائی طاقتیں یکجا ہونا شروع ہوگئی تھیں، بابری مسجد کے خلاف سازشیں زور پکڑ رہی تھیں اور رام مندر تعمیر کی تحریک بڑھتی چلی جارہی تھی، رام مندر تحریک ملک میں نفرت اور فرقہ واریت کے فروغ کی تحریک تھی، اس تحریک نے ملک کے امن اور بھائی چارہ کو بری طرح نقصان پہنچایا تھا، جنوری ۱۹۸۸ء کے اداریے میں اس وقت کے حالات کی جھلک کچھ اس طرح دیکھی جاسکتی ہے: ''ملک کی موجودہ صورت حال جیسی کچھ ہے وہ تمام لوگوں کے سامنے ہے۔ بے شمار قسم کی خرابیوں میں فرقہ وارانہ منافرت کا بڑھتا ہوا رجحان خاص طور پر بڑی سرعت سے ایک نامناسب رخ اختیار کرتا جارہا ہے۔ مختلف مذہبی رسوم کے حوالوں سے تنازعات کا اٹھ کھڑا ہونا اور لاتعداد جانی و مالی اتلاف کا نتیجہ تو ایک معروف سی چیز بن گئی تھی لیکن اب تو باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے والے معاملات بھی آپسی منافرت کا ایک نیا اور مؤثر ذریعہ بنتے جارہے ہیں۔ یہ وہ خطرناک رجحان ہے جس کے سدباب کی اگر سنجیدہ اور فوری کوشش نہیں ہوئی تو اس کے تباہ کن نتائج کا تصور بھی کرنا مشکل ہے''۔ اداریے کا آخری حصہ اس سلسلہ میں ملی ذمہ داریوں کی جانب متوجہ کرتا ہے، لکھتے ہیں: ''اس ضمن میں امت مسلمہ کے افراد کی ذمہ داری اور بھی زیادہ اہم ہوجاتی ہے کہ وہ جس امن وامان اور سلامتی کے علم بردار دین کے امین ہیں۔ اس کے پیغام امن وسلام کو زیادہ توجہ، فکر یکسوئی، خلوص اور سچی بہی خواہی و ہمدردی کے جذبہ سے عام کرنے کی کوشش کریں۔ اس لیے کہ حالات کے خراب ہونے اور کردینے میں اس بات کا بھی خاصا دخل رہا ہے کہ یہ پیام امن وعافیت پردوں میں چھپا رہا ہے اور مذہب کے نام پر لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد واغراض کے حصول کی مذموم کوششیں کی ہیں۔ ضرورت ہے کہ باشندگان ملک اس خدائی پیغام کی صحیح شکل دیکھ سکیں، اس کے اوپر شکوک وشبہات، اندیشوں اور غلط فہمیوں کے جو پردے پڑے ہوئے ہیں انہیں ہٹانا اور آب وہوا کی طرح اس سے استفادہ کو انسانی برادری کے لیے آسان بنانا ہماری اولین ذمہ داری ہے۔ اس باب میں پہلے قدم کے طور پر باہمی اخوت و بھائی چارے کی فضا کے قیام کے لیے جو دعوت دین کی ہماری جدوجہد کے لیے ایک ناگزیر قدم

ہے،ہمیں ہر اس ممکن، جائز تدبیر کو روبعمل لانا ہوگا جو اس کے لیے مددگار ثابت ہوسکتی ہوں''۔

دسمبر ۱۹۸۹ء کا اداریہ بھی ملک میں فرقہ وارانہ ماحول کے فروغ، فسطائی عناصر کی پیہم سازشوں، حکومتوں کی نااہلی، مسلم قیادت کے رول اور پھر ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے مطلوبہ صفات کی طرف رہنمائی کرتا ہے، فرقہ وارانہ حالات کی بڑھتی سنگینی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''گجرات سے بہار تک پورا شمالی ہند فرقہ وارانہ فسادات کے شعلوں میں لپک رہا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد فرقہ وارانہ ماحول نے کبھی اتنی بھیانک شکل اختیار نہیں کی تھی۔ ملک کی تہذیبی روایات اور سیکولر آدرش گویا پارہ پارہ ہو چکے ہیں''۔

ان فسادات کے سلسلہ میں منور حسین مرحوم نے کچھ باتیں بہت ہی بے لاگ طور پر کہی ہیں، جو کل بھی حقیقت تھیں اور آج بھی حقیقت ہیں، کل بھی ان کے ازالہ کے سلسلہ میں کوئی کوشش نہیں کی جاسکی اور آج بھی نہیں کی جارہی ہے، اسی اور نوے کی دہائیوں میں ہونے والے فسادات کو گجرات، مظفر نگر اور دہلی فسادات کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو ایک ہی طرح کے حالات، ایک ہی طرح کے چیلنجز، ایک ہی طرح کے مسائل، ایک ہی طرح کے اسباب اور شکایات ہیں، منور حسین صاحب کا تجزیہ ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ اتفاق یہ ہے کہ پچھلے دو ماہ میں ہونے والے فسادات جن کی تعداد دوسو کے قریب پہنچ چکی ہے، ان ریاستوں میں ہوئے ہیں جہاں کانگریس کی حکومتیں ہیں۔

۲۔ یہ فسادات کون کراتا ہے۔ اس کا جواب ہمیشہ الزام تراشیوں کی شکل میں آتا ہے۔ حکومت بھی اپنا فریضہ صرف یہی سمجھتی ہے کہ کسی کے سر الزام تھوپنے کی کوشش کرے۔

۳۔ مگر اصل سوال تو یہ ہے کہ حکومت، پولیس اور انتظامیہ کس مرض کی دوا ہے۔

۴۔ فسادات اچانک بارش کی طرح نہیں برستے۔ اس کے لیے بہت پہلے سے ماحول تیار کیا جانے لگتا ہے۔ پوری پلاننگ کی جاتی ہے۔ فضا کو مسموم کرنے کی منظم اسکیم بنائی جاتی ہے۔ اور افواہوں کا بازار گرم ہوتا ہے۔ کوئی تیار شدہ ڈرامہ اس طرح اسٹیج کیا جاتا ہے کہ وہ ایک بہانہ بن جائے۔

۵۔ خفیہ پولیس اور انتظامیہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہتی ہے۔ بعض دفعہ خفیہ پولیس تنبیہ بھی کرتی ہے۔ مگر انتظامیہ کے ارادے کچھ اور ہوتے ہیں یہاں تک کہ گھر اور جائیدادیں شعلوں کی نذر ہونے لگتی ہیں اور انسانی جانوں کی ارزانی نشان عبرت بن جاتی ہے۔ ذرا محسوس نہیں ہوتا کہ یہ انسان کسی مہذب دور میں بستے ہیں۔ اور المیہ یہ ہوتا ہے کہ پولیس اور انتظامیہ اس قتل وخون کی شریک وسہیم بلکہ سرپرست بن جاتی

ہے۔اندور ہو یا بدایوں یا بھاگل پور ایک ہی کہانی ہے۔

۶۔ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ انتظامیہ کا اسٹرکچر جیسے چکنا چور ہو چکا ہو۔وزیر اعظم تک کے احکامات نظر انداز ہور ہے ہیں۔انتظامی مشینری کی ناکامی کا اعتراف بھاگل پور کے فسادات کے سلسلے میں خود وزیر اعظم اور وزیر داخلہ نے کیا ہے۔مگر کیا حکومت ہند کے پاس اس کی اصلاح کی تدبیریں ہیں اور کیا وہ اس کی اصلاح کی خواہاں بھی ہے؟اور کیا اس کے بعد کوئی اخلاقی حق حکومت کرنے کا باقی بھی رہ جاتا ہے؟ مگر افسوس کہ ہماری سیاست میں اب اخلاق کا عنصر اتنا بھی نہیں بچا ہے جتنی بادل میں بجلی۔

۷۔دوسری طرف بدقسمتی یہ ہے کہ اس ملک میں بسنے والے پندرہ کروڑ مسلمانوں کی کوئی مؤثر لیڈرشپ نہیں ہے۔کوئی ایسی زبان نہیں جس کی آواز میں اثر ہوتا۔مختلف سیاسی پارٹیوں میں شامل اکثر مسلم رہنما بے زبان بھیڑوں کی طرح ہیں، جو نہ اپنا گلہ چھوڑ سکتے ہیں اور نہ چرواہے سے بغاوت کر سکتے ہیں۔اتنی بڑی ملت کا کوئی رخ نہیں اور نہ کوئی قابلِ بھروسہ سیاسی قیادت۔

۸۔حالات انتہائی صبر آزما اور حوصلہ شکن ضرور ہیں بلکہ کبھی کبھی تو مستقبل بھی غیر یقینی نظر آتا ہے مگر یہی وہ حالات ہیں جن میں صبر اور جرأت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔اور یہ صفات صحیح معنوں میں عزم الامور بن جاتی ہیں۔ہمارے اندر اعتماد اور یقین ہونا چاہیے اور ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمیں اس ملک کو کچھ دینا ہے جو اَب تک ہم نہیں دے سکے ہیں،ایک خدا کی بندگی کی دعوت۔ملت کی نئی نسل سے ملت کی بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں۔موجودہ حالات کا جواب بھی اس نئی نسل کے پاس ہے۔بشرطیکہ وہ اپنی حیثیت اور اپنی ذمہ داری کو سمجھ لے۔

جنوری ۱۹۸۹ء کے اداریے میں ملک میں فرقہ وارارنہ صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بہت ہی اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، یہاں منور حسین صاحب ملکی نظام اور ملکی پالیسیوں پر بے لاگ تنقید کرتے نظر آتے ہیں:''جب کسی فرقہ یا جماعت کے اندر اپنی برتری کا احساس پیدا ہوتا ہے تو یہ لازما جارحیت کا رخ اختیار کرتا ہے۔اور اس ملک میں ہونے والے فسادات اسی احساس برتری کی پیداوار ہیں۔اس فکر سے اتفاق کرنا اس لیے مشکل ہے کہ ہمارے علاقائی،لسانی،نسلی اور فرقہ وارانہ جھگڑے احساس برتری کی بدولت نہیں مظلومیت،محرومی اور احساس حق تلفی کی پیداوار ہیں۔ ملک کے ارباب سیاست وحکومت اور اداروں کے منتظمین کو قومی یکجہتی،سیکولرزم اور قومی دھارے جیسے کھوکھلے نعروں کی تعلیم کے بجائے ٹھوس بنیادوں پر مختلف طبقوں کے حقوق ومفادات کے تحفظ کی منصفانہ فکر کرنی چاہیے اور ان کے فکر ونظر کو صحیح رخ پر کام کرنے کے

مواقع مہیا کرنے چاہئیں تاکہ اس طرح کی صورت حال کا خاتمہ کیا جا سکے''۔

منور حسین صاحب کے اداریوں کا محور و مرکز اصلاح اور دعوت کے مشن کی جانب لوگوں کو ترغیب اور توجہ دلانا تھا، اپنے اداریوں میں وہ واضح طور سے ایک مشن کے داعی اور علمبردار نظر آتے ہیں، فروری ۱۹۸۸ء کے اداریے میں مسلم سماج کی صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کی بندگی کی دعوت تمام انسانوں کو دینا مسلمانوں کا مقصد زندگی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ مسلمان سماج ہی اس قدر بگڑا ہوا ہے کہ اس کی اصلاح کا کام ہی ضروری اور مقدم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کا معاشرہ بھی بگاڑ میں غیر مسلموں کے برابر تک چلا گیا ہے۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم ایک ایسے اہم کام کو اختیار کر کے جو ہماری وجہ سے اہمیت اختیار کر گیا ہے اس کام کو مؤخر کر دیں جو ہمارا مقصد وجود اور غایت اصلی ہے''۔ آگے لکھتے ہیں: ''حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں عقل وفہم اور علم وشعور کے مالک مسلمانوں کو بیک وقت کئی محاذوں پر کام کرنا ہے، اپنی اصلاح وتربیت، معاشرہ کی اصلاح وتعمیر، غیر مسلمین میں تبلیغ دین، منافرت کی فضا کا خاتمہ، سازشوں کی بیخ کنی، حملوں کا دفاع وغیرہ اور ان سب میں مقصد وجود ہی کو اولیت اور اہمیت حاصل ہے، کہ اسی کے ذیل میں اپنی اور اپنے معاشرہ کی اصلاح ہوسکتی ہے اور اسی کی خاطر سازگار ماحول کی تشکیل کی کوشش بھی کرنی ہے''۔

اصلاح ودعوت کے مشن کا ایک اہم حصہ اسلام کے تعلق سے مسلمانوں کے درمیان موجود غلط فہمیوں اور غلط رسوم ورواج کا ازالہ، ترجیحات میں درآئے خلل اور انحرافات کی درستگی، اور اسلام کی صحیح نمائندگی ہے۔ اپریل ۱۹۸۸ء کے شمارے میں اس سلسلہ میں کئی اہم نکات پر گفتگو کی گئی ہے:

۱۔ اسلام کے تعلق سے مسلمانوں میں جو زوال آیا ہے اس کا ایک واضح پہلو یہ ہے کہ ہمارے فکر وعمل میں بالکل معکوس تبدیلی آ گئی ہے۔ اسلام نے دو چیزوں میں سے جسے راجح قرار دیا وہ ہمارے نزدیک مرجوح ہے اور جسے دوسرا مقام دیا وہ ہمارے نزدیک پہلا مقام حاصل کر گئی ہے۔ ترجیح آخرت کی بجائے دنیا پرستی کا بڑھتا ہوا رجحان اس کی بین مثال ہے۔ اسی طرح کی بے اعتدالی رمضان کے دنوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

۲۔ یہ بات مسلم ہے کہ اسلامی احکام میں سب سے اہم حکم نماز کا ہے۔ روزہ دوسرے نمبر پر آتا ہے لیکن یہ عمومی مشاہدہ ہے کہ روزہ داروں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے کہ عام دنوں کا تو ذکر ہی کیا خود رمضان کے دنوں میں بھی نماز سے ان کا واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کی توجیہ جو بھی کی جائے مگر ہمارا عمل یہ بتاتا ہے کہ گویا روزہ نماز پر

بھی مقدم اور اس سے بھی اہم فرض ہے۔ آخر اس کے روزوں کی قبولیت کا کیا جواز و امکان ہے جو نماز جیسے اہم فرض کو نا قابل توجہ سمجھتا ہو۔

۳۔ رسول اکرم ﷺ سے رمضان کے روزوں کے اہتمام کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کا اہتمام بھی ثابت ہے۔ رات کی نمازوں (تراویح وتہجد) میں قرآن مجید کے زیادہ سے زیادہ سننے اور سنانے کا اہتمام دراصل اسی اتباع سنت کا مظاہرہ ہے۔ لیکن اس معاملہ میں بھی ہمارے یہاں افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ بعض لوگوں کے لیے تو رمضان اور دوسرے دنوں میں کوئی فرق ہی نہیں ہوتا۔ تو کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اس ماہ میں تلاوت سے شغف انہیں اس حد کو بھی پھلانگنے سے باز نہیں رکھتا جو اللہ کے رسولؐ نے متعین کی ہے۔

۴۔ دین کے محدود تصور کے تحت ہم ہر چیز کو علیحدہ علیحدہ دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ایک بڑا عمل بھی بے وزن ہو جائے گا اگر وہ اس نظام سے کاٹ کر انجام دیا گیا جس کا وہ حصہ ہے۔ اسی لیے رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ بہت سے روزہ دار اور شب بیدار ایسے ہوں گے جنہیں سوائے بھوکا رہنے اور رات کے جاگنے کی مشقت کے کچھ نہیں مل سکتا۔

۵۔ روزہ کے ساتھ ساتھ نمازوں، دعاؤں اور تلاوت کی کثرت اور غرباء ومساکین کی اعانت کے عمومی مظاہر سامنے آتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سب کچھ بھی رسمی وغیر شعوری طور پر انجام پائے اور دل میں یہ ارادہ ہو کہ بس اس مہینہ کے ختم تک یہ سب جھمیلے ہیں تو یہ سارے اعمال اکارت ہی جائیں گے۔

۶۔ تلاوت قرآن کے سلسلے میں ان بے اعتدالیوں سے سخت پرہیز کی ضرورت ہے جو بعض مقامات یا حلقوں میں پائی جاتی ہیں۔ قرآن کا جلد جلد ختم کرنا اور جیسے تیسے اس کی تلاوت۔ یہ سب امور قرآن مجید کی توہین کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ تراویح میں حفاظ کی جو عمل داری ہوتی ہے اس میں بعض مقامات قرآن کی زیادہ مقدار پڑھنے کے لیے کھینچ دیتے ہیں اور اسی سے مماثل الفاظ خوب استعمال ہوتے ہیں کیا یہ قران کی تکریم ہے؟ تلاوت قرآن کے لیے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے اور کم از کم تین دنوں میں ختم کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس کی روشنی میں ایک رات میں ختم قرآن یا شبینہ جیسے رواج کا آخر کیا جواز رہ جاتا ہے۔

مئی ۱۹۸۸ء کے شمارے میں بھی مسلم سماج کا ایک جائزہ پیش کیا گیا ہے، اس جائزہ میں جہاں دینداری کے بڑھتے رجحانات کی تحسین کی گئی ہے، وہیں مسلم سماج میں انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطحوں پر بڑھتے اخلاقی بحران پر فکرمندی بھی ظاہر کی گئی ہے، لکھتے ہیں: ''مسلم سماج کا ایک جائزہ جہاں یہ روشن پہلو ہمارے سامنے

لاتا ہے کہ اس میں دین داری کی فضا پائی جاتی ہے، پہلے کے مقابلے میں دین سے وابستگی میں اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ وہیں یہ تاریک پہلو بھی عبرت کے لیے کافی ہے کہ اخلاقی گراوٹ، خودغرضی، مفاد پرستی جیسے رجحان میں بھی خطرناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے۔ اسلام مسلمانوں کو ایثار و بے غرضی کا سبق سکھاتا ہے مگر وہ غرض و مفاد کی بندگی میں اس قدر مست ہیں کہ نہ خدا کا کوئی خوف ہے اور نہ آخرت کے محاسبہ کا کوئی اندیشہ۔ آج کے مسلمان سماج میں بھی یہ لعنت آپ کو مل سکتی ہے کہ مسجدوں، عیدگاہوں اور مقبروں کی زمینوں پر ناجائز تصرف مسلمان ہی کرتے ہیں۔ خواتین کو جائز حقوق سے محروم کر کے جہیز کے نام پر مال و دولت زمین و جائیداد کی فرمائش کی جاتی ہے۔ اسی رجحان کا یہ بھیانک روپ بھی مسلم سماج دیکھنے لگا ہے کہ جہیز ہی کی خاطر یا تو لڑکیاں خودکشی کر رہی ہیں یا انہیں نذر آتش کر دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ادارے، بدعنوانیوں کی آماجگاہ، اقتدار کی رزم گاہ اور بدانتظامیوں کا ایک شاہ کار ہیں۔ دینی تنظیموں کے زیر انتظام چلنے والے اداروں کے ماسوا ایک بھی ادارہ ان چیزوں سے پاک نظر نہیں آسکتا۔ خودغرضی اور مفاد پرستی کے یہ افسوس ناک مظاہر ان میں سے چند ہیں جن سے آپ کو اپنے سماج میں واسطہ درپیش ہے۔ کیا بیواؤں، یتیموں اور سماج کے کمزور عناصر کی خبر گیری کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے ناسور ہماری توجہ کے مستحق نہیں؟''۔ اداریے کے آخر میں کمزوری اور بگاڑ کی اصل وجہ اور سبب کی نشاندہی کرتے ہوئے اس جانب توجہ دلائی گئی ہے: ''ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج کے خیر پسند افراد کو خالص خداترسی اور آخرت کی جواب دہی کی بنیاد پر اکٹھا کیا جائے اور کسی بڑے فتنے یا انتشار کے بغیر اپنے سماج کی ان لعنتوں کا خاتمہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں جو نہ صرف ہمارے سماج پر ایک سیاہ داغ ہیں بلکہ اسلام کی رسوائی اور بدنامی کا سبب ہیں۔ اللہ کے حضور جواب دہی کے احساس کے مردہ ہو جانے کے سبب مسلم سماج میں جو بے شمار خرابیاں پائی جاتی ہیں وہ آپ کی نظروں کے سامنے ہیں اس لیے اجتماعی مفاد کے بہت سے کام ایسے ہیں جن کی ضرورت آپ محسوس کرتے ہوں ترجیحی بنیادوں پر انہیں یکے بعد دیگرے انجام دیا جا سکتا ہے۔ ضرورت صرف احساس اور عملی اقدام کی ہے''۔

مسلم سماج میں تشدد اور جذباتیت کے بڑھتے رجحان اور مستقل مزاجی کے فقدان کا بھی منور حسین مرحوم نے کافی اچھا تجزیہ پیش کیا ہے، جیسا کہ سطور بالا میں اشارہ کیا گیا کہ منور حسین مرحوم کا دور ادارت ملک میں فسطائیت کے عروج کا زمانہ تھا، بابری مسجد کے خلاف ہندتوادی تحریک زوروں پر تھی، ایسے حالات میں مسلم نوجوانوں کے درمیان جذباتیت اور شدت پسندی کو فروغ دینے والے متعدد عناصر متحرک ہو جاتے ہیں،

مستقل مزاجی اور ٹھوس کاموں کا مزاج کمزور پڑنے لگتا ہے، منور حسین صاحب نے اپنے وقت کے مسلم سماج کا تجزیہ کرتے ہوئے اس پہلو پر اچھی رہنمائی پیش کی ہے، جون ۱۹۸۸ء کے اداریے میں لکھتے ہیں: ''اسلامی طریق زندگی میں جس طرح نفسانیت اور نفاق مہلک امراض قرار دیے گئے ہیں اسی طرح ہنگامہ پروری، تشدد اور جذباتیت کو بھی بنظر تحسین نہیں دیکھا گیا ہے۔ جوش و جذبہ سے کبھی کبھی بڑے مشکل کام آسان ہو جاتے ہیں اور کبھی بڑے مرحلے بھی طے ہو جایا کرتے ہیں۔ لیکن اگر اس جوش کے ساتھ ہوش وخرد کی لگام نہ ہو تو یہ سارے کارنامے غیر پائیدار اور بے سود ثابت ہوتے ہیں۔ ہر انقلابی تحریک کی خمیر میں جہاں نوجوانوں اور جوانوں کا جوش اور کارکنوں کا اخلاص کارفرما ہوتا ہے۔ وہیں اس کی قیادت کی ہوش مندی کا بھی اہم رول ہوتا ہے۔ دنیا کے عام انقلابات اور رسول اکرمؐ کے ذریعے برپا ہونے والے انقلاب میں ایک بین فرق یہ ہے کہ آپ جن اصولوں کے نفاذ کے علم بردار تھے کارکنان تحریک کو ان پر نہ صرف یہ کہ پورا ایمان تھا بلکہ عملی زندگی اس یقین کی شاہد تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ قائد تحریک کی بصیرت و قیادت پر انہیں مکمل اعتبار و اعتماد تھا۔ آپ کی تحریک کے علم برداروں میں حضرت عمر فاروق اور حضرت علی مرتضیٰ جیسے جیالوں اور جانبازوں کے جوش وجذبے کا کون منکر ہو سکتا ہے؟ لیکن کیا یہ جذبے رسول اکرم کی ہوش مندانہ قیادت کے بغیر وہ نتائج پیش کر سکتے تھے جن کا مشاہدہ تاریخ انسانی نے کیا ہے''۔ آگے کی سطور میں ٹھوس اور مستقل مزاجی کے کاموں کی جانب توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں: ''آج ملت اسلامیہ جن حالات سے دوچار ہے وہ بہت واضح ہیں۔ ملت کا درد رکھنے والوں کی بھرپور کوشش ہونی چاہیے کہ اس کے اندر ٹھوس بنیادوں پر مستقل مزاجی کے ساتھ تعمیری کام انجام دینے کا رجحان پیدا ہو۔ وہ اسلام کے احکام کے نفاذ کی اجتماعی جدوجہد کریں۔ مسلمان اسلام کے قولی و عملی گواہ بن جائیں۔ ان کا سماج اسلامی سماج کا نمونہ ہو۔ پھر ان میں ایسا اتحاد پیدا ہو جسے فروعی اختلافات اور ذاتی اغراض ومفادات پارہ پارہ نہ کر سکیں۔ ان کی قیادت اسلامی اصولوں کی علم برداری کا قولی و عملی مظہر ہو۔ اگر یہ باتیں مسلم سماج میں پیدا ہو جائیں تو انہیں ان بے شمار مسائل سے بڑی حد تک خلاصی نصیب ہو جائے گی جن میں وہ آج گھرے ہوئے ہیں''۔

اسی اداریے میں میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے صحافت کے میدان میں آگے بڑھنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں: ''ذرائع ابلاغ کی اہمیت اس وقت مسلمہ حقیقت بن چکی ہے اس کی طرف سے ہماری عام بے توجہی کا ہی نتیجہ ہے کہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں

پائی جاتی ہیں اور ہم اقدام کے بجائے دفاع کی پوزیشن میں چل رہے ہیں۔فحاشی، بے حیائی اور حیوانیت کو بڑھاوا دیا جارہا ہے۔ایسی صورت حال میں ذرائع ابلاغ بالخصوص صحافت جوفکر ونظر کی تبدیلی کا اہم ذریعہ ہے بڑی توجہ کی مستحق ہے۔اس وقت ایسے رسائل ومیگزین کے تعاون کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جن کے ذریعہ تعمیری صحافت کا مستحکم بنیادوں پر فروغ وارتقاء ہوسکے''۔ یقیناً منور صاحب آج موجود ہوتے تو الکٹرانک میڈیا، سوشل میڈیا اور میڈیا کی دوسری مختلف برانچوں کی جانب ضرور متوجہ کرتے، جہاں خال خال ہی مسلم نوجوان اور مسلم چہرے نظر آتے ہیں۔

منور حسین صاحب کے کچھ اداریے عالمی سیاست اور عالمی احوال پر بھی مشتمل ہوتے تھے، جنرل ضیاء الحق کا انتقال ہوا تو ستمبر ۱۹۸۸ء کا اداریہ جنرل ضیاء الحق کی سیاست اور مسلم دنیا میں ان کے مقام کے تعلق سے لکھا، ساتھ ہی وطن عزیز کے ساتھ تعلقات کو لے کر ان کی سنجیدگی کی تحسین بھی فرمائی، لکھتے ہیں: ''اپنے پڑوسی ممالک کے ساتھ خوش گوار برادرانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے انہوں نے جوجتن کیے وہ برصغیر کی تاریخ پر نظر رکھنے والوں کو ہمیشہ یادرہیں گے۔غیر جانبدار تحریک میں پاکستان کی شمولیت اور بغیر کسی دعوت کے مختلف بہانوں سے ہندوستان کے دورے اس کی اچھی مثالیں ہیں''۔عالمی سیاست میں ان کے رول اور ان کے مقام سے متعلق لکھتے ہیں: ''انہوں نے اپنی سیاسی بصیرت کی بنیاد پر دنیا کے قائدین میں اہم مقام حاصل کرلیا تھا۔اور عالم اسلام میں صف اول کے قائد شمار کیے جانے لگے تھے۔عالمی سطح پر مسلمانوں کے بارے میں سوچنے کی وجہ سے شاہ فیصل جیسی مرکزیت انہیں حاصل ہوگئی تھی''۔

منور حسین مرحوم ملکی سیاست اور سیاسی اتار چڑھاؤ پر بھی اچھی نظر رکھتے تھے، وہ سیاست کے پیچ وخم سے بھی خوب واقف تھے اور سیاست میں مذہب اور مذہبی جذبات کے استحصال کی سیاست کا بھی خوب اندازہ رکھتے تھے، پنجاب میں اسی کی دہائیوں میں جو حالات بنے اور ملک بھر میں سکھ برادران کے ساتھ جو معاملات روا رکھے گئے وہ ملکی سیاست کا ایک خطرناک باب تھا، اس کا سہارا لے کر ملکی سیاست میں جو کچھ کھیل کھیلا جارہا تھا، اس کی ایک جھلک ستمبر ۱۹۸۸ کے اداریے میں دیکھی جاسکتی ہے، لکھتے ہیں: ''پنجاب کی شورشوں سے ہمارے حکمرانوں کو نیا حربہ مل گیا ہے۔جس کے ذریعہ وہ لوگوں کی توجہ اصل مسئلہ سے ہٹا کر ملک میں پیدا ہونے والے بے شمار مسائل کے حل کے سلسلہ میں اپنی نااہلی پر پردہ ڈال رہے ہیں۔یہ نکتہ کسی دیدہ ور نے انہیں سمجھادیا ہے کہ ریاست کی دہشت گردی کے پیچھے جو تصور کارفرما ہے وہ مذہب وسیاست کی یکجائی ہے اور

اس کی واضح علامت وہاں کی سیاسی سرگرمیوں کے لیے گولڈن ٹیمپل کا مرکز بنالینا ہے۔ چنانچہ اس خطرناک تصور کے خاتمہ کے لیے مختلف حلقوں سے زبردست بیانات واعلانات منظر عام پر آئے جس نے بالآخر مذہبی اداروں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال نہ کیے جانے کے بل ۱۹۸۸ء کی صورت اختیار کی اور پارلیمنٹ سے اسے پاس بھی کرالیا گیا''۔ آگے مذہب وسیاست کی تفریق سے متعلق حکومتی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس ملک میں قانون کی دھجیاں بکھیرنے میں حکم راں طبقہ اور عوام دونوں مہارت رکھتے ہیں۔ اس بل کو پاس کرتے وقت ہی حکومت کو یہ احساس ہوا کہ یہ بل بھی اس کے مقاصد پورے نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اسی دوران یہ بات بھی کہہ دی گئی کہ مذہب وسیاست کی تفریق کے لیے ایک جامع بل بھی تیار کیا جائے گا۔ جس سے شائد اصل مسئلہ حل ہوسکے۔ لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مذہب وسیاست کی تفریق کی بات اصولی طور پر صحیح ہے نہ عملی طور پر''۔ آگے ملک کے سیاسی سربراہان کے دوہرے رویے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''عملی طور پر یہ تصور اس طرح غلط ثابت ہوتا ہے کہ اس نعرے کی دہائی دینے والے وزیراعظم پارلیمنٹ اور دیگر ایوانوں میں تو اسی نظریہ کی تکرار کرتے ہیں لیکن موقع آنے پر قشقہ بھی کھینچا جاتا ہے۔ مندروں میں پوجا بھی کی جاتی ہے۔ اور پنڈتوں کے آشیرواد بھی حاصل کیے جاتے ہیں۔ الیکشنی مقاصد جو سراسر سیاسی مقاصد ہیں، ان کے حصول کے لیے خالص مذہبی جذبات کا استحصال بھی کیا جاتا ہے۔ ایسے حکم رانوں کو تو یہ زیب بھی نہیں دیتا کہ وہ مذہب وسیاست کی علیحدگی کی بات بھی زبان پر لائیں''۔ آگے مذہب وسیاست میں تفریق کے سلسلہ میں دنیا بھر کے تجربات کا حوالہ دیتے ہوئے ایک اصولی بات لکھتے ہیں: ''مذہب وسیاست میں تفریق کا یہ تصور کلیسائی نظام کے جابرانہ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوا لیکن آج کل حقیقت پسندی کی بنیاد پر یہ تصور مضمحل ہوچکا ہے۔ بڑے پیمانے پر مختلف ممالک اس تصور کے غلط ہونے کا اعلان کرچکے ہیں۔ اس صورت حال میں بھی اگر اس فرسودہ تصور کو ہمارے یہاں بار بار دہرایا جاتا ہے تو یہ ہماری نظریاتی پس ماندگی اور مسائل کا مقابلہ کرنے میں ہماری بے بسی کی دلیل تو بن سکتا ہے کسی مسئلہ کا حل اور کسی درد کا مداوا ہرگز نہیں ہوسکتا''۔

سلمان رشدی کی بدنام زمانہ کتاب شیطانی آیات نے ایک زمانے میں دنیا بھر میں ہنگامہ برپا کررکھا تھا، اس پر ملکی وعالمی سطح پر خوب سیاست کھیلی گئی، آزادی رائے اور سیکولرزم کی خوب خوب دہائیاں دی گئیں، ایک طرف نام نہاد دانشور تھے جو اس کے خلاف کسی قسم کے احتجاج کی معقولیت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، دوسری طرف دنیا بھر کے سیاست باز تھے جو اپنے اپنے انداز سے اس مسئلہ پر عوام کا استحصال کررہے

تھے،ایسی صورت میں منور حسین مرحوم نے دسمبر ۱۹۸۸ء کے شمارے میں مذہبی اور انصاف پسند جذبات اور آراء کی بہترین ترجمانی کی ہے: ''سیٹنک ورسیز نے اپنے متنازعہ فیہ مواد کی وجہ سے غیر معمولی شہرت حاصل کر لی ہے۔ یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ یہ کوئی علمی تصنیف نہیں ہے۔ تاہم اس پر نام نہاد دانشوروں نے جو بحثیں کی ہیں ان سے ہماری سطحیت اور تضادات واضح ہو کر سامنے آ گئے ہیں۔ اس کی مخالفت اس بنا پر کی گئی ہے کہ اس میں قرآن جیسی عظیم کتاب کی توہین کی گئی ہے اور حضرت محمدؐ جیسے عظیم انسان کے کردار کو داغدار کیا گیا ہے۔ اس لیے انسانی برادری کے ایک بڑے حصے کو اس کتاب سے قلبی اذیت ہوئی ہے۔ اس مخالفت کی بنیاد پر متعدد ممالک نے اپنے یہاں اس کتاب کی اشاعت، درآمد اور فروخت پر پابندی عائد کر دی ہے۔ جب کہ صحافیوں کے ایک طبقہ نے اس مخالفت کو غیر معقول، غیر آئینی اور غیر جمہوری قرار دیا ہے''۔ آگے لکھتے ہیں: ''مسٹر ملک راج آنند نے اپنے ایک خط میں حکومت کے اقدام پابندی کو سیکولرزم کے منافی اور آزادیٔ رائے کے خلاف قرار دیتے ہوئے اسے کالعدم قرار دینے کا مشورہ دیا ہے۔ (Times of India 13 Oct.) سیکولرزم اگر اسی طرح کی مذہبی غیر جانبداری سکھاتا ہے جیسی ملک راج آنند فرماتے ہیں، اور آزادیٔ رائے اگر اسی طرح کے بے قید آزادی ہے تو اس ملک کو ایک مسلسل اور لامتناہی سلسلۂ فساد و انارکی سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ آزادیٔ رائے اور سیکولرزم میں یہ حد بندی اول روز سے ہے کہ اس سے کسی مذہبی فرقہ کی توہین یا دلآزادی نہ ہو۔ ایسی آزادی و غیر جانبداری کی اجازت ہرگز نہیں ہے جس سے کسی فرقہ کی تہذیب و تشخص میں مداخلت کی صورت پیدا ہو جائے۔ یہ بڑی خوشی و اطمینان کی بات ہے کہ ملک راج اور سولی سورابجی جیسے دانشوروں کو دستوری تعبیرات کا مجاز نہیں گردانا گیا ہے''۔

مارچ ۱۹۸۹ء کے اداریے میں اس کتاب پر کچھ اس طرح تبصرہ فرماتے ہیں: ''زندہ فرد پر بہتان تراشی اور ماضی کی مذہبی شخصیات پر بہتان تراشی میں فرق ہے۔ پہلی صورت میں ایک فرد بہتان کا نشانہ بنتا ہے۔ دوسری صورت میں ایک پوری قوم۔ شیطانی آیات نے محض ایک پوری قوم ہی کی اہانت نہیں کی ہے بلکہ یہ کتاب ہرزہ سرائی اور یاوہ گوئی اور نسلی عصبیت کی غلاظت سے بھری ہوئی ہے''۔

اسی اداریے میں مسلمانوں کے ردِ عمل کی نوعیت اور اس کے متوقعہ نتائج اور اثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''سچی بات تو یہ ہے کہ مسلمان قرآن وسنت کی ہدایت کی روشنی میں اس طرح کی یاوہ گوئی کا جواب اسی انداز میں دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم اس کے بالمقابل قانونی، جائز اور شریفانہ انداز میں اپنے شدید غم

وغصہ کا اظہار ہی کر سکتے ہیں۔اللہ نے دنیا میں طرح طرح کی مخلوقات پیدا کی ہیں اور درحقیقت ہر شخص کی اپنی انفرادیت ہے۔لہٰذا مسلمان مسٹر رشدی کے آزادیٔ ضمیر اور اپنے حلقہ بگوشوں کے درمیان اپنے اوہام وخرافات سے مشغلہ کرتے رہنے کے حق کو چیلنج نہیں کرتے۔جب تک کوئی شخص اپنے گندے خیالات کو اپنی حدتک یا اپنے حلقہ تک محدود رکھتا ہے،اس وقت تک کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہوتا۔لیکن کوئی بھی ایک ذمہ دار پبلشر سے اس کی توقع نہیں رکھتا کہ وہ مغلظات کو شائع کرے اور اسے مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے پھیلاتے رہنے پر مصر رہے''۔

جنوری ۱۹۸۹ء کے اداریے میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی اہمیت،مسلمانان ہند کے سلسلہ میں اس کی خدمات،اور ملک میں ملت کے روشن مستقبل کو لے کر اس ادارے سے قائم کی جانے والی توقعات کو بہت ہی خوبصورت انداز میں قلم بند کیا گیا ہے،چند اقتباسات ذیل میں پیش ہیں:

> ''مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ مسلمانوں کی عصری تعلیم کا وہ واحد ادارہ ہے جسے سرسید نے مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی ختم کرنے کے لیے قائم کیا تھا۔ان کے نزدیک تعلیم ہی وہ بنیادی جوہر ہے جس کی بنا پر کوئی قوم ترقی کے منازل طے کرتی ہے۔آج اس ادارہ کا یہ امتیاز ہے کہ اگر یہاں مسلم طلبہ کی صحیح فکری وعملی تربیت کی جائے تو ہندوستان میں بالخصوص ملت مسلمہ کی تہذیبی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہوسکتی ہے۔ورنہ یہاں سے تعلیم پانے والے کچھ افراد بعض شعبوں میں ایک فرقہ کی کسی حدتک نمائندگی تو کر سکتے ہیں لیکن بحیثیت ایک امتیازی ملت کے ان کا تشخص مسخ ہو کر رہ جائے گا۔''

آگے لکھتے ہیں:''مسلم یونی ورسٹی ایک امتیازی وآفاقی ملت کی نمائندہ ہونے کی وجہ سے صحیح نہج پر اپنے طلبہ کے فکر وعمل کی تشکیل کے سلسلہ میں اہم رول ادا کر سکتی ہے۔اور اس طرح پورے ملک کے لیے ایک نشان راہ بھی قائم کر سکتی ہے''۔

دارالعلوم دیوبند کا حادثہ مسلمانان ہند کے لیے چونکا دینے والا واقعہ تھا،علماء کرام نے اس موقع پر جس طرح دریدہ ذہنی کا مظاہرہ کیا،جس طرح ایک دوسرے کی پگڑیاں اچھالی گئیں،پولیس اور عدالتوں کا سہارا لیا گیا،یہ پورا واقعہ بہت ہی حیرتناک اور پریشان کن تھا،منور حسین مرحوم نے فروری ۱۹۸۹ء کے اداریے میں اس قسم کے واقعات پر بہت ہی دلسوزی کے ساتھ تبصرہ کیا ہے،اور ساتھ ہی اس سلسلہ میں ہمارے مطلوبہ رویے کے سلسلہ میں بھی اچھی رہنمائی فرمائی ہے،لکھتے ہیں:''ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ان متحارب گروہوں

میں برسر حق کون ہے، یہ امر ضرور قابل غور ہے کہ کیا کسی اختلافی مسئلہ کو طے کرنے کا یہی واحد طریقہ رہ گیا ہے جسے بہ تکرار اپنایا جا رہا ہے۔ علماء کرام کے لیے اس دین وشریعت میں کوئی رہنمائی نہیں ہے جس کے وہ حامل ہیں۔ کیا ان کے لیے بھی معاملات کے تصفیہ کا وہی طریق کار موزوں ہے جو مادہ پرست اور بے دین افراد اختیار کرتے ہیں؟ ممکن ہے وہ اس سے مسلمانوں کو بھی اپنے تنازعات طے کرنے کے تمام مراحل کا عملی درس دینا چاہتے ہوں۔ وہ غیر اسلامی انداز جس کی انتہائی شکل ہم دیکھ رہے ہیں اس کی ایک جھلک ۱۹۸۷ء کے اوائل میں راقم الحروف نے یہ دیکھی تھی کہ مدرسہ کے آس پاس کی مساجد ذکر اللہ کی بجائے عدالتی کارروائیوں کے ذکر اور ناموزوں اقوال وتذکروں سے معمور تھیں۔ وہ علماء جن سے عوامی تنازعات میں حکم بننے کی توقع کی جاتی ہے ان کے معاملات کے تصفیے موجودہ ہندوستانی عدالتیں اور پولیس کی مداخلت کرے یہ تمام مسلمانوں کے لیے باعث شرم ہے۔ وہ دینی مدارس جہاں اساتذہ معلم کے ساتھ مربی کا رول بھی ادا کرتے ہوں، جہاں اساتذہ کا ایک وقار واحترام ہو، جہاں ان سے اختلاف رائے کو مخالفت اور سوئے ادب خیال کیا جاتا ہو وہاں اس قسم کے عملی مظاہر طلبہ کو کس قسم کی تربیت کی راہ پر ڈالیں گے!''

آگے اس سلسلہ میں غیر معمولی فکرمندی کے ساتھ ساتھ ملی اداروں کی بے حسی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ملی قائدین اور ملی اداروں کے ذمہ داران سے مخاطب ہوتے ہیں: ''آج پوری دنیا میں مسلمانوں کے سامنے جس قسم کے مسائل ہیں بالخصوص ہندوستان میں مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ایک ایسے طبقہ کا جس پر ہندوستان کی ایک بڑی آبادی کو اب تک دینی اعتماد رہا ہے اس طرح باہم دست وگریباں ہونا اور اپنے وقار واعتماد کو خاک میں ملانے کی غیر دانش مندانہ کوشش جہاں ایک افسوسناک امر ہے وہیں اللہ کے اس دین کو رسوا اور ذلیل کرنے کی غیر ارادی مذموم کوشش ہے جو سارے انسانوں کے لیے رحمت اور نعمت بن کر آیا ہے۔ کیا یہ بات ایک زبردست سانحہ اور المیہ نہیں کہ علم دین کے حاملین علم دین کے مراکز میں یہ مناظر لوگوں کے تمسخر کے لیے پیش کریں۔ کاش! ہم اپنے سطحی اور حقیر قسم کے مفادات سے بلند ہوسکیں اور دین وملت کے وسیع تر مفاد میں اب بھی دانش مندی کا دامن تھام لیں!''

شمالی ہند کی ریاستوں میں تعلیم اور تعلیمی اداروں کی صورتحال آزادی کے بعد سے اب تک کبھی بھی اطمینان بخش نہیں رہی، حرام خوری، رشوت، تساہلی، کام چوری، لاپرواہی جیسے متعدد امراض نے یہاں کے تعلیمی نظام کو بری طرح متأثر کر رکھا ہے، منور حسین صاحب نے شمالی ہند کی ایک بڑی ریاست بہار کے تعلق سے

بہت ہی بے لاگ اور بھرپور تجزیہ پیش کیا تھا، یہ تبصرہ جولائی ۱۹۸۹ء کے اداریے میں موجود ہے، یہ تجزیہ منور حسین مرحوم کے وسیع مطالعہ، زمینی حقائق سے واقفیت اور عوام کے حقیقی مسائل سے گہری دلچسپی کا واضح ثبوت ہے، اس تجزیہ کے اہم نکات ذیل میں پیش ہیں:

۱۔صوبہ بہار اپنی بہت سی خوبیوں کے ساتھ لاقانونیت، بدعنوانی، رشوت ستانی جیسی لعنتوں میں اس بری طرح گرفتار ہے کہ پورے ملک میں اسے سرفہرست قرار دیا جاسکتا ہے۔زندگی کے تمام شعبوں کی طرح تعلیم کا شعبہ بھی ان امراض میں مبتلا ہے۔جن سے چھٹکارا پانے کی بظاہر کوئی سبیل نظرنہیں آتی۔

۲۔سال کے اکثر مہینے تعلیمی اداروں کا بند رہنا، امتحانات کا وقت پر نہ ہونا، نتائج کا تاخیر سے تیار ہونا، اساتذہ اور طلبہ کا تدریس و تعلیم سے بے نیاز رہنا وہاں کی زندگی کی معمولی باتیں ہیں۔امتحانات کے سوالات عموماً وقت سے پہلے طلبہ کو معلوم ہوجاتا کرتے ہیں، اس کے ساتھ ہی ہر امتحان میں چوری اور نقل نویسی کی آزادی وہاں کے لیے ایک عام سی بات ہوکر رہ گئی ہے۔

۳۔صوبہ میں بہت سے لڑکے اور لڑکیاں جو اپنی یونیورسٹیز میں ٹاپ کرکے حکومت کے وظیفے حاصل کررہے ہیں ایسے ہیں جنہیں اپنے مضامین کی مبادیات تک سے واقفیت نہیں ہے۔امتیازی درجہ انہیں صرف اس بنا پر حاصل ہوا کہ ان کی کاپیاں اس مضمون کے کسی ماہر استاد نے لکھ دی تھیں اور جانچ کے وقت اونچے درجے کی سفارش سے انہیں امتیازی نمبرات دلائے گئے تھے۔

۴۔وہاں کی یونیورسٹیز میں ریسرچ کی صورت حال بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔اس درجہ میں داخلہ کے لیے مختلف یونیورسٹیاں اپنے معیار کے اعتبار سے غیر قانونی قسم کی الگ الگ مقدار میں فیسیں وصول کرتی ہیں۔اور بغیر ان فیسوں کے جو خالص کلرکوں کی جیب میں جاتی ہیں، داخلہ ناممکن ہوتا ہے۔اس کے بعد کے مرحلے میں ہر تحقیقی مقالہ کے لیے سپروائزر کی الگ فیس ہوتی ہے۔وہاں زیادہ تر تحقیقی مقالے یا تو کسی کتاب یا تحقیقی مقالے کا چربہ ہوتے ہیں یا سپروائزر کے املا کردہ یا تحریر کردہ۔متعدد پروفیسر صاحبان کے بارے میں یہ بات معلوم خاص و عام ہے کہ ڈاکٹر بنانے کی فیس ان کے ہاں کتنی ہے؟

۵۔سرکاری تعلیم گاہوں کے علاوہ وہاں مدرسہ شمس الہدی بورڈ کے تحت سینکڑوں مدارس ایسے ہیں جنہیں حکومت کا جزئی تعاون حاصل ہے۔یہ مدارس بڑی تعداد میں جعلی یا برائے نام ہیں اور ایک تعداد ان مدارس کی بھی ہے جو حکومتی گرانٹس وصول کرنے سے قبل معیاری و مستند مانے جاتے تھے لیکن حکومت سے تعلق کی بنا پر

ملازمانہ ذہنیت نے ان کی شکل وصورت ہی مسخ کردی ہے اور حکومتی مشینری کی بدعنوانیاں وہاں بھی پوری طرح سرایت کرگئی ہیں، مدرسہ بورڈ رشوت خوری کا ایک بڑا ادارہ بن چکا ہے۔ وہاں تنخواہ کا کوئی بل کسی استاد کی تقرری یا تبدیلی بغیر رشوت کے ناممکن ہے، رشوت خوری کے اس ادارہ کا سب سے بڑا کارکن وہاں کا چیئر مین ہوتا ہے اور وہ بھی اس حکومت کے ماتحت ہی ہوتا ہے جس کا ہر فرد اس لعنت میں علانیہ یا خفیہ طور پر عموماً گرفتار ہوتا ہے۔ یہ باتیں ایسی نہیں ہیں جن کے لیے کسی ثبوت یا دلیل کی ضرورت ہو، یہ تو اتنی معلوم خاص وعام ہیں کہ ایک واقف کار اس پر تعجب کرسکتا ہے کہ کیا یہ بھی کوئی قابل ذکر بات ہے؟

۶۔ وہ اساتذہ جن کے بارے میں یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ نئی نسل کی کردار سازی بھی کریں گے تاکہ وہ آئندہ ملک کے اچھے شہری اور قوم کے بے لوث خادم بن سکیں۔ خود ان کے اندر سے دیانت داری، فرض شناسی جیسی صفات رخصت ہوچکی ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں ضابطہ کی کلاسوں سے جی چرانا، اس کے بجائے طلبہ کو خانہ ساز کوچنگ سینٹر اور ٹیوشن سنٹر سے فائدہ اٹھانے کی دعوت دینا ان کی پست ذہنیت کی غماز ہے۔ اخلاقی وذہنی بیماریوں کے ان معالجوں کی طرح جسمانی بیماریوں کے معالج بھی اسی طرح کی پست حرکتوں میں مبتلا ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سرکار کے نام پر چلنے والے بیشتر ادارے ناکارہ یا ازکار رفتہ ہو چکے ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ جس قوم کے معمار اس طرح کی وبائی لعنت میں گرفتار ہوں اس قوم سے ترقی کی امید کوئی کرسکتا ہے؟

جون ۱۹۸۹ء میں جنوبی ہند میں کیرلا کا سفر ہوا تو اس کی روداد پر مشتمل ایک سے زائد اداریے تحریر فرمائے، یہ اداریے اگست ۱۹۸۹ء اور ستمبر ۱۹۸۹ء کے شماروں میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں، ان اداریوں میں وہاں کے حالات بالخصوص مسلم سماج کا اچھا تجزیہ پیش کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

> ''جون ۱۹۸۹ء کا آخری ہفتہ اس اعتبار سے ایک یادگار رہے گا کہ ایس آئی او کی نئی میقات کے لیے ذمے داروں کے انتخاب کا عمل اس سے وابستہ ہے۔ یہ انتخابی عمل ریاست کیرالا کے ایک پرفضا مقام اسلامیہ کالج شانتا پورم میں انجام پذیر ہوا۔ کیرالا کے ہم سفروں سے وہاں کی بہت ساری باتیں معلوم کرتا ہوا ریاست کے حدود میں داخل ہوا۔ وہاں کے لوگوں کی دو خصوصیات بہت نمایاں نظر آئیں۔ ایک طبیعت کی سادگی دوسرے ان کا محنتی وجفاکش ہونا۔ غالباً ان کی ان خصوصیات میں وہاں کی جغرافیائی حالت کو بھی کچھ دخل ہو مگر اہل جنوب کے اخلاص اور ان کی سادہ طبیعت کا گزشتہ دس سالوں سے قائل ہوں''۔

کیرلا میں موجود مسلکی اور گروہی تعصب کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ''یہ تو نا قابل تر دید حقیقت ہے کہ وہاں مسلکی یا گروہی تعصب انتہائی شدید ہے۔ابن خلدون نے بدویت کی جو خوبیاں اور خصوصیات بتائی ہیں وہ بڑی حد تک اس علاقہ میں دیکھی جاسکتی ہیں''۔

جماعت اسلامی ہند کی تعلیمی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''وہاں کی سب سے قابل ذکر چیز وہاں جماعت اسلامی کے زیر انتظام تعلیمی ادارے اور طلبہ کی قیام گاہیں ہیں۔اسلامی خطوط پرنئ نسل کی تعلیم وتربیت کے لیے یہ ادارے بیش بہا اور قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ان اداروں میں دینی تعلیم کا نظام ہے۔اس کے ساتھ ہی گریجویشن کی سطح تک پرائیویٹ امتحان دینے کی تیاری کرائی جاتی ہے۔یہ نظم ابھی تک صرف آرٹس کے مضامین تک محدود ہے۔سائنس کے مضامین کے لیے حکومت کی منظوری اور دیگر مسائل کی رکاوٹیں ہیں۔یہ تعلیمی ادارے جہاں نئ نسل کی دینی تعلیم وتربیت کا ایک قابل اطمینان وسیلہ ہیں وہیں تحریک اسلامی کے لیے کارکنان کی فراہمی کا مستقل اور پائیدار ذریعہ بھی۔اسی طرح اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے طلبہ کے لیے بورڈنگ ہاؤس کا نظم ان بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے ایک بہت ہی موثر طریقہ ہے''۔

دینی تعلیم اور زبانوں کے رواج سے متعلق لکھتے ہیں: ''یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہاں کی طلبہ تنظیم میں نصف سے زائد ایسے نوجوان ہیں جوقرآن مجید کواس کی اصل زبان میں سمجھ سکتے ہیں۔تعلیم میں عربی زبان کو سب سے پہلا اور اہم مقام حاصل ہے۔دوسرے درجہ پر انگریزی اور تیسرے درجہ میں اردو کی تعلیم بھی شامل نصاب ہے۔یہ احساس بجا طور پر پایا جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اردو زبان بولتی اور سمجھتی ہے۔غیر اردو کے جو مختصر علاقے ہیں اگر وہ بھی رابطہ کی زبان کے طور پر اسے سیکھ لیں تو لسانی مغائرت کی موجودہ فضا ختم ہوسکتی ہے۔اور افہام وتفہیم اور ابلاغ وترسیل کے مسائل آسان تر ہوسکتے ہیں۔اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے طلبہ عموماً تمل ناڈو یا اتر پردیش کی درس گاہوں کی طرف رجوع کرتے ہیں''۔

سیاسی شعور کے سلسلہ میں عمومی ماحول کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ریاست کا ہر فرد کسی نہ کسی سیاسی پارٹی سے منسلک ہوتا ہے اس لیے بھی وہاں کا سیاسی شعور نسبتاً بالیدہ نظر آتا ہے۔تحریکی اداروں کے بچوں سے یہ سن کر ایک خوش گوار حیرت ہوئی کہ وہ اپنے ہفتہ وار اجتماعات کا بڑا حصہ سماجی وسیاسی امور ومسائل پر بحث ومباحثہ، غور وفکر اور تجزیہ میں گزارتے ہیں اس لیے کہ قرآن وحدیث اور اسلامی فکر کی تعلیم تو ان کا ادارہ انہیں

خود ہی فراہم کرتا ہے''۔

تعلیم کی صورتحال یہاں پہلے بھی بہت ہی قابل قدر تھی اور اب بھی یہ ریاست اس سلسلہ میں ایک امتیازی مقام رکھتی ہے، لکھتے ہیں: ''تعلیمی ادارے زیادہ تر پرائیویٹ ہیں، سائنس اور ٹکنیکل اور پروفیشنل تعلیم کا نظم حکومت کے تحت ہے۔ تعلیم یافتہ افراد کی شرح دوسری تمام ریاستوں سے زیادہ ہے''۔

سماجی زندگی کے حوالہ سے جب بھی گفتگو ہوتی ہے خواتین کا تذکرہ لازماً آجاتا ہے، منور حسین صاحب اس حوالہ سے بھی کیرلا کے ماحول پر گفتگو کرتے ہیں: ''سماجی زندگی کی ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہاں کی مسلم خواتین کسی نہ کسی طریقے سے اپنے سر ڈھکتی ہیں اور یہ انہیں غیر مسلم خواتین سے ممتاز کرنے کی ایک علامت بھی ہے۔ جبکہ مردوں میں مذہبی اعتبار سے اس طرح کی امتیازی علامت شاید نہیں ہے۔ بریلوی طبقۂ فکر کے افراد بالخصوص علماء اپنے سر ڈھکتے ہیں۔ عمامہ کا عمومی رواج ہے۔ جبکہ دوسروں کے یہاں ایسا نہیں ہے''۔

منور حسین مرحوم اجتماعیت سے گہری وابستگی اور مشن سے والہانہ تعلق رکھتے تھے، اگست ۱۹۸۹ء کے اداریے میں بہت ہی گہری بات لکھتے ہیں: ''اجتماعیت میں افراد کی وابستگی اور توجہ کی نوعیت بھی اس کے مقاصد کی نوعیت سے بڑی حد تک مطابقت رکھتی ہے۔ محدود قسم کے مقاصد صرف محدود انداز کی وابستگی اور توجہ کا تقاضا کرتے ہیں جبکہ غیر محدود مقاصد مکمل وابستگی اور توجہ کا۔ اسی لیے اُن اداروں سے مطلوبہ مقاصد پورے نہیں ہو پاتے، جن کے افراد مقاصد کے اعتبار سے وابستگی کا عملی مظاہرہ نہیں کرتے۔ یہاں جزئی وابستگی کا مظاہرہ دانش مندی نہیں فریب نفسی ہے اور فریب کا انجام معلوم ہے''۔

ستمبر ۱۹۸۹ء کے اداریے میں تحریک اسلامی کے نصب العین ''اقامت دین'' کا بہت ہی خوبصورت الفاظ میں تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں: ''قرآنی اصطلاح 'اقامت دین' کا خلاصہ ہی یہ ہے کہ قلوب انسانی میں قرآنی عقائد کی جڑیں مستحکم ہوں اور اعمال صالحہ کے برگ و بار پوری قوت و توانائی کے ساتھ رونما ہوں۔ اور اس راہ عمل میں مزاحم فکر و عقیدہ، جذبہ و خواہش، اعمال و اشغال کو ختم کرنے کی ممکنہ کوشش کی جائے''۔

اکتوبر ۱۹۸۹ء کے اداریے میں طلبہ تنظیم کے تناظر میں تین اہم باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

ا۔ اس بات پر خاص توجہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کہیں ہمارا یہ تنظیمی کام جو دراصل ہمارے دین کا تقاضا ہے، ہماری زندگیوں میں ذیلی و ضمنی حیثیت تو نہیں اختیار کر گیا ہے۔ عموماً ہم محدود یا فاضل اوقات میں ان کو کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور کبھی یہ کام نہیں ہو سکا تو اپنے دل میں کوئی کسک بھی محسوس نہیں کرتے۔ اس

کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کام کے مقام وعظمت کا صحیح احساس ہمارے دل میں جاگزیں نہیں ہوسکا ہے۔ ہمیں یہ یقین نہیں کہ یہی دراصل ہماری زندگیوں کا ماحصل ہے۔ یہی ہمارے مالک کی طرف سے دی گئی اصل ڈیوٹی ہے۔ یہی اس کوخوش کرنے کا واحد ذریعہ ہے اور اسی پر ہماری دنیا وآخرت کی فلاح منحصر ہے۔ اس کام کی اصل حیثیت کو اچھی طرح سمجھ کر اپنی زندگیوں میں اسے صحیح مقام دینے کی فکر و کوشش ہونی چاہیے۔

۲۔ آج کے دور میں مادیت اور کیریئر پرستی ایک وبا کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ انسانوں کی توجہات کا تمام تر مرکز وہی ہے، گویا اللہ کی جگہ نعوذ باللہ اس نے لے لی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم بھی غیر شعوری طور پر اس بت کی اطاعت کرنے لگے ہیں۔ ہمارا شعار یہ ہونا چاہیے کہ اس دام سے دوسروں کو نکالنے کی فکر کریں اور ہم اپنی ساری توجہات کا مرکز اللہ ہی کو بنائیں۔

۳۔ راہ حق سے بھٹکے ہوئے نوجوانوں کو اس راہ کی طرف بلانا ہماری پوری توجہ چاہتا ہے۔ یہ صرف چند ذیلی اور ضمنی پروگراموں کے ذریعہ انجام نہیں دیا جاسکتا۔ جب تک ہمارا پورا وجود اسی فکر کا اسیر نہ ہوجائے۔ اس کے لیے بڑی تیاریوں کی بھی ضرورت ہے۔ ضرورت کے بقدر ہمیں علم ہو۔ ہماری زندگی خود اس دین کی شہادت دیتی ہو جس کے ہم داعی ہیں۔ اس کے لیے ممکنہ ذرائع ووسائل سے استفادہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے خصوصی دعائیں کرنا، اس سے توفیق ومدد کا خواہاں ہونا، اس کی یاد سے اپنے دل ودماغ کو غذا پہنچانا اور تقویت حاصل کرنا بھی انتہائی ضروری ہے۔

یہ تحریر مرحوم منور حسین صاحب کے ماہنامہ رفیق منزل نئی دہلی کے لیے لکھے گئے اداریوں کی روشنی میں ایک تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہے، کوشش کی گئی ہے کہ مرحوم کے اسلوب تحریر، فکری رجحان اور موضوعاتی تنوع کا اختصار اور جامعیت کے ساتھ ایک تعارف پیش کر دیا جائے، امید کہ مرحوم کی تمام تحریریں منظر عام پر آجانے کے بعد مزید تجزیے اور مطالعے سامنے آئیں گے۔

ڈاکٹر منور حسین عالم باعمل انسان تھے

محمد عمر فلاحی

سرسید ہال کی جامع مسجد تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونی ورسٹی میں داخلہ لینے والے اکثر طلبہ اس کی زیارت کو اپنی شان تصور کرتے ہیں اور حسب عقیدت سرسیدؒ کے مقبرہ پر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ اسی کے پیش نظر میں بھی حاضر ہوا۔ پہلے تو تحیۃ المسجد ادا کی پھر سرسید کے مقبرہ پر درود وسلام پیش کیا جیسا کہ حضورؐ سے ثابت ہے۔ مسجد سے باہر نکلا تو چند طلبہ کے درمیان ایک قدآور شخص کو مسکراتا ہوا دیکھ کر میرا دل خوش ہوگیا۔ اس کی مسکراہٹ کی ادا آج بھی آنکھوں کے کیمرے میں قید ہے۔ اکثر اپنے کیمرے کے اس خزانے سے آسودگی حاصل کرتا رہتا ہوں۔ چنانچہ موقع غنیمت سمجھتے ہوئے میں بھی اس محفل میں شریک ہوگیا۔ کافی دیر تک موصوف بے تکلفانہ ہم لوگوں سے باتیں کرتے رہے۔ چوں کہ ہم نو وارد تھے، طرح طرح کی تجسس تھی، دیار سرسید میں گویا وہ ایک مہربان بھائی کی مانند ہماری خیریت دریافت کررہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ جن کی سوچ وفکر میں اتنی پختگی اور بلندی ہو جن کے انداز گفتگو میں اتنی شیرینی اور لطافت ہو وہ علم وفضل اور شرف ومجد والے ہی ہوسکتے ہیں۔ بالآخر میں نے ان کا تعارف جاننا چاہا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر منور حسین فلاحی ہیں۔

لفظ فلاحی نے مجھے ان سے اتنی انسیت پیدا کردی کہ میں دوبارہ ملنے کی جستجو میں لگا رہا۔ اچانک ایک دن ڈاکٹر صاحب کو سفید لباس میں ملبوس ایس ایس ہال نارتھ کی ڈائنگ ہال کے پاس کھڑا دیکھا، میں نے بڑھ کر سلام کیا تو انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا۔ ان کے ایک ہاتھ کے مصافحے نے معاً میرے ذہن پر یہ خیال طاری کیا کہ موصوف کو سنت نبوی سے بھی یک گونہ محبت ہے۔ ساتھ ہی دوسرے ہاتھ کو میرے کندھے پر رکھا، چند منٹ محو گفتگو رہے پھر اپنے کمرہ میں لے گئے۔ آج بھی سرسید ہال کا کمرہ نمبر ۱۴۹ میری آنکھوں کے سامنے ہے، اس کمرے میں ایک عجیب سی روحانیت اور سکون کی عطر بیزی

محسوس ہوا کرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں کچھ اور طلبا آ گئے انہوں نے سب کا خوش دلی سی استقبال کیا اور تعلیم و تربیت کے موضوع پر دل سوز انداز میں گفتگو کرتے رہے۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ موم بتی پہلے جلتی ہے پھر ماحول کو روشن کرتی ہے، مرد مومن کی مثال اسی موم بتی کی طرح ہے۔ محنت کبھی نہ کبھی رنگ ضرور لاتی ہے۔ کامیابی کے حصول میں تاخیر ہو جائے تو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ مایوسی کفر ہے۔ ڈاکٹر فلاحی کے تشفی بھرے کلمات میری طرح اور بھی لوگوں کی زندگی کو منور کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب کے علمی امتیاز، اخلاقی بلندی، عملی دین داری اور ایمانی تفوق نے میرے دل و دماغ کو اتنا متاثر کیا تھا کہ ان سے مل کر بے حد سکون و اطمینان محسوس کرتا تھا۔ جی میں ایک خواہش بار بار ہویدا ہوتی رہی کہ اے کاش! منور بھائی اتنی جلدی ہمیں چھوڑ کر نہ جاتے۔ ایک بار انہوں نے فجر کے بعد اپنی رہائش گاہ (دھرہ ادارہ تحقیق و تصنیف کے کیمپس) پر بلایا۔ میں نے اسے باعث سعادت سمجھا اور حسب وعدہ ایک دوست کے ہمراہ حاضر خدمت ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم دونوں کا استقبال اس خلوص و محبت کے ساتھ کیا جیسے کوئی اپنے خصوصی مہمان کو خوش آمدید کہتا ہو۔ ان کی اس دعوت، استقبال اور فروتنی نے گویا میرا دل جیت لیا۔ ہمیں یقین نہیں آتا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا ایک لیکچرر ایک طالب علم کے ساتھ اس طرح بھی مل سکتا ہے۔ منور بھائی نے استاد اور طالب علم کے درمیان کے فاصلوں کو مٹا دیا تھا۔

اس ملاقات میں ڈاکٹر صاحب ہم لوگوں سے بے تکلفانہ انداز میں گفتگو کرتے رہے۔ ایمان و اخلاق، علی گڑھ کی روایات پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ جب ہم لوگوں نے چلنے کا ارادہ کیا تو ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا ناشتہ کے بغیر اس وقت کی ملاقات بے معنی ہو جائے گی۔ ان کی اس برجستگی نے دعوت نبویؐ کی سنت یاد دلا دی کہ آپؐ خوب خوب دعوتیں کیا کرتے تھے۔ فوراً دسترخوان لگایا، ہم لوگوں نے شکم سیر ہو کر کھایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈکٹر صاحب نے جس خلوص و محبت کے ساتھ ہم لوگوں کو ناشتہ کرایا وہ قابل رشک اور قابل ذکر اور قابل تقلید ہے، کیوں کہ اس دعوت میں خلوص تھا، نام و نمود نہیں تھا۔ صرف اللہ کی خوش نودی کے لیے تھا۔

منور حسین فلاحی۔ایک ملنسار اور مخلص انسان

سید عبدالرحیم قریشی

ڈاکٹر منور حسین فلاحی علیہ الرحمہ سے جامعۃ الفلاح میں متعدد بار استفادہ کا موقعہ ملا۔ڈاکٹر صاحب مجھ سے سینئر تھے۔میرے بلریا گنج میں داخلہ سے دو سال قبل ہی فارغ ہو کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جا چکے تھے۔موصوف زندگی بھر رفیق منزل اور طلباء کی ملک گیر تنظیم ایس آئی او اور دیگر دینی و تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف عمل رہے اور قابل عمل نمونہ ہم سب کے لیے چھوڑ گئے۔

راقم الحروف نے ۱۹۸۵ء میں فضیلت کے بعد گریجویشن کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا۔ اس گھڑی کا ایک واقعہ یاد آیا کہ اس وقت یونیورسٹی کے فیکلٹی آف آرٹس میں داخلہ فارم جمع کرانے کی تاریخ ختم ہو چکی تھی، میرے کلاس فیلو اور ہم وطن ڈاکٹر محمد یونس صاحب فلاحی بھی میرے داخلے کے لیے سرگردان تھے۔ اسی تگ ودو میں ڈاکٹر منور حسین فلاحی سے ملاقات ہوئی۔اس زمانے میں سرسید ہال میں موصوف قیام پذیر تھے۔علیک سلیک اور مہمان نوازی کے بعد ہماری الجھن اور پریشانی جان کر کہا کہ سردست دینیات فیکلٹی میں تھیالوجی میں ایڈمیشن لے لیں اور پھر آیندہ تعلیمی سال میں دیکھا جائے گا۔چونکہ تھیالوجی کا معاملہ صرف علی گڑھ تک محدود تھا۔اس لیے اسے چھوڑ کر میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی چلا آیا۔اس وقت یہی قابل عمل تجویز تھی۔

ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب جامعۃ الفلاح تشریف لائے تو ان کی آمد پر طلباء کے لیے خصوصی خطاب کا اہتمام کیا گیا۔ہم غالباً عربی پنجم میں تھے، حمد وثناء کے بعد ڈاکٹر منور حسین فلاحی صاحب نے فرمایا تھا:

آپ تمام طلبہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ جامعۃ الفلاح جیسی درس گاہ میں آپ حصول علم کے لیے آئے ہیں۔یہاں کے اساتذہ کرام سے خوب کسب فیض کیجیے، دل و جان سے محنت کیجیے۔اساتذہ کرام کے علاوہ یہاں آپ کے لیے کتب خانہ لائبریری علمی و دینی اور تحریکی ماحول موجود ہے، حالات کی نزاکت، زمانہ کے چیلنجز کے لیے خوب تیاری کیجیے۔آپ طلبہ سے بجا طور پر امید کی جاتی ہے کہ جامعۃ الفلاح کے مقاصد کو

بروکار لانے کے لیے بھر پور محنت کریں گے۔ یہاں چند سال قیام کرنے کے بعد آپ کو عملی میدان میں اترنا ہے۔اقامت دین کی جاری جدوجہد میں پیش پیش رہنا ہے۔اس لیے یہاں رہتے ہوئے اپنے اوقات کو منضبط اور اگلی منزل کی تیاری کیجیے۔ یہاں کی علمی تیاری آئندہ علمی میدانوں کو ہموار کرے گا۔ان شاءاللہ''

معہدِ علمی جامعۃ الفلاح نے ملت کو کئی سپوت اور علمی وفکری و دینی علماء وفضلاء کی تربیت کرکے ایک بڑی ملی و دینی ضرورت کا سامان کیا۔ڈاکٹر منور حسین فلاحی مرحوم بھی ان میں سے ایک ہیں۔ وہ جہاں بھی رہے جامعۃ الفلاح کے علمی و دینی سفیر رہے۔ مقاصد جامعہ کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھتے۔انھوں نے ایس آئی او اور جماعت اسلامی سے وابستہ رہ کر اپنی خدمات انجام دیں۔امید ہے حیات نو کا یہ خاص نمبر ہمارے لیے زادراہ ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر منور حسین فلاحی اپنی خوبیوں سے پہچانے جاتے تھے۔ وہ بات چیت میں نرمی و ملائمت کی مثال تھے، کرخت گفتگو، گھن گرج جیسے انھیں آتا ہی نہ ہو۔ وہ نہایت خلوص کے ساتھ دوسروں سے ملاقات کرتے تھے۔تقریروں اور عام گفتگو میں ان کا دھیما اور پُر اعتماد لہجہ آج بھی مجھے یاد ہے۔

ڈاکٹر منور حسین کا نقد و ادب

ضیاء الدین ملک فلاحی

اس تحریر کا مقصد ڈاکٹر منور حسین فلاحیؒ کی ان تحریروں کا مطالعہ ہے جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مجلّات، سالانہ میگزین یا شعبہ اردو کے رسائل میں شائع ہوئے تھے، جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

۱- ادارت، رفتار ۹۸-۱۹۹۷ء، عرض مرتب، روداد سمینار: غالب تنقید کے سو سال، جلسہ تہنیت، اساتذہ کی علمی و ادبی سرگرمیاں، پی ایچ ڈی کے منظور شدہ مقالات اور ایوارڈ یافتہ مقالات کا تجزیہ۔

۲- ادارت، رفتا ۹۹-۱۹۹۸ء، عرض مرتب، روداد سمینار: اردو ناول آزادی کے بعد، شعبہ اردو کی تحقیقی سرگرمیاں

۳- ادارت، علی گڑھ میگزین ۸۶-۱۹۸۵ء (اردو)، اداریہ، تدریس کے بعض مسائل، گجرات میں اردو کا ارتقا

۴- اقبال کی نظم سرگزشت آدم-ایک مطالعہ، فکر و نظر، جنوری-مارچ ۱۹۹۵ء/ ۹۷-۵۷

۵- رشید احمد صدیقی کی تنقید اقبال، فکر و نظر علی گڑھ، جنوری-مارچ ۱۹۹۶ء، (یہ مقالہ اقبالیات (اردو)، اقبال اکادمی لاہور، پاکستان، جنوری-مارچ، جولائی-ستمبر ۱۹۹۸ء میں اسی عنوان سے شائع ہو چکا ہے)

۶- تعلیم: مقصد و منہاج، تہذیب الاخلاق، ستمبر ۱۹۹۶ء

۷- سرسید کی معنویت، تہذیب الاخلاق، اکتوبر ۱۹۹۶ء

۸- لوحِ ایام، مختار مسعود، (نئی کتاب پر تبصرہ)، تہذیب الاخلاق، فروری ۱۹۹۷ء

مسلم یونیورسٹی کے بعض دیگر میگزین میں موصوف کے جو مقالات شائع ہوئے، ان کا تجزیہ و تعارف بوجوہ یہاں ممکن نہیں ہے، صرف عنوانات کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے، جن کا تعارف کسی اور موقع کے لیے موخر کیا جاتا ہے۔

۱- جوش کی شاعری میں ترقی پسند عناصر، آہنگ سرسید، علی گڑھ، ۱۹۸۸ء

۲- مغربی علوم سے اردو تراجم کا مسئلہ، ضیاء میگزین، ۱۹۹۱ء

۳- فردوسِ بریں ایک مطالعہ، سرسید ہال ریویو، ۱۹۸۷ء

۴- انشائیہ کیا ہے؟ ضیاء میگزین، علی گڑھ، ۱۹۸۸ء

۵- اشاریہ مصنّفین، علی گڑھ میگزین عالمی فکشن نمبر، ۹۵-۱۹۹۴ء

۶-اسلام کے عطا کردہ بنیادی حقوق (محمد صلاح الدین) تلخیص، تہذیب الاخلاق، دسمبر ۱۹۹۶ء

منور حسین کی بابت یہ بات معلوم ہے کہ مدرسہ سے فراغت کے بعد انھوں نے عصری جامعہ کا رخ کیا، جہاں انھیں معاصر عہد کی علمی و تحقیقی عطایا اور اپنے فن کے ماہر ترین اساتذہ کی صحبتیں نصیب ہوئیں۔ جامعۃ الفلاح میں ان کے اساتذہ اور ہم عصر ساتھیوں کا کہنا ہے کہ ان کی انگریزی دیگر کلاس فیلوز سے اچھی تھی۔ شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں انھیں اپنی ادبی پیاس بجھانے کا بھرپور موقع ملا۔ انھوں نے کلاسیکی ادب اور جدید ادبیات کا بنظر غائر مطالعہ کیا جس کا بھرپور عکس ان کے پی ایچ. ڈی. کے مقالہ میں نظر آتا ہے، جواب کتابی شکل میں دستیاب ہے۔ منور حسین نے اردو، عربی، فارسی اور انگریزی چاروں زبانوں سے اپنی تخلیقات کو سنوارنے میں مدد لی جس کا اظہار ان کی تمام تحریروں میں جا بجا ہوتا ہے۔ معاصرین کہتے ہیں کہ جب کبھی کوئی غیر معمولی انگریزی کتاب ان کے ہاتھ لگتی تو عالم استغراق کی وجہ سے ٹرین کا ٹکٹ بھی کینسل اور ضائع کرنے کی نوبت آجایا کرتی تھی۔ منور حسین کو ماہنامہ رفیق منزل دہلی کی ادارت کا تین سال موقع ملا جس میں انھوں نے ادبی حسن اور علمی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ رفیق منزل کے اداریے آج بھی اپنی ادبیت، عصریت، حسیت اور مقصدیت کے لیے صاحبان علم و تحقیق سے داد تحسین وصول کر رہے ہیں۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ادبیاتِ منور کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے اور مرحوم کی تنقید نگاری پر مفصل بحث کی جائے۔ ان شاء اللہ جلد ایک الگ کتاب لانے کا ارادہ ہے۔

سطور ذیل میں مذکورہ ۸ مقالات کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ موصوف نے اپنی خالص ادبی تحریروں میں قدیم و جدید ادباء و شعراء، ناول نگاران، قصیدہ گو، اور نعت گو شعراء کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ دوسری طرف معاصر عہد میں سماجی، ثقافتی، سیاسی، اور دینی مسائل پر جرأت مندی کے ساتھ دوٹوک انداز میں اپنی آراء کا اظہار بھی کیا ہے۔

۱- رفتار شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا معتبر جرنل ہے، جس کے ذریعہ دنیائے اردو کی تخلیقات کا علم ہوتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کی عظمت و شہرت کے طفیل کلاسیکی اور جدید علماء و دانش وران کی زیارت یہاں گاہے بگاہے ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً روداد سمینار: غالب تنقید کے سو سال (۷-۸/ مارچ ۱۹۹۸ء) (مرتبہ منور حسین) سے علم ہوتا ہے کہ اس کے علمی اجلاسوں کی صدارت میں متعدد عظیم ہستیاں جلوہ افروز ہوئیں مثلاً: پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر وارث کرمانی، پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر اے ایم کے شہریار، جب کہ منور حسین کے مرتب کردہ روداد اردو ناول آزادی کے بعد سمینار منعقدہ ۵،۶/ مارچ ۱۹۹۹ء میں جو صدور اور

مہمانانِ خصوصی شریک اجلاس ہوئے ان کے اسماء گرامی ہیں: پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر عتیق احمد صدیقی اور پروفیسر وہاب اشرفی۔ بات صرف اتنی ہے کہ بھارتی اردو ادب کی رفتار کو جاننے کے لیے شعبہ اردو کا ''رفتار'' جس کی دوبارا دارت منور حسین کو تفویض کی گئی، وہ اردو دنیا کی معلومات کے لیے ایک بیرومیٹر (Barometor) سے کم نہیں۔ قارئین کو یہ بتانا مفید مطلب ہوگا کہ دیگر تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے ۹۸-۱۹۹۷ء کے شمارہ میں عرض مرتب اور روداد سمینار نیز شمارہ ۹۹-۱۹۹۸ء کی روداد کی بابت راقم اپنے احساسات ناظرین/ قارئین تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اس تعارف سے منور حسین کی مذکورہ تحریروں کے چند امتیازی پہلو نمایاں ہو سکیں گے۔

مرتب موصوف اپنے ''عرض'' میں خوش خبری سناتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اس کی امتیازی کارکردگی کی بنیاد پر ڈپارٹمنٹ آف اسپیشل اسسٹنس کا درجہ دیا تھا جس کا پہلا مرحلہ گزشتہ سال مکمل ہوا...موجودہ سال کا اختتام اس خوش آئند واقعہ پر ہوا کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ریویو کمیٹی شعبہ اردو کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے آئی اور اس نے بہت تفصیل سے شعبہ کی تمام تعلیمی، تصنیفی اور تحقیقی سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔ کمیٹی کے ممبران نے شعبہ کی کارکردگی، اساتذہ کی تصنیفات، تحقیقی سرگرمیاں اور ڈی.ایس.اے. سے متعلق پروجیکٹ وغیرہ کی بابت یہ احساس رقم کیا کہ:

> یہ شعبہ برصغیر کے تمام شعبہ ہائے اردو میں ممتاز و منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اور یہاں جس یکسوئی، انہماک، محنت و توجہ سے تدریس و تحقیق کا حق ادا کیا جاتا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ (رفتار ۹۸-۱۹۹۷ء، ص: ۵)

۲۲ صفحات (۹ تا ۳۰) پر بکھرے روداد سمینار کا ایجاز و اطناب غالباً شعبہ اردو کے معیاری رودادوں میں سے ایک شمار کیا جائے گا۔ آج کے مواصلاتی دور میں بھی اس قدر جامع روداد تیار کرنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے، جو منور حسین نے اپنی خداداد صلاحیت، مضبوط حافظے اور شدید ریاض سے تیار کیا تھا۔ عموماً اس دور میں ایسی تحریریں ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے تیار کی جاتی تھیں۔ لیکن کسی ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکا کہ حرف و معنی کی تحدید و تعیین، ماہ و سال اور اسماء و اعلام کی صحت کے لیے کن ذرائع کا موصوف نے استعمال کیا، یقین نہیں آتا کہ انھوں نے پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈ کا استعمال کیا ہوگا۔ مقالات کی تلخیص میں بجا طور پر یہ خدشہ ہو سکتا تھا کہ پورا مقالہ ان کے سامنے رہا ہو، لیکن یہ شک اس وقت رفع ہو جاتا ہے جب موصوف افتتاحی، اختتامی اور وقفہ سوالات کی مکمل تفصیلات کو مرتب کر کے ایک قابل مطالعہ چیز بنا دیتے ہیں۔

اس روداد میں مہمانانِ خصوصی، صدورِ عظام اور شیخ الجامعہ کے خطابات کی تلخیص کی گئی ہے۔ ان سے اردو زبان وادب کے عروج وترقی اور معاصر تحقیقات کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً پروفیسر گوپی چند نارنگ کہتے ہیں کہ علی گڑھ کے سمینار ہمیشہ یہ کرتے ہیں کہ کوئی علمی ڈسکورس جس سطح تک پہنچ چکا ہے اس سے آگے دیکھا جائے۔ اردو کا المیہ یہ ہے کہ یہاں تنقیدی دھارا تحقیقی دھارے سے الگ ہوتا ہے، دنیا میں کہیں ایسا نہیں ہوتا۔ متن کو خود کفیل سمجھنے کی رَو میں ایسا ہوا ہے دونوں دھاروں میں ربط وارتباط ضروری ہے۔ غالب پورے ہندوستان کے اجتماعی حافظے کا حصہ بن رہا ہے''۔

صدر اجلاس شمس الرحمٰن فاروقی نے عسکری کے حوالہ سے فرمایا کہ غالب پر میر کو تفوق حاصل ہے۔ غالب کو ہم نے ایک غیر ملکی شاعر کی حیثیت سے پڑھا ہے۔ غالب کی اس عہد سے مطابقت یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر استفہام کی نظر ڈالتا ہے۔ میر کو تو اپنی کمال گویائی کا اعتراف ہے۔ غالب اپنی شخصیت کو مستحکم کرتے چلتے ہیں۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ جغرافیہ کو پلٹتے ہیں۔ (رفتار،۱۲-۱۳)

منور حسین پروفیسر قاسمی حفظہ اللہ کے افتتاحی خطبہ کو ان ہی کے الفاظ میں ہمارے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''غالب کے کلام کا کوئی حصہ قابل ترک نہیں ہے۔ بڑی شاعری کے لیے غالب اب ایک معیار بن چکا ہے۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ کیا تدابیر ہیں جن کی بنا پر کوئی شاعری زمانی حد بندی سے ماوراء ہو جاتی ہے۔ وہ حالی جو سادگی، اصلیت اور جوش پر زور دیتے تھے۔ انھوں نے غالب کے حوالہ سے لہجہ، رویہ کی باتیں بھی کی ہیں۔ اس کے برعکس یگانہ اور عبدالباری آسی نے غالب کی انفرادیت کا انکار کیا ہے۔ غالب کی تفہیم کے سلسلہ میں میر بھی حائل ہوتے رہے ہیں اور میر کو سمجھنے کے لیے غالب کے حوالہ کی ضرورت بھی رہی ہے۔ مطالعہ میر کی طرف توجہ کے باوجود غالب نظر انداز نہیں ہو سکا ہے''۔ (ص:۹)

منور حسین کی تیار کردہ پوری روداد چشم کشا ہے۔ موصوف نے انتہائی دیانت داری سے حرف ومعنی کی پوری رعایت کی ہے جو مقالہ نگاران یا مقررین نے پیش کیے تھے، انھوں نے ذاتی تصرفات سے مکمل احتراز کیا ہے۔

دوسری ادارت میں موصوف کی جو روداد ۱۷ صفحات (۸ تا ۲۴) کے اندر مرقوم ہے، وہ شعبہ اردو کے لیے تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ بالعموم شعبوں کی علمی وتحقیقی اور دیگر غیر تدریسی سرگرمیاں ضائع ہو جایا کرتی ہیں کہ انھیں منور حسین جیسا محنتی کارکن میسر نہیں آتا۔ ۵/مارچ ۱۹۹۹ء کی صبح میں صدر شعبہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی

نے افتتاحی خطبہ پیش کیا، منور حسین اسے ان کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''آج کے زمانہ میں فکشن کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس میں بھی بین الاقوامی سطح پر ناول کو کچھ زیادہ ہی توجہ کا مستحق سمجھا گیا ہے جب کہ اردو میں ایسے ناولوں کی کمی کا اظہار ہوتا رہا ہے جو عالمی ناولوں کے معیار کو پہنچتے ہوں۔ ۱۹۷۱ء میں اسی شعبہ میں فکشن سمینار کا انعقاد ہوا تھا۔ اس وقت تک اصناف ادب میں شاعری اور اس کی تنقید ہی کا پلہ بھاری تھا مگر اس سمینار میں افسانہ کی شعریات مرتب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے بعد کے عرصہ میں شخصیات پر تو سمینار ہوئے مگر ناول پر ایک صنف کی حیثیت سے گفتگو نہیں ہوسکی ہے۔ ناول جو عہد جدید کا رزمیہ ہے ایسا افسانوی بیانیہ جس میں زندگی کو زیادہ گہرائی اور وسعت کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔ یہ سمینار دراصل اس صنف پر تفصیلی گفتگو کی غرض سے منعقد ہو رہا ہے''۔

ڈاکٹر محمود الرحمٰن شیخ الجامعہ (م ۹؍جولائی ۲۰۱۷ء) نے اپنی افتتاحی گفتگو میں فرمایا کہ ''سماجی الجھنیں، اس کے مسائل، قدروں کی شکست وریخت اور ان کی پیش کش ہر کسی کے بس کی بات نہیں، یہ کام ناول نگار کرتا ہے۔ اردو ناول ہماری تہذیب کی تاریخ بھی پیش کرتا ہے۔ سماجی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ انگریزی ناول کی تاریخ چار سو برس پُرانی ہوچکی ہے جب کہ ہماری تاریخ صرف سوسوا سو برس کی ہے۔ شعبہ اردو کے زیر اہتمام اس سمینار میں جو مہمان مقالہ نگار تشریف لائے ہیں ان سے توقع ہوتی ہے کہ وہ اس موضوع پر گفتگو کا حق ادا کریں گے۔ مجھے اس شعبہ کے پروگراموں سے خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ بڑی خوشی ہو رہی ہے یہاں شریک ہوکر۔ میں صدر شعبہ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے یہاں شرکت کا موقع دیا''۔

سمینار میں پروفیسر شمیم حنفی کا کلیدی مقالہ بعنوان 'ناول- تاریخ اور تخلیقی تجربہ' اپنے موضوع پر جامع تھا۔ منور حسین نے اس مقالے کا اختصار کرنے کے بعد اس کا خلاصہ اپنے لفظوں میں اس طرح بیان کیا ہے:

ناول تاریخ کا نہیں تاریخی شعور کا سفیر اور تاریخ کو وقف کی ہوئی انسانی تخلیق ہے۔ مقام اور وقت کے ایک خاص سیاق میں ہم ناولوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کی معنویت کا تعین کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اپنے زمان ومکان سے لے کر ناول نہ تو لکھا جاسکتا ہے نہ ہماری حسیت میں کوئی پائیدار جگہ بنا سکتا ہے۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ثقافتوں کے پس منظر میں کسی بیانیے کا ظہور ہوتا ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ ثقافت بھی اپنے استحکام اور اپنی توسیع اور تعبیر کے لیے کسی بیانیے کی محتاج ہوتی ہے۔ ہماری موجودہ معاشرتی اور سماجی صورتحال بکھرتی اور مدھم پڑتی ہوئی ثقافتی پہچان بھی اس احساس ضرورت سے عاری نہیں ہے۔ (رفتار، ۹۹-۱۹۹۸ء، ص:۱۱-۱۲)

اس سمینار کے مقالات کے عنوانات یہ تھے:

۱-بیانیات کا پہلو	ڈاکٹر خورشید احمد
۲-ناول کی روایتی تنقید	پروفیسر نیر مسعود، جسے ڈاکٹر محمد خالد سیف اللہ نے پیش کیا تھا
۳-فکشن میں تکنیک و ہیئت کے تجربے	پروفیسر عتیق اللہ
۴-ناول اول جدید تنقید	جناب دیویندر اسر
۵-عزیز احمد کی ناولیں باز یافت کی مثال	خالد سعید
۶-راجہ گِدھ کا مسئلہ	پروفیسر افضال حسین
۷-اُداس نسلیں: ایک نیا تناظر	ڈاکٹر شافع قدوائی
۸-اُداس نسلیں: ایک نیا تناظر	داکٹر عقیل احمد
۹-قرۃ العین حیدر	پروفیسر شمیم حنفی
۱۰-انتظار حسین کے ناول	پروفیسر اسلوب احمد انصاری

اس روداد میں تمام مقالات کے اہم نکات، صدارتی خطابات کے بنیادی نکات، مباحثہ میں حصہ لینے والوں کے نام اور ان کے سوالات و اشکالات نیز مقالہ نگاران کے جوابات کو خوش اسلوبی سے مزین و آراستہ کر دیا گیا ہے۔

۲- رشید احمد صدیقی (م ۱۵؍جنوری ۱۹۷۷ء) کی تنقید اقبال نامی مقالہ فکر و نظر، علی گڑھ ۱۹۹۶ء کے بعد پاکستان کے اقبالیات کی بھی زینت بنایا گیا، جہاں اہل علم نے اس مضمون کی فنی و تحقیقی حیثیت کی تحسین کی۔ اس تحقیقی مقالہ کے ذریعہ منور حسین فلاحی کی دیدہ وری نمایاں ہوتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اپنی تنقیدی نگارشات میں اقبال کا مقام و مرتبہ ان کے ہم عصروں کے درمیان متعین کیا ہے۔ وہ اقبال کا دفاع کرتے ہیں۔ دوسری طرف اقبال کی بعض کمزوریوں کا نہ صرف گلہ کرتے ہیں بلکہ جرأت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ سطور ذیل میں منور حسین کے بعض تجزیے اور تبصرے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس تجزیے سے معلوم ہوگا کہ منور حسین نے رشید احمد صدیقی اور اقبال پر بھی بعض تنقیدیں کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

رشید احمد صدیقی کی تحریروں کے مطالعے سے اس امر کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ جدید شعراء میں اقبال نے انھیں سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ جدید اردو شاعری کا جہاں بھی ذکر آئے گا، خواہ وہ فنی نزاکت کا مسئلہ ہو یا فکری اور موضوعی عظمت کا معاملہ، ہر جگہ کسی نہ کسی عنوان سے اقبال انھیں ضرور یاد کرتے ہیں۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

رشید صاحب نے کسی شاعر سے موازنے میں جہاں اقبال کے امتیازات کا ذکر کیا ہے وہیں مجموعی حیثیت سے تمام شعراء کے مقابلے میں ان کی انفرادیت، خصوصیت اور عظمت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کا سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ رشید صاحب اردو شاعری کی پوری تاریخ میں اقبال کو سب سے زیادہ صاحب علم و دانش انسان سمجھتے ہیں اور علم کی فضیلت کو ہر میدان میں تسلیم شدہ ہے۔'' اس مقام پر منور حسین، رشید احمد صدیقی کے متعدد اقتباسات نقل کرتے ہیں۔ بطور خاص اسلوب احمد انصاری کے نام ایک خط کا یہ اقتباس:

> ''اقبال نے جن مسائل پر جو بات جس بلاغت اور خوبصورتی سے کہہ دی ہے، غالباً سعدی کے بعد اب تک کسی نے نہیں کہی ہے۔ مسائل حاضرہ یا وقتی مسائل پر چند ایک شعر اس طور پر کہہ دیا ہے کہ وہ شعر زندگی کے حقائق کا ترجمان بن گیا''۔

منور حسین نے رشید احمد صدیقی کے حوالے سے اقبال کو اپنی صدی کا سب سے بڑا شاعر، مفکر، رہبر اور ادیب قرار دیا ہے۔ رشید صدیقی اقبال کے کلام کو حشو و زوائد سے یکسر پاک کرتے ہیں۔ جنھوں نے عشق رسول کو میلاد ناموں اور میلاد خانوں سے نکال کر مذہب و ملت کے اعلی اقدار و روایات کو سمجھنے عمل کرنے اور اس کی حفاظت کرنے تک پہنچایا۔ رشید احمد صدیقی کے بقول اقبال کی شاعری موجودہ صدی کا علم کلام ہے۔ منور حسین کہتے ہیں کہ شاعری کو ریاضیاتی یا سائنسی منطق سے جانچنا درست اور مناسب رویہ نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ اقبال کو کوئی فکری تضادات سے پُر قرار دیتا ہے، کوئی انھیں فرقہ پرست کہتا ہے، اور کوئی انھیں شاہینی مسلک کا علمبردار۔ منور حسین نے رشید احمد کے حوالے سے ان اشکالات کو اپنے مضمون میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

منور حسین، اقبال اور رشید احمد کے درمیان متعدد فکری ہم آہنگی کے پہلو تلاش کرتے ہیں۔ دوسری طرف بعض ان پہلوؤں کی بھی نشان دہی کرتے ہیں جن میں رشید احمد صدیقی کو اقبال سے اختلاف رہا۔ مثلاً دین و سیاست کی تفریق کا مسئلہ، منور کہتے ہیں کہ رشید احمد صدیقی اقبال کے علی الرغم دین و سیاست کی دوری کے ہی قائل ہیں۔ رشید احمد صدیقی کا ایک اقتباس نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ رشید صاحب اصولی طور پر اس فکر کے مخالف تھے کہ دین و سیاست دو جداگانہ حقیقتیں ہیں اور ان کی علیحدگی ناگزیر ہے، تاہم ان کے سامنے دین و سیاست کے امتزاج پر مبنی تاریخ چنگیزی بھی تھی جس سے یورپ نشاۃ ثانیہ کے نتیجے میں باہر نکل آیا تھا۔ رشید صاحب کی خواہش یہ معلوم ہوتی ہے کہ دین کے پردے میں چنگیزی کا وہ عمل اب مزید نہ دہرایا جائے جسے مسیحیت نے اپنے دور ظلمت میں

بطور خاص روا رکھا تھا اور نشاۃ ثانیہ کے سورج کے طلوع ہونے تک جس کا سلسلہ دراز رہا۔ اس چنگیزی سیاست کی بدنامی اتنی قابل تشویش نہیں جتنی دین کی بدنامی و رسوائی''۔

۳- فکر و نظر، جنوری-مارچ ۱۹۹۵ء میں شائع شدہ ایک مقالہ کا عنوان ہے: اقبال کی نظم 'سرگزشت آدم-ایک مطالعہ'۔ پانچ صفحات پر محیط یہ مقالہ منور حسین کی اقبال شناسی کا عکاس ہے۔ اس مضمون میں اقبال کی منظومات کا عہد متعین کرنے کے ساتھ اس نظم کے اشعار کے درمیان پائے جانے والے افکار و خیالات اور شعری تعمیر و ترکیب پر ایک ناقد و ادیب کی نظر ڈالتے ہیں۔ اقبال کے ان اشعار کی بابت منور حسین کا یہ تبصرہ دیکھیے:

> ''ان اشعار پر غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ یہ اشعار صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے اس شعری تخلیق کو غزل کا عنوان دینے کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ ایک طرف تو شاعر کی نگاہِ نکتہ رس ہر شے میں مطلوبِ حقیقی کا مشاہدہ کرتی ہے تو دوسری طرف راز ہستی سے بے خبری کا شکوہ اس بنا پر کرتی ہے کہ نگاہ ''مظاہر پرست'' ہے پھر سوال دید کی لذت شاعر کو دیدار سے محرومی پر قانع بنا دیتی ہے جب کہ وہ اپنی اس سادہ لوحی کا بھی اعلان کرتا ہے کہ عرش و کرسی کے فسانے سن کر ہی وہ ایمان لے آیا۔ حریت کے عدم وجود کی شکایت بھی ہے اور انسان کے عنقا ہونے کا بیان بھی اور اخیر میں امیر بیگم کے آستانہ پر جبہ سائی کا تذکرہ ہے۔ اس معنوی انتشار اور تضادات کی سمائی صنفِ غزل ہی کے اندر ممکن ہے مزید برآں غزل کا مطلع و مقطع اور ردیف و قافیہ کی رعایت بھی ہیئتی اعتبار سے اس کی صنفی شناخت کو مستحکم کرتے ہیں۔ ان اشعار میں سب سے زیادہ محل نظر شعر مقطع غزل تھا۔ اقبال نے اپنے مجموعہ کلام میں ایسے اشعار کی گنجائش نہیں رکھی ہے جن سے قطعی طور پر کسی معشوق مجازی کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہو اور بعض اشعار اگر ایسے ہیں بھی تو ان کا مدعا اور مطلوب متعین کرنا خاصا مشکل امر ہے''۔

سرگزشت آدم کے تمام اشعار کا اجمالی تجزیہ کرنے کے بعد ان کے بعض نقائص کی طرف اپنے اسی مضمون میں اشارہ کرتے ہیں چنانچہ بعض اشعار کو اپنے مفہوم میں مکمل ہونے کے باوجود اس کے وجود کو غیر مکتفی قرار دیتے ہیں مثلاً یہ شعر:

مگر خبر نہ ملی آہ! راز ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو تہ نگیں میں نے

منور حسین، اس شعر پر وارد ہونے والے سوالات قائم کرتے ہیں، پھر ان کے جواب عطا کرتے ہیں اور آخر میں رقم کرتے ہیں: ''انسانی تاریخ کے اس پورے مد و جزر کو اقبال نے صرف یہ کہہ کر ایک لڑی میں پرو دیا

ہے کہ یہ حقیقت عالم کی جستجو کا مظہر تھا''۔

عام تصور تاریخ کے برعکس یہاں شاعر کا یہ نقطۂ نظر بھی بالکل واضح ہے کہ انسان نے اپنی تاریخ کا آغاز علم وشعور سے کیا ہے، ایک طویل عرصہ تک وہ آسمانی ہدایت کے زیر اثر سفر کرتا رہا ہے لیکن تاریخ میں ایسا موڑ بھی آیا جب مذہب کے خود ساختہ ٹھیکیداروں یا مسخ شدہ مذاہب کے علمبرداروں نے انسانوں کی عقلی جولانیوں اور علمی فتوحات کو محدود کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس نتیجہ میں مذہب وسائنس کی وہ طویل کشمکش شروع ہوئی جو دنیا کی علمی تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ اور جس کے نتیجہ میں آج بھی سیاست ومذہب کی آویزش جاری ہے''۔

۴- 'علی گڑھ میگزین' کی ادارت یونیورسٹی کے کسی بھی طالب علم کے لیے باعث اعزاز ہے۔ ۸۶-۱۹۸۵ء کی ادارت کا قرعہ ڈاکٹر منور حسین کے نام نکلا۔ اس مجموعہ میں اداریہ کے علاوہ دو مضامین: تدریس کے بعض مسائل اور گجرات میں اردو کا ارتقاء اس وقت موضوع بحث ہیں۔

منور حسین کی تحریروں کی ایک خوبی حشو وزوائد سے دوری، جب کہ دوسری خوبی بامعنی پیراگرافنگ ہے۔ مرحوم کی تمام تحریروں میں موضوع کا بھرپور احاطہ ہے۔ متعلقہ امور کی بھی بقدر ضرورت نشاندہی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک اہم میگزین کے مدیر کی حیثیت سے اس رسالے میں شعبہ اردو کی ترجمانی کرنے والے مقالات کو جمع کرتے ہیں، مقالات ومضامین میں پائی جانے والی بعض کمزوریوں کی جانچ کرتے ہیں۔ اور ایک مدیر کو جن کٹھن مراحل سے گزرنا ہوتا ہے اس کے تذکرہ سے بھی نہیں چوکتے اور یہ سب نہایت شستہ وشائستہ لہجہ میں کہہ جاتے ہیں کہ کسی کو اپنی پیشانی پر سلوٹ بنانے کا موقع بھی نہیں دیتے۔ ان کے یہ جملے دیکھیں:

مضامین کی فراہمی کے دوران واقعی احساس ہوا کہ مضمون کے لیے وعدہ کر لینا جتنا آسان ہے شاید اس کا ایفاء اس قدر آسان نہیں...۔ میں ان تمام احباب سے معذرت خواہ ہوں جنھوں نے مضامین بالکل ابتداء میں بروقت جمع کیے تھے لیکن غیر معیاری ہونے کی وجہ سے جگہ نہ پا سکے''۔

منور حسین اردو زبان کی ترقی کے خواہاں تھے۔ اس کی زبوں حالی کا نوحہ جگہ جگہ کرتے ہیں، ان کی یہ عبارت دیکھیں:

> ''...... بے موقع نہ ہوگا اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے اردو کی صورت حال پر غور کریں۔ حقیقت پسندانہ جائزہ بتاتا ہے کہ اس ملک میں اردو کا مستقبل شاید کچھ زیادہ تابناک نہیں۔ جس زبان کا رشتہ معاش سے کاٹ دیا جائے تو مادہ پرستی کی موجودہ فضا میں اس کی حفاظت کی ضمانت مشکل ہی معلوم ہوتی ہے۔ کچھ یہی صورت حال اس ملک میں اس زبان کی ہے، اردو کی

ترقی، حمایت، اشاعت اور فروغ کے تمام تر دعوؤں کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے روز بروز اس کا دائرہ سمٹتا رہا ہے، خود اس زبان کے مولد و منشا میں اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ نئی نسل کی بڑی تعداد بڑی تیز رفتاری سے اس زبان سے اپنا رشتہ کاٹ رہی ہے''۔ اس کے بعد اردو ادیبوں کی کیفیت کا ذکر کرتے ہیں جن کی اولاد انگلش اسکولوں میں زیر تعلیم اور افسوس ناک حد تک اردو سے ناواقف و بیزار ہے۔ پھر اردو کے دانا دشمن اور نادان دوستوں کی دشمنی اور سادہ لوحی کا درد سناتے ہیں۔ اس اداریے کا خاتمہ اس خوش خبری پر کرتے ہیں: ملک کی نمائندہ یونیورسٹیز کے اصحاب فکر و نظر نے مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے اس بات کی توقع کی ہے کہ ایک بہتر اور معیاری نصاب اور کتابیں تیار کر دیں۔ یہ ذمہ داری بجائے خود مسلم یونیورسٹی کے اردو شعبہ کے لیے بڑا اعزاز ہے۔ اس اعزاز کی لاج رکھنا خود ایک زبردست چیلنج ہے''۔

۵- علی گڑھ میگزین میں تدریس کے بعض مسائل، آج بھی اپنی افادیت کے لیے قابل استفادہ و مطالعہ ہے۔ اس مقالے کی جامعیت سے احساس ہوتا ہے کہ شعبہ اردو کے حلقہ اساتذہ میں شامل ہونے سے قبل ہی مرحوم منور حسین کی نظر تدریس کے مسائل پر گہری تھی، ان کا تقرر تو ۱۹؍ دسمبر ۱۹۹۲ء میں بحیثیت لکچرار ہوا لیکن درس و تدریس اور ریسرچ و تحقیق کی باریکیوں سے جس حذاقت کے ساتھ اس مقالے میں بحث کی گئی ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۸۶ء میں ہی ان کی علمی شان مستحکم ہو چکی تھی۔ انھوں نے تعلیمی اداروں اور جامعات کو بہتر تدریس کے لیے جو قابل عمل مشورے دیئے ہیں، ان سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ منور حسین ماہرین تعلیم کے معروف حلقے میں شامل ہونے جا رہے تھے۔

اس مقالے میں تدریس و تعلیم کے لیے بہتر نصاب کی تیاری، ادارہ اور اساتذہ کے درمیان بہتر تعلقات کی استواری، طلبہ و اساتذہ کے مابین بے تکلف استفادے کی فضا، متخصصین کو ان کے اختصاصی میدان میں لگانا، درجات میں سوال و جواب کی تحسین کرنا اور تنقید کے ذوق کو فروغ دینا وغیرہ متعدد امور پر شرح و بسط سے گفتگو کی گئی ہے۔

ایک جگہ مشورہ دیتے ہیں کہ معیار تعلیم کو بلند کرنے کے لیے نوع بنوع تجربات کے درمیان یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہر شعبہ میں سنجیدہ اور معیاری طلبہ کی ایک فہرست ہو اور ان سے اساتذہ کی رائیں لی جائیں، اس طرح مفوضہ مضامین پر ان کی دسترس، ان کی تدریس کا انداز اور طلبہ سے سلوک وغیرہ کے معاملہ میں ایک رائے قائم کی جائے اور طلبہ کی اس راز دارانہ رائے (confidential Report) کی بنیاد پر اساتذہ کی ترقی ہو، اس طریقہ کو اختیار کرنے سے نا اہل لوگ، لائق اساتذہ کی راہ ترقی کھوٹی نہیں کر سکتے ورنہ یہ ہوتا ہے

کہ وہ لوگ جو کسی حادثہ کے نتیجہ میں استاد بن بیٹھتے ہیں، انھیں عملاً مطالعہ و تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، ان کی نظروں میں ایسے اساتذہ معیوب ٹھہرتے ہیں جنھیں اپنے پیشے سے محبت ہے اور مطالعہ و تحقیق ان کی عادت اور یہی افراد جب ذمہ دارانہ مناصب پر فائز ہوتے ہیں تو بحیثیت مجموعی پورے نظام تعلیم کو متاثر کرتے ہیں۔ ماہرین تعلیم کی اس رائے کی وکالت کرتے ہوئے رقم کرتے ہیں کہ طلبہ کو سوال و استفسار کے علاوہ تنقید کا بھی حق ملنا چاہیے۔ بلکہ اس جذبہ کی ہمت افزائی ہونی چاہیے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے بسا اوقات اساتذہ پر بھی اپنی غلطی یا نارسائی کا انکشاف ہوتا ہے اور جن کی پردہ پوشی کے لیے امام غزالی کے بقول کم ظرف افراد طول، بارعب اور پیچیدہ تقریروں کا سہارا لیتے ہیں۔ (ص:۶۹)

۶- گجرات میں اردو کا ارتقاء، علی گڑھ میگزین کے صفحات میں مرقوم، منور حسین کا دوسرا وقیع مقالہ ہے۔ موصوف کا یہ وہ دور ہے جب کہ وہ اپنے ایم فل مقالہ ''مولوی چراغ علی کی علمی خدمات'' جمع کر کے فارغ ہوئے تھے اور پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے یکسو ہو چکے تھے۔ مقالہ زیر بحث کے ذریعہ وہ اس شک کا ازالہ کرتے ہیں کہ اردو زبان ہندو اور مسلمانوں کے ارتباط کے نتیجہ میں وجود پذیر ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ خالص ہندوستانی ہے اور مسلمانوں کی آمد کے وقت یہ عوامی زبان تھی۔ انھوں نے اپنی ناگزیر ضرورتوں سے اسے اختیار کیا اور اپنے طور پر لکھنا شروع کیا، مسلمانوں ہی کے اثر سے عربی و فارسی کے الفاظ اس میں شامل ہوئے۔ اس موقف کی تائید میں عہد سلطنت میں بادشاہان، صوفیاء اور پھر عہد مغلیہ میں ہمایوں اور دیگر مشائخ کی قدر افزائی سے یہ زبان پھلی پھولی۔ مہدوی تحریک کے خلفاء کے ذریعہ ہندی/ ہندوی زبان کو مذہبی کتابوں کے لیے استعمال کیا گیا اور اس طرح اسے تقدس بھی حاصل ہو گیا۔ منور حسین نے ابتدائی زمانہ سے اس کے فروغ تک اس زبان کے زیر و بم کو نثر و نظم کی شکل میں پیش بھی کیا ہے اور ناموران گجرات کے نام لیے ہیں جنھوں نے منظوم کلام میں حکایات یا غزلیں پیش کی ہیں۔ اپنی بحث کو اس پیراگراف میں سمیٹتے ہیں:

> ''گیارھویں صدی ہجری/ سترھویں صدی عیسوی کے اواخر تک زبان کا ارتقاء ایک فطری عمل کی حیثیت سے مسلسل جاری رہا۔ ہندوی عوام کی زبان کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوئی اور اسی طور پر پروان چڑھی۔ یہاں اسے نہ تو فارسی کا کما حقہ سہارا ملا تھا اور نہ حکومت کی سرپرستی ہی اسے حاصل ہوئی۔ چنانچہ کچھ مدت تک بہت تیزی کے ساتھ ابھر کر عوامی سطح پر آ گئی۔ اس میں عربی و فارسی کے الفاظ ہی نہیں، محاورے و ضرب الامثال نے بھی جگہ پائی لیکن تلفظ کی حد تک عربی و فارسی کی آوازیں دخیل ہو کر رائج نہ ہو سکیں۔ ان دونوں زبانوں کا یہ اثر ضرور

ہوا کہ ردیف و قافیہ کو ایک حد تک شاعری میں جگہ دی گئی اور بعض ریختے لکھے گئے جنھیں غزل کی ابتدائی صورت کہہ سکتے ہیں''۔

اس عہد کا سب سے بڑا شاعر ولی ہے اس کا تعلق شاہ وجیہ الدین گجراتی کے خاندان سے تھا جس سے گجرات سے ان کا تعلق یقینی معلوم ہوتا ہے۔ تاہم ان کے بارے میں یہ اختلاف برقرار ہے کہ وہ گجرات کے تھے یا اورنگ آباد کے۔ اس کے بعد بھی وہاں شعراء ہوئے ہیں مگر کوئی اہم شاعر جس نے قابل ذکر اثرات چھوڑے ہوں، نہیں ملتا۔''

۷۔ تعلیم: مقصد و منہاج کے زیر عنوان تہذیب الاخلاق ستمبر ۱۹۹۶ء میں ایک تحریری مباحثہ اس وقت کے مدیر عالی نے کرایا تھا، شرکاء بحث میں امتیاز احمد، ڈاکٹر قیصر شمیم، خالد حیدر اور اشفاق احمد عارفی مدعو تھے۔ اس تحریری مباحثہ میں رسالہ کے دو صفحات پر مرحوم کی مختصر بحث اپنی امتیازی شان رکھتی ہے۔ کہتے ہیں آج پوری دنیا میں جو نظام تعلیم رائج و نافذ ہے وہ باستثناء د چند مغرب کے اسی تصور کا زائیدہ ہے کہ انسان بنیادی طور پر ایک معاشی اور جنسی وجود ہے۔ اگر آپ اس فکر سے اتفاق رکھتے ہیں تو آپ کے تمام سوالات بے محل ٹھہرتے ہیں اور آپ کی تشویش بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ سوال وہاں پیدا ہوگا اور تشویش بھی جہاں تعلیم کے بارے میں انسان سے متعلق مغرب سے جداگانہ کوئی سوچ اور فکر پائی جاتی ہو۔ تعلیم اگر انسانی شخصیت کی تہذیب کا سب سے موثر ذریعہ ہے اور انسان محض کوئی معاشی یا جنسی حیوان نہیں ہے تو یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہمارا نظام تعلیم ہماری شخصیت کے کن پہلوؤں کی تہذیب و تزئین کرتا ہے۔ اگر وہ جزوی طور پر ہماری ضرورتیں پوری کرتا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کی یہ نظام تعلیم ناقص ہے اور نظر ثانی کا محتاج ہے۔ اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے آج دنیا میں نظام تعلیم کی تشکیل جدید کی صدائے بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج کی تعلیم جس طرح Commercialised ہو گئی ہے اس کے سمت و رفتار اور منہج و نوعیت کو بدلنے کی کوشش تو ضرور ہونی چاہیے مگر یہ اپنے منطقی انجام تک پہنچ کر ہی اپنے نہج و نوعیت میں تبدیلی پیدا کرنے پر آمادہ ہو سکے گی... ہماری نظر میں وہ تعلیم صحیح معنوں میں تعلیم ہی نہیں جو انسان کی اصل حیثیت کی شناخت میں اس کی مدد نہ کر سکے، اس کو اس کے منصب کا صحیح شعور و احساس نہ دلا سکے۔ تعلیم کا یہی بنیادی نقص ہے جن کے تلخ نتائج فلسطین، بوسنیا، چیچنیا جیسے ملکوں میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ ہیومنزم اور حقوق انسانی کے بلند و بانگ دعوؤں کے باوجود تعلیم یافتہ مراکز سے حقوق انسانی کی پامالی کی جو عظیم الشان روایتیں قائم ہوئی ہیں، وہ تاریخ انسانی کا ایک سیاہ ترین باب ہے۔ علم کا تعلق لوازمات حیات سے جتنا گہرا ہے مقاصد حیات سے اس کا ربط اس سے

کسی درجہ کم نہیں بلکہ بعض اعتبارات سے زیادہ ہی ہے۔ یہ مقاصد حیات ہی ہیں جو لوازمات کا تعین و تحدید کرتے ہیں اور ان کی درجہ بندی میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ اس طرح فرد کی شخصیت کا ہمہ جہتی ارتقاء اور معاشرتی تقاضوں کی تکمیل یہ دونوں ہی تعلیم کے بنیادی مقاصد میں ہمیشہ تسلیم کیے گئے ہیں۔ اب ان مقاصد میں کسی قسم کی تفریق و تجدید ایک مسلمہ حقیقت سے روگردانی کے مترادف ہوگی۔ آج تعلیم جس نہج پر جاری ہے وہ سماجی واجتماعی تقاضوں کی رعایت تو ملحوظ رکھتی ہے، مگر اسے فرد کے شخصی ارتقاء سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

ان اصولوں اور بنیادی نکات سے اتفاق کے بعد ہی وہ مرحلہ آئے گا کہ آج کے منظر نامہ میں زبان وادب، تاریخ و مذہب، سماجیات و سیاسیات جیسے موضوعات کی افادیت و ناگزیریت جیسے مسائل پر بحث کی جائے اور افہام و تفہیم کی کوئی سودمند کوشش انجام پائے''۔

قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ منور حسین کی تحریر اصولی موقف، منطقی استدلال اور موثر نتائج سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ پہلے پیراگراف میں سب سے اہم بات کہہ جاتے ہیں، جس کے لیے آئندہ کے پیراگرافوں میں دلائل لاتے ہیں اور خاتمہ بحث میں اپنے اصولی موقف کی بھرپور وکالت و تکرار کرتے ہیں۔ ان کی تحریر کا یہ وصف بھی قابل قدر ہے کہ اپنی باتوں میں وہ اتنے وزنی دلائل لاتے ہیں کہ انھیں کسی دوسرے مفکر کی سند لانے کی بالعموم حاجت نہیں ہوتی، چنانچہ عمومی تحریروں میں وہ بوجھل اقتباسات سے گریز کرتے ہیں البتہ کسی کی فکر کا مطالعہ یا تنقیدی مضمون میں اقتباسات لاتے ہیں لیکن وہ بھی کم کم اور مختصر مختصر۔

۸- تہذیب الاخلاق، اکتوبر ۱۹۹۶ء میں منور حسین کا ایک نہایت مختصر مقالہ: سرسید کی معنویت کے عنوان سے شائع ہوا۔ صاف عیاں ہوتا ہے کہ دانش ور منور، سرسید کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتے ہیں، وہیں اپنے ممدوح کی فکری نارسائی کا نوحہ بھی کرتے ہیں۔ وہ سرسید کی معنویت کو محض دوٹوک جملوں میں بیان کرنے سے اعراض کرتے ہیں کہ اس کی جہات وابعاد بہت وسیع و عریض ہیں۔ مقدمہ مقالہ یہاں سے شروع کرتے ہیں کہ: سرسید کے نظام فکر و عمل میں سب سے زیادہ اہمیت مسلمانوں میں بالخصوص مغربی علوم وافکار کی اشاعت کو حاصل تھی۔ پھر کہتے ہیں کہ سرسید کی معنویت تلاش کرنے میں بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کی تخلیقی شخصیت ان کے تنقیدی رویے سے ہم آہنگ ہے۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ کسی علم و فن کے بارے میں اصول فراہم کرنے والا خود ان کو برتنے سے قاصر رہتا ہے اور یہ عدم مطابقت یا غیر ہم آہنگی اس کی شخصیت کی عظمت کے لیے مضر نہیں ہوتی۔ اس فکری بحران یا عدم توازن کو اصولی طور پر پیش کرتے ہیں کہ مذہب کی تفہیم و تعبیر میں اصولوں کے انطباق میں انھیں شدید ناکامی ہوئی، جس کی ایک وجہ سائنس سے ان کی حد درجہ مرعوبیت قرار دی جاتی ہے مگر شاید زیادہ صحیح

بات سائنس اوراس کی تفصیلات سے ان کی کلی واقفیت کا نہ ہونا ہے۔ منور حسین کی یہ عبارت دیکھیں:

''...تاہم مذہبی مباحث میں ان کی یہ اہمیت ہمیشہ تسلیم کی جائے گی کہ انھوں نے اپنے عہد کے فکری مستوی کے مطابق مذہبی عقائد واصول، احکام وتعلیمات کی معقول توضیح وتشریح کا راستہ ہموار کیا۔ اردو زبان کے حوالے سے ان کی اس دَین کا اعتراف کیا جائے گا کہ انھوں نے ایک ہدایت نامے کی حیثیت سے قرآن مجید کا یہ حق تسلیم کرایا کہ ہر زمانہ کا انسان براہ راست اسے سمجھنے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اوراس کے واسطے سے خدا تعالیٰ سے اپنا رشتہ استوار کرسکتا تھا''۔

اردو زبان کو جو قوت سرسید نے عطا کی اس کا اعتراف کرنے کے باوصف اسے ذریعہ تعلیم نہ بنانے کے سرسید کے فیصلہ کو منور حسین نا قابل تلافی نقصان قرار دیتے ہیں...اسی طرح کہتے ہیں کہ سرسید کے تصور ادب میں تہذیب واخلاق کے منافی جذبات کا اظہار ایک منافی قدر ہے۔ جب کہ ادب کو وہ قومی ترقی اور اجتماعی اخلاق کی تعمیر کا وسیلہ بنانا چاہتے تھے۔ منور سوال کرتے ہیں کہ ہمارا آج کا ادب جو انسانی قدروں کی شکست وریخت اور مختلف نفسیاتی وسماجی ناہمواریوں کی آئینہ داری کرتا ہے۔ وہ سرسید کے تصور ادب سے کس قدر ہم آھنگ ہے؟ کیا ہمارا موجودہ تصور ادب سرسید کے اس تصور کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے؟ جواب دیتے ہیں: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا تخلیقی رویہ سرسید کی اس مقصدیت کی گرانباری کا متحمل نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس موضوعاتی وسعت کا جو سرسید کے پیش نظر تھی۔

اس مختصر مقالہ کے آخری حصہ میں سرسید کی معنویت کو متحدہ قومیت، کانگریس کے ساتھ عدم تعاون، اور انگریزی حکومت سے وفاداری کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لسانی تنازعے کے آئینہ میں ان کی نگاہوں نے دیکھا کہ اب یہ دونوں فرقے کبھی متحد و متفق نہیں ہوسکتے۔ ان کے درمیان وقت گزارنے کے ساتھ خلیج وسیع ہوتی جائے گی۔ اس پیشین گوئی کو دعوت وتلقین سمجھنا بوالعجبی اور ستم ظریفی ہے! اس ملک میں افتراق وانتشار کا بیج انگریزوں نے بویا، اہل ہند اس کا آلہ کار بنے۔ سرسید کو علیحدگی پسند تحریک کا بانی کہنا در اصل انگریز کی اس حکمت عملی کا حصہ ہے کہ اپنا جرم دوسروں کے سر منڈھ دیا جائے! سرسید کے کانگریس اور انگریزی حکومت کے ساتھ وفاداری وتعاون کے ضمن میں سرسید کے اصول اھون البلیتین (یعنی دو مصیبتوں میں آسان کو گوارہ کرنا) کو انگریزی حکومت کے ساتھ اصولی طور پر منطبق کرتے ہوئے، ڈاکٹر منور سوال کرتے ہیں اور اپنا جواب بھی رقم کرتے ہیں:

''سرسید کے بارے میں یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ انگریزی حکومت کے خاتمہ کو تاریخ کا ایک ناگزیر عمل سمجھتے تھے۔ منور حسین کہتے ہیں کہ سوال یہ ہے کہ آج اس پہلو سے سرسید کے اقدام کا انطباق کیا ہوگا؟ کیا موجودہ حکومت کو انگریزی حکومت کے مماثل سمجھا جائے یا ملک کی اکثریت سے سازگاری کو اس کے ہم معنی سمجھا جائے یا پھر پس ماندہ طبقات یا اعلیٰ طبقات کے ساتھ اشتراک عمل کو۔ سرسید کی فکر غالباً موخرالذکر رویہ کی تائید کرتی''۔

۹- لوح ایام: مختار مسعود منور حسین کے تبصراتی مضامین کا ایک حصہ ہے۔ منور حسین کے وقیع و جامع تبصرے تحقیقات اسلامی میں بھی شائع ہوئے ہیں جو عالمی سطح کا معیاری رسالہ ہے۔ ان کے دیگر تبصرے رفیق منزل، حیات نو، زندگی نو، اردو بک ریویو وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں، جن پر الگ سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ تہذیب الاخلاق میں نئی کتاب کا تعارف کے ذیل میں منور حسین کی اس تحریر کا چھپنا اس بات کی دلیل ہے کہ کتاب شاہکار ہے اور مبصر ادب کا رمز شناس۔ درحقیقت اردو ادب کی دنیا میں مختار مسعود کا قد ان کی علمی وجاہت ہی کی بنا پر ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں رمز و اشارات، تشبیہات و استعارات، تلمیحات و واقعات کی بھرمار کرتے جاتے ہیں اور اپنے ان ادبی محاسن و اسالیب کی روشنی میں صدیوں اور قوموں کی تاریخ کے اوراق پلٹتے جاتے ہیں۔ منور حسین فلاحی نے اس کتاب میں انتساب کے جملوں اور الفاظ کے پیچھے پوشیدہ پردے اٹھائے ہیں۔ وجہ تصنیف کے الفاظ اور جملے اندرون متن سے تلاش کیے ہیں۔ پوری کتاب کا تعارف فصیح و بلیغ انداز میں کرتے ہیں، آپ بھی منور حسین کے چند جملے سنیں:

''سترہ ابواب پر مشتمل اس کتاب کے تین حصے ہیں، شاہنامہ، آمد نامہ، منظر نامہ۔ آٹھ ابواب شاہنامہ کے حصے میں آئے اور سفرنامہ کو پانچ ابواب ملے۔ شاہنامہ ایرانی شہنشاہیت اور آخری شاہ ایران کے احوال، اس کے خلاف روز بروز بڑھتے ہوئے طوفان کا بیان ہے تو آمد نامہ انقلاب ایران کے بعد کا احوال ہے۔ جس کے عناوین میں بازگشت، خانہ جنگی، خوف وخوں اور فرد جرم اور منظر نامہ ایران کے فکری و تخلیقی سرمایوں کا مطالعہ ہے''۔

منور کہتے ہیں کہ مختار مسعود کے اسلوب کا سب سے نمایاں وصف واقعات پر نگاہ عبرت ڈالنا اور اسرار و حکم کو سلیقے سے پیش کرنا ہے۔ عبرت و حکمت کے بے شمار انمول موتیوں کو اس تبصرہ میں حوالہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مبصر، مختار مسعود کے بعض منفرد اسلوب کو بیان کرتا ہے مثلاً ''جب عوام اپنی گردن پر سوار ہونے والوں کو نیچے پٹک دیں تو اس عمل کو انقلاب کہتے ہیں''۔ ''بحث و مباحثہ میں جس کا موقف کمزور ہو اس کا چہرہ

سرخ اور آواز بلند ہوتی ہے''۔ مصنف کا یہ پہلو کہ وہ جس فکر ونظر کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتے ہیں اسے حدیثِ دیگراں کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ فارسی زبان پر مصنف کی قدرت، منفرد ومرکب الفاظ کے فارسی مترادفات اور اردو عبارت میں فارسی اصطلاحات وتراکیب کی پیوندکاری کے مظاہر دکھائے گئے ہیں۔ اس کتاب میں امیر وغریب ممالک کے رویے، غربت وپس ماندگی کی وجوہ، دعوتوں اور ضیافتوں کی قسمیں، ان میں شرکت کرنے والوں کی نوعیت، آداب طعام وکلام پر دلچسپ نکتے، وزیروں، سفیروں سے لے کر کاشتکاروں کے تذکرے، حکمرانوں کی تصویریں، ضد انقلاب کے ساتھ کارروائیاں اور ان سب کی بے شمار زیریں لہریں اس میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر حسین کہتے ہیں کہ بعض مقامات پر ارادی، سنسرشپ کی دست درازیاں تکلیف دہ ہوگئی ہیں۔ کاش مصنف کو اس راز داری کی مجبوری نہ ہوتی۔ خلاصہ کرتے ہیں کہ مسائل کا بصیرت افروز تجزیہ، واقعات میں عبرت کی تلاش، لطیف پیرائے میں درس حکمت، تاریخ کے رازہائے سربستہ کا انکشاف، ناگفتنی کو گفتنی بنادینے کا بلیغ اسلوب اس تصنیف کو بے حد پُرکشش بنادیتے ہیں۔

خاتمۂ بحث

مولانا/ ڈاکٹر منور حسین فلاحی کی مذکورہ ۹ تحریروں کے تعارف سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ مرحوم کو خدا نے غیر معمولی صلاحیتوں سے مالا مال کیا تھا۔ اردو، عربی، فارسی اور انگریزی۔ چار زبانوں پر یکساں قدرت کے نتیجے میں علوم ومعارف کا بہت بڑا ذخیرہ انھوں نے ہضم کرلیا تھا۔ مدرسہ اور یونیورسٹی کے ماحول میں پرورش اور تربیت کے نتیجے میں ان کی فکر میں تطبیق وتوازن کی قدریں جمع ہوگئی تھیں۔ جنھوں نے تنقیدی وتجزیاتی ملکات کو بہت مستحکم اور موثر بنادیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی میں بحیثیت طالب علم اور استاد ان کی یہ چند تحریریں قارئین کے سامنے پیش کی گئیں تاکہ اندازہ ہوسکے کہ کمیت میں مختصر ہونے کے باوجود منور کی ادبی، تحقیقی اور تجزیاتی کیفیت کی شان نہایت اہم اور قابل استفادہ ہے۔ جن کا مزید مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ تخلیقاتِ منور کی طرف مراجعت اس پہلو سے دوچند ہوجاتی ہے کہ ان میں فنی اسالیب کے ساتھ ساتھ معنوی وروحانی محاسن کا ایک سیل رواں ہے جس کا فقدان آج بالعموم اردو ادب کے خالقین کے یہاں بکثرت نظر آتا ہے۔

انٹرویو

مولانا منور حسینؒ فروتنی اور علمی وجاہت کے پیکر تھے

ارشد اجمل
شریک گفتگو: ضیاءالدین فلاحی

[مولانا منور حسین صاحب کے تحریکی ہم سفر جناب سید ارشد اجمل، تاسیسی صدر الخیر چیریٹیبل ٹرسٹ پٹنہ اور سہولت مائکرو فائنانس، دہلی کے چیف آپریٹنگ آفیسر (COO) کو کچھ متعینہ سوالات بھیجے گئے تھے۔ خوشی ہے کہ موصوف نے ٹیلی فونک رابطہ کے ذریعہ اپنے مخصوص انداز میں جوابات دیے۔ جناب ارشد اجمل صاحب ایمرجنسی سے قبل ہی حلقہ طلبہ اسلامی بہار سے وابستہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے مختلف تحریکی امور کے تحت بہت فعال کردار بہار میں ادا کیا ہے۔ وہ ملک گیر ایس آئی او کی تشکیل کے عمل میں شریک رہے۔ (مدیر)]

سوال نمبر۱- آپ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی میں اپنے دو سالہ کورس کی وضاحت کریں۔ کیا منور حسین صاحب کا بھی کوئی علمی و تحقیقی تعلق ادارہ سے تھا؟

سوال نمبر۲- آپ جب علی گڑھ میں تھے اس زمانہ میں طلبہ تنظیم ایس آئی او کا وجود ہوا۔ اپنی تحریکی زندگی میں مولانا منور حسین کی بابت اظہار خیال کیجیے۔ یونیورسٹی کی سطح پر سنا ہے کہ تنظیم کو روشناس اور متعارف کرانے میں آپ بھی کافی یکسو تھے۔ آپ کے ساتھ اور کون سے احباب تھے۔ کن کن ہالوں میں منور حسین صاحب کے دروس و خطابات ہوا کرتے تھے؟

سوال نمبر۳- کیا حلقہ طلبہ اسلامی بہار سے مولانا منور حسین صاحب کا کسی طرح کا تعلق تھا؟ ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحبؒ (۱۹۱۸ء-۱۹۹۸ء) کے معنوی شاگردوں کے ساتھ منور صاحب کا کیسا تعلق تھا؟ کیا حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے اجتماعات میں مولانا منور حسین صاحب کبھی شریک ہوئے؟ خلاصہ یہ ہے کہ بہار کی تحریک اسلامی کے ساتھ ان کا کیا کوئی تعلق تھا؟

سوال نمبر۴- ایس آئی او کی تشکیل کے بعد مولانا منور حسین صوبہ یوپی کے سکریٹری منتخب کیے گئے۔ آپ

بھی ZAC کے ممبر منتخب ہوئے۔اس دور میں مولانا کی تحریکی سرگرمیوں کی بابت کچھ روشنی ڈالیں؟

سوال نمبر ۵- کیا وہ رفیق منزل کے ایڈیٹر تھے،ان کے اداریے/تحریریں کس قسم کی ہوا کرتی تھیں؟ کیا وہ تحقیقات اسلامی کی ایڈیٹنگ بھی کرتے تھے۔اپنی معلومات سے ہمیں روشناس کریں۔

سوال نمبر ۶ -بحیثیت انسان آپ نے انھیں کیسا پایا؟ بعض مشاہدات وتجربات بیان کریں۔

جناب ارشد اجمل صاحب نے مذکورہ سوالات کے الگ الگ جوابات کے بجائے درج ذیل عنوان کے تحت گفتگو۔

۱- میری زندگی کا فیصلہ کن موڑ

والد گرامی سید اجمل حسین صاحب جو بہار الیکٹریسٹی بورڈ کے ڈائریکٹر تھے، کی خواہش تھی کہ میں میڈیکل یا انجینئرنگ لائن اختیار کروں۔انجینئرنگ کے بالمقابل میڈیکل کا اس وقت بول بالا تھا۔ میں نے والد گرامی سے صاف کہا کہ آرٹس یا فلسفہ وغیرہ کی طرف طبیعت راغب ہے۔انھوں نے میری رائے کو پسند نہیں کیا لیکن اجازت مرحمت فرمادی۔ چنانچہ پٹنہ یونیورسٹی میں ایم اے انگریزی سال آخر کر رہا تھا کہ اسی زمانہ میں حلقہ طلبہ اسلامی بہار کا ایک تربیتی اجتماع منعقد ہوا۔مولانا سید جلال الدین عمری حفظہ اللہ کی تقریر تھی اور اس تقریر نے ایک فیصلہ کن اثر مجھ پر طاری کر دیا۔انھوں نے دوران تقریر کہا:

اگر ابھی تک آپ لوگ نور اور الحسنات ہی کے قاری بنے رہے اور آگے نہیں بڑھ رہے ہیں تو آپ کی علمی شناخت قائم نہیں ہوگی۔آگے بڑھیے اور مستحکم لٹریچر کا مطالعہ کیجیے!

مولانا کی اس تقریر نے مجھے غور کرنے پر مجبور کیا۔انھوں نے سوچنے اور راہ متعین کرنے کا ایک پیمانہ دیا۔ چنانچہ ایک طرف حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے سامنے دیگر امور کے ساتھ یہ چیلنج تھا کہ میڈیکل کوچنگ سے وابستہ طلبہ کے مسائل کو کیسے حل کیا جائے؟ دوسری طرف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے تعلیمی افکار میں 'قتل گاہوں' کی بحث کا استدلال کافی مضبوط تھا۔ان سب سے متاثر ہو کر میں نے ایم اے انگریزی سال آخر کو ادھورا اور ناقص چھوڑا اور ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی ، پان والی کوٹھی میں دو سالہ 'تصنیفی وتربیتی کورس' کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کورس مکمل کرنے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی سے ریگولر ایم اے تو نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ گیپ دکھانے سے جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا۔ چنانچہ مگدھ یونیورسٹی سے پرائیویٹ ایم اے انگلش کیا۔قابل ذکر یہ ہے کہ میرا دوست جو پٹنہ

میں میرا کلاس فیلو تھا، وہ دوران امتحان Invigilator کی ذمہ داری ادا کر رہا تھا کیوں کہ اس کا وہاں تقرر ہو گیا تھا۔

۲-مولانا منور حسین فلاحی صاحب میرے معلم اور میرے تحریکی ہم سفر تھے

یہاں سے منور حسین صاحب کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ ہوا یوں کہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ کے دو سالہ کورس میں گریجویٹ کو عربی سکھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا، چنانچہ مولانا جلال الدین عمری صاحب نے پہلے صباح الدین ملک فلاحی صاحب کو میرے لیے عربی کا استاد مقرر کیا۔ انھوں نے مجھے اسباق النحو اول اور دوم پڑھایا اور تحفۃ الاعراب بھی۔ پھر غالباً یکسوئی کی تلاش میں وہ موتی پور بہار جانا چاہتے تھے، چنانچہ وہ اس سلسلہ کو مزید جاری نہیں رکھ سکے۔ اب مولانا نے منور حسین صاحب کو میرا استاد مقرر کر دیا۔ صباح الدین صاحب نہایت محکم انداز میں پڑھاتے تھے، جب کہ منور حسین Pedagogic کا طریقۂ تدریس اختیار کرتے تھے اور درس کو دلچسپ اور سادہ بناتے تھے۔ دونوں ہی میرے تحریکی ساتھی بھی تھے اور میرے استاد بھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ راشد نیر صاحب، جاوید علی صاحب اور مولانا سعود عالم قاسمی صاحب ادارہ سے وابستہ ہو رہے تھے، جب کہ دوسری طرف ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ادارہ کا کورس مکمل کر کے ادارہ سے رخصت ہونے والے تھے۔ میرے کورس کا زمانہ ۱۹۸۳ء-۱۹۸۴ء تھا۔

۳-ان کا علمی و تحقیقی انداز و معیار بلند تھا

میری طالب علمی کے زمانے میں جن اساتذہ اور محققین سے میری ملاقاتیں رہیں، وہاں میں نے وہ اعلیٰ معیار نہیں دیکھا جو مجھے منور حسین صاحب کی ذات میں محسوس ہوا۔ میرے حلقۂ احباب میں بس تحقیق برائے تحقیق کا رواج تھا۔ لیکن یہاں تحقیق اپنے روح و معنی کے ساتھ تھی۔ مولانا منور حسین نے جس عنوان پر پی ایچ. ڈی. کی وہ تھی: اردو میں علمی نثر (۱۹۱۴ء-۱۸۵۷ء) (سماجی علوم کے حوالے سے) ان کی تھیسس کے ذریعہ ریسرچ و تحقیق کا ایک معیار متعین ہوتا ہے۔ وہ نہایت عزم بالجزم کے ساتھ اردو زبان وادب کی ترقی کے ادوار، ان کی خصوصیات و اسالیب پر گفتگو کرتے تھے۔ ان کی تحقیقات میں ایک مقصدیت جھلکتی تھی۔ وہ ہر بات دلیل کے ساتھ کرتے تھے۔ حوالے فراہم کرتے تھے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ Clarity ان کے یہاں بہت تھی۔ میں نے اپنے ہم عصر ساتھیوں کو اتنا واضح اور کلیر نہیں پایا۔ ان کے یہاں شک وشبہ کے بجائے عزم و یقین کی فضا پائی جاتی تھی۔ یہ سن کر خوشی ہو رہی ہے کہ ان کی تھیسس چھپ کر منظر عام پر آنے والی ہے۔ یقیناً علم و تحقیق میں وہ ایک اضافہ ہوگی۔

۴- اختلافی امور میں مخالف رائے کا احترام کرتے تھے

میرے اوپر ان کی خصوصیات میں سے چند نے بہت گہرے اثرات ڈالے اور میں نے انھیں قبول کیا اور برتا بھی۔ چند واقعات کے ذریعہ واضح کرسکوں گا۔ مثلاً ایک بار ایس آئی او کا آل انڈیا انتخاب ناگپور میں محترم مولانا ابواللیث اصلاحیؒ، امیر جماعت اسلامی کی نگرانی میں ہورہا تھا، میں بھی زیڈ اے سی (یوپی) کی طرف سے اس انتخابی مجلس کا ایک ممبر تھا۔ تمام لوگوں نے ایک نام پر تقریباً اتفاق کرلیا تھا۔ لیکن میں تنہا تھا جو اختلاف کررہا تھا اور اپنے اختلافی نوٹ کو درج کروانا چاہ رہا تھا، لیکن مولانا ابواللیث صاحبؒ کا اصرار تھا کہ اتفاق رائے سے لکھا جائے اور میں بضد تھا کہ میرا نوٹ درج کیا جائے تاکہ ایک اچھی روایت قائم رہے۔ مولانا بار بار ناراض ہورہے تھے۔ اور میں بار بار اصرار کررہا تھا۔ ایسے میں مولانا منور حسین بھی کھڑے ہوگئے۔ اگرچہ کہ میری رائے سے ان کی رائے مختلف تھی لیکن انھوں نے کہا کہ میرا بھی اختلافی نوٹ لکھا جائے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ آپ اختلافی نوٹ لکھوانا کیوں نہیں چاہتے؟ ان کی اتباع میں جناب عبدالسلام، کرناٹک نے بھی اختلافی نوٹ درج کرایا۔ اصل یہ ہے کہ مولانا منور حسین صاحب کے اندر اختلافی امور میں اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی اعلیٰ قدر پائی جاتی تھی۔ وہ بہت معتدل اور متحمل مزاج تھے۔

دوسرا واقعہ: وہ شوریٰ کے ناجائز مطالبات کو یکلخت رد نہیں کرتے تھے بلکہ احسن طریقہ اختیار کرتے تھے۔ ایک بار یوپی ایس آئی او کی مجلس شوریٰ میں جب کہ وہ سکریٹری حلقہ تھے، ایک مسئلہ میں گرما گرم بحثیں ہوئیں اور لوگ اپنی رائے کو منوانا چاہتے تھے اور منور حسین صاحب تنہا ہوگئے اس مسئلہ کو نہایت خوبصورتی سے حل کرتے ہیں، کہتے ہیں آپ لوگ جس تیز رفتاری کے ساتھ بول رہے ہیں میرے لکھنے کی رفتار اتنی تیز نہیں ہوسکتی ہے۔ اطمینان سے نوٹ تیار کرنے دیں۔ چنانچہ مجلس میں ایک سکوت طاری ہوگیا۔ دراصل وہ میزان کو قائم رکھتے تھے۔ اختلافی امور میں بھی وہ توازن کو قائم رکھتے تھے۔

ایک تیسرا واقعہ مرزا غالب کالج، گیا کا ہے، ان کے عزیز وقریب رشتہ دار وہاں کے پرنسپل تھے۔ ان کے اور انتظامیہ کے درمیان کچھ امور پر اختلاف ہوگیا۔ اس نازک موقع پر مولانا منور حسین صاحب جب کبھی گیا آتے تو ٹھہرتے تھے اپنے انہی رشتہ دار کے پاس، جن سے ہم لوگوں کو شکایات تھیں۔ اور باقی سارا وقت وہ ہم لوگوں کے درمیان ہی گزارتے تھے۔ اور ان کے خلاف بھی باتیں پوری توجہ سے سنتے تھے۔ اس طرح وہ رشتوں کو نبھانا بھی جانتے تھے۔ وہ دوست ورفیق اور رشتہ داروں میں عملی توازن کی مثال تھے۔ میری زندگی

میں اس نازک گھڑی میں جس شخص نے یہ عملی توازن قائم کر کے دکھایا وہ مولانا منور حسین صاحب کی ذات ہے۔ یعنی دوست و رفیق کے درمیان رہنا، ان کی شکایات سننا اور جس رشتہ دار سے دوستوں کو شکایت ہے اسی کے یہاں مہمان بن کر رہنا اور قیام کرنا۔

۵- ڈاکٹر منور حسین توازن، فروتنی اور علمی وجاہت کے پیکر تھے

ڈاکٹر منور حسین صاحب جیسی شخصیات میری زندگی میں کم نظر آئیں یا نہیں نظر آئیں۔ دورانِ قیام علی گڑھ ایس آئی او کے رفقاء میں پروفیسر محمد ادریس، راشد نیر بھائی، پروفیسر سرور احمد اور صباح الدین ملک صاحب میرے نمایاں ساتھی تھے۔ مولانا منور حسین صاحب کی تقریریں اور دروس قرآن مختلف ہالوں میں ہوا کرتے تھے جس طرح میرے مذکورہ ساتھی اس مہم میں پیش پیش تھے، میں بھی بیشتر ہالوں میں دروس پیش کرتا تھا۔ ان کی تحریر وتقریر کے ضمن میں صرف یہ یاد رہ گیا کہ وہ تحقیقی مزاج رکھتے تھے۔ علمی غرور سے کوسوں دور تھے۔ بات دلائل کے ساتھ کرتے تھے۔ فروتنی اور علمی وجاہت ان کی شان تھی۔ وہ تحریک اسلامی کا قیمتی سرمایہ تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے حسنات کو قبول کرے اور رفقاء تحریک کو ان کی خوبیوں سے استفادہ کی توفیق دے۔ آمین

ڈاکٹر منور حسینؒ کو دیکھ کر میں نے جماعت کی رکنیت اختیار کی

محمد ادریس
شریک گفتگو: ضیاء الدین فلاحی

[پروفیسر محمد ادریس، سابق چیر مین شعبۂ کیمیکل انجینئر نگ وسابق ڈین فیکلٹی آف انجینئر نگ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے راقم نے چند سوالات کیے۔ خوشی کا مقام ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قدیم تحریکی شناور جن کا تعلق ایس آئی ایم، ایس آئی او اور جماعت اسلامی، تینوں سے مختلف اوقات میں امیر و مامور کا تھا، نے ان سوالات کو پسند کیا اور اپنے ملے جلے تاثرات کا اظہار کیا۔ ان کی گفتگو کا ماحصل قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ (مدیر)]

سوال نمبر ا- آپ کی ڈاکٹر منور حسین فلاحی سے ملاقات کب اور کس طرح ہوئی۔ یونیورسٹی میں ان کی سرگرمیاں کیا تھیں؟

سوال نمبر ۲- منور حسین فلاحی کو مدرسے کے فارغ اور ایک مسلمان کی حیثیت سے آپ نے کیسا پایا؟ ان کے اخلاق و کردار اور قول و عمل پر روشنی ڈالیں؟

سوال نمبر ۳- دعوت دین کی تبلیغ و اشاعت میں ان کے کردار پر روشنی ڈالیں۔ ان کی تحریکی زندگی کا احاطہ بھی کریں؟

سوال نمبر ۴- ایس آئی او کی مقامی یا ریاستی میٹنگوں میں غالباً آپ ان کے شریک کار رہے ہیں، ان کے بحث و دلائل کے انداز پر اظہار خیال کریں؟

سوال نمبر ۵- ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی پان والی کوٹھی سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا۔ علم و تحقیق سے متعلق ان کی زندگی کے کسی گوشے/ واقعے کی یاد تازہ کریں؟

سوال نمبر ۶- مولانا سید جلال الدین عمری حفظہ اللہ صدر ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی و مدیر تحقیقات اسلامی، سے ان کے تعلقات اور علمی استفادے کی کوئی یادداشت شیئر کریں؟

سوال نمبر ۷-تحریکی ساتھیوں کے لیے ان کی زندگی میں کون سے پہلو قابل تقلید و نمونہ ہیں؟

مولانا منور حسینؒ سے میرے تحریکی روابط ۱۹۸۲ء سے شروع ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ میں آئی آئی ٹی کانپور سے انجینئرنگ مکمل کر کے شعبہ کیمیکل انجینئرنگ میں بحیثیت لکچرار، مسلم یونیورسٹی میں آیا تھا۔ کانپور کے زمانہ قیام میں ایس آئی ایم کی پہلی ۹ رکنی ٹیم میں انصار تھا۔ میرا فارم برائے انصار ڈاکٹر محمد رفعت صاحب نے منظور کیا تھا، جو اس زمانہ میں اس تنظیم کے قیام کے اولین لوگوں میں سے تھے۔ جب میں یہاں آیا تو علی گڑھ کے تحریکی حلقے میں ایک جوش کا سماں بندھ گیا۔ چند دنوں کے لیے ایس آئی ایم کا صدر یونٹ بھی رہا۔ لیکن جونہی ایس آئی او کی بنیاد رکھی گئی تو میں اور صباح الدین ملک صاحب اس تنظیم سے الگ ہو کر جماعت اسلامی کی برپا کردہ تنظیم سے وابستہ ہو گئے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ کانپور میں تبلیغی جماعت کا سرگرم کارکن تھا چنانچہ ملک کے طول و عرض میں طویل چلے بھی لگائے تھے۔ لیکن غور و فکر کے بعد جب تبلیغی جماعت کو الوداع کہا تو دہلی اور لکھنؤ کا وفد سمجھانے آیا، میری میز پر تفہیم القرآن اور اسلام کا نظام حیات نیز دیگر چیزوں کو دیکھ کر اس کمیٹی نے رپورٹ دی: یہ گمراہ ہو گیا ہے اب یہ ہمارے کام کا نہیں رہا۔

یہاں مسلم یونیورسٹی میں ایس آئی او کے قیام کے بعد ایس آئی ایم کے مابین بھی کچھ تلخی ہو گئی۔ بالآخر مولانا سید جلال الدین عمری صاحب کی صدارت میں ایک تفہیمی نشست ہوئی اور معاملہ رفع دفع کیا گیا۔ اس وقت برادر تنظیم کے مقامی صدر پروفیسر عبیداللہ فہد فلاحی صاحب تھے۔

منور حسین صاحب کو میں نے امیر و مامور دونوں حیثیتوں میں دیکھا۔ میں نے انھیں بنیادی طور پر فارغ التحصیل کی حیثیت میں مدرسہ کی آبرو کا تحفظ کرنے والا پایا۔ وہ اپنی وضع قطع، بود و باش، طرز رفتار و گفتار اور قول و فعل کے دھنی تھے۔ ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۸ء ایس آئی او میں میری ان کے ساتھ رفاقت رہی۔ میں یہاں ایس آئی او کا صدر یونٹ تھا اور وہ میرے ماتحت، پھر وہ صدر حلقہ یوپی بنائے گئے۔ ان تمام ایام میں وہ نہایت منکسر المزاج، تکبر اور نمود و نمائش سے بے گانہ رہے، شیریں کلامی ان کا امتیازی وصف تھا۔ وہ تحریری گفتگو کیا کرتے تھے۔ جچی تلی گفتگو نہ کم نہ زیادہ۔ وہ مجھ سے کبھی میرے چیمبر میں آکر کہتے کہ یوپی کے مختلف اضلاع میں ایس آئی او کے قیام کے لیے دورہ کر لیجیے، کبھی کہتے کہ یونیورسٹی کے فلاں فلاں ہال میں تنظیم کے قیام کے لیے طلبہ سے ملاقاتیں کر لیجیے۔ ان کے خلوص اور کام لینے کے خوبصورت انداز کے سامنے سپر ڈالنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوتا۔ وہ کم عمر ہو کر بھی بڑوں اور بزرگوں سے کام لینے کا سلیقہ جانتے تھے۔ وہ آداب گفتگو اور مزاج کی

رعایت کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی تحریک اور دعوت پر فیروزآباد، شکوہ آباد، کراولی، مین پوری، ایٹہ، میران پورکٹرہ، شاہجہاں پور، بدایوں جا کر دعوتی کام کی توفیق ملی۔ یہاں یونیورسٹی کا شاید ہی کوئی کمرہ اور ہاسٹل باقی رہ گیا ہو جہاں دعوتی پیغام نہ پہنچایا گیا ہو۔ منور حسین مرحوم انفرادی ملاقاتوں پر زور دیا کرتے تھے۔ میرے ساتھ ارشد اجمل صاحب، راشد احمد صاحب، صباح الدین صاحب، جاوید علی صاحب، عبدالقادر صاحب وغیرہ کی ٹیم رہا کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ تدریسی مصروفیات سے فارغ ہوکر گھر/کمرہ جانے کے بجائے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق کسی نہ کسی ہال میں جاتے تھے اور یہ سلسلہ ہفتے کے تمام دنوں میں جاری رہتا تھا۔ کبھی تار بنگلہ والی مسجد ہم لوگوں کی اجتماعی سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے میں ہمارے ہفتہ وار پروگرام بہت جامع ہوا کرتے تھے اور منور حسین مرحوم کی شخصیت نے ان اجتماعات کو مزید نکھارا اور سنوارا۔ ان کے دروس قرآن اور تقاریر علمی شان سے مزین اور اثر انگیزی سے آراستہ ہوتے تھے۔ وہ ہمہ گیر علمی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ مرحوم ہر موضوع پر کمال وقدرت کے ساتھ گفتگو کرتے تھے، سامعین ان کی تقریروں سے محظوظ ہوتے اور علم ومعرفت کا خزانہ نیز حوصلہ وعمل کی سوغات لے کر اٹھتے تھے۔

مرحوم منور حسین ایک بار کہنے لگے کہ تبلیغی اجتماعات جو کبھی کبھی بہت مختصر ومعمولی ہوتے ہیں لیکن وہ نقد وصولی کرتے ہیں، کیوں نہ ہم بھی اپنے اجتماعات/نماز کے بعد ایک اعلان کریں کہ جو ہماری دعوت سے متفق ہو چکا ہے وہ ہمارے ساتھ آئے اور ہم اس کی تربیت کا انتظام کریں۔ وہ اجتماعات کی نقد وصولی کی بات کیا کرتے تھے۔

۱۹۸۸ء میں جب ایس آئی او کی رکنیت سے فارغ ہوا تو مولانا سید جلال الدین عمری صاحب کے دروس میں شرکت کرتا، ان کے دروس ہمارے تمام ساتھیوں کو متاثر کرتے تھے۔ منور حسین صاحب مولانا جلال الدین صاحب سے کچھ زیادہ قریب تھے شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ طلبہ تنظیم میں رہتے ہوئے وہ رکن جماعت بن چکے تھے۔ اور تحقیقات اسلامی میں کچھ مقالات لکھتے اور تصحیح وتصویب کا کام بھی کرتے تھے۔ اس دوران، میں جماعت اسلامی کی رکنیت کے تعلق سے کچھ متردد تھا لیکن بالآخر مولانا منور حسین کے خلوص وللّٰہیت، تقویٰ اور انسانیت وشرافت کو دیکھ کر میں نے ۱۹۹۱ء میں رکنیت کا فارم پُر کردیا جو جلد ہی منظور ہو گیا۔

آخری زمانہ میں مرحوم ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ ان کا ادارے سے کوئی باضابطہ تعلق نہیں تھا، تاہم مولانا جلال الدین عمری صاحب نے ایک مکان میں اُنھیں رہنے کی اجازت

دے دی تھی۔ جس پر ادارے کے بعض رفقاء کو اندرون خانہ شکایت تھی، حساس طبیعت کے مالک منور حسین صاحب کے ذہن پر اس کا منفی اثر پڑا۔ ۱۹۹۴ء میں ان کا تقرر شعبہ اردو میں بحیثیت لکچرر ہو گیا تھا لیکن آخری زمانہ میں بعض اندیشوں نے ان کی صحت پر ناخوشگوار اثرات ڈالے جس سے وہ نکل نہیں سکے۔ ذاتی طور پر ان کے انتقال کے بعد میں کافی پریشان رہا۔

تحریکی ساتھیوں اور عام انسانوں کے لیے ان کی زندگی میں کافی اسباق ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ بلا کے محنتی اور فرض شناس تھے۔ تحریک اسلامی کے مخلص کارکن تھے۔ عہد وفا کو عزم بالجزم کے ساتھ نبھاتے تھے۔ تصنع، بناوٹ اور نام ونمود اور شہرت کی بھوک سے کوسوں دور تھے۔ وہ اسلام کے سچے اور پکے سپاہی تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے حسنات کو قبول فرمائے اور درجات کو بلند فرمائے۔ آمین

''اسلام کے عقائد ہوں یا اعمال وہ فطرت انسانی سے سب سے زیادہ قریب ہیں اور عقل انسانی کو سب سے زیادہ اپیل کرنے والے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلام انسانوں کے خالق کا طے کردہ نظام ہے۔ اسلام کو جب ہم ایک نظام مانتے ہیں تو آپ سے آپ اس میں نظم و تنظیم کا پایا جانا اور انتشار وافتراق کا دور ہونا واضح اور ثابت ہو جاتا ہے۔ جو شخص اسلامی عقائد کو مان لیتا ہے اس کے لیے اسلامی اعمال کی پابندی ضروری ہو جاتی ہے اور جو شخص انہیں نہیں مانتا اس پر وہ احکام عائد نہیں ہوتے۔ اسلام نے اپنے عقائد کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی آزادی تمام انسانوں کو دی ہے۔ لیکن وہ اس کا روادار ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص اسلامی عقائد کو تسلیم کر لینے کا اعلان بھی کر دے اور اس کے احکام کی بجاآوری میں آزادی واختیار کا رویہ بھی اپنائے، جو حکم اس کو مفید یا معقول معلوم ہو اس پر عمل کرے اور جو غیر مفید یا غیر معقول نظر آئے اسے نظر انداز کر دے۔''

(**ڈاکٹر منور حسین فلاحی**، اداریہ ماہ نامہ رفیق منزل اگست ۱۹۸۹ء]

تعزیت نامے

منور حسین فلاحی کی رحلت پر

صدر تنظیم جناب سید سعادت اللہ حسینی کا تعزیتی بیان

برادر منور حسین فلاحی صاحب، سابق مدیر رفیق منزل پرنٹر پبلشر کے اچانک انتقال پر صدر تنظیم جناب سید سعادت اللہ حسینی صاحب نے اپنے تعزیتی بیان میں گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے مرحوم کی گراں قدر خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

صدر تنظیم نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ برادر موصوف کی اچانک رحلت سے تحریک اسلامی ایک جواں عمر عالم دین اور محقق سے محروم ہوگئی اور ایس آئی او اپنے ایک مشفق کرم فرما کی گراں قدر خدمات سے محروم ہوگئی۔ مرحوم اپنی علمی گہرائی، سنجیدگی ومتانت اور تحریک اسلامی کے لیے اپنی قربانیوں کے باعث نوجوانوں کے لیے ایک نمونہ تھے۔ گرچہ انہیں ایس آئی او سے رخصت ہوئے تقریباً دس برس ہو گئے تھے، لیکن ایس آئی او اور اس کے کاموں سے ان کی گہری دلچسپی برقرار تھی۔ خاص طور پر ادارۂ رفیق منزل کے تو وہ آخر دم تک پرنٹر پبلشر کی حیثیت سے سرپرستی فرماتے رہے اور اس کی تمام تر قانونی ذمہ داری قبول کی۔

صدر تنظیم نے دعا فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی خدمات جلیلہ کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ اس کا شایان شان اجر عطا فرمائے۔ ان کی لغزشوں کو درگزر فرمائے اور پسماندگان کو خاص طور پر ان کے معمر والدین، ان کی زوجۂ محترمہ اور ان کے معصوم بچوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

(بشکریہ رفیق منزل، اکتوبر ۲۰۰۰ء)

ڈاکٹر منور حسین فلاحیؒ کا حادثہ جانکاہ

انیس احمد فلاحی مدنی

ڈاکٹر منور حسین فلاحی مرحوم جگر کی خرابی کی بنا پر ۱۸ر ستمبر ۲۰۰۰ء کی شب میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کے انتقال کی خبر جامعہ میں بڑے ہی رنج وغم کے ساتھ سنی گئی۔ ہر چہرہ پر اداسی کی تحریریں نمایاں تھیں جو اس چھپے ہوئے طوفان غم کی غمازی کر رہی تھیں۔

مرحوم جامعۃ الفلاح کے قدیم فارغین میں سے تھے، جامعہ سے فراغت (فضیلت ۱۹۷۶ء) کے بعد آپ نے مختلف مکاتب ومدارس میں تدریسی فرائض انجام دیے لیکن حصول علم کے جذبہ نے مشہور عصری دانش گاہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں جانے پر مہمیز لگائی اور آپ نے وہاں سے اردو میں امتیازی نمبروں سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی۔ پی ایچ ڈی کے بعد وہیں شعبہ اردو میں لکچرار ہو گئے۔ مرحوم کی اردو ادب اور تاریخ پر گہری نظر تھی۔ مختلف دینی، علمی وادبی پرچوں سے آپ کا تعلق تھا۔ ایک عرصہ تک تحقیقات اسلامی سے وابستہ رہے۔ ماہنامہ رفیق منزل کے تین سال ایڈیٹر رہے۔ اردو بک ریویو میں کتابوں پر آپ کے تبصرے برابر آتے رہے۔

انجمن طلبۂ قدیم کی شوریٰ کے بھی آپ متعدد بار رکن رہے اور انجمن کی تعمیر وترقی میں آپ کا زبردست رول رہا۔ جب جب انجمن یا انجمن کی کسی یونٹ نے آپ کو یاد کیا آپ اپنی تمام مصروفیتوں کو چھوڑ کر جامعہ تشریف لائے اور اس کے منصوبوں کو روبہ عمل لانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے طلبہ ہوں یا جامعہ کے فارغین ہر جگہ آپ کو مقبولیت حاصل تھی۔ آپ کی مقبولیت ومعنویت کے اسباب میں آپ کے کریمانہ اخلاق اور متواضعانہ سلوک کا کافی دخل تھا۔ مرحوم بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ چند نمایاں خوبیاں یہ تھیں۔

سادگی

سادگی موصوف کا ایک نمایاں وصف تھا۔ لباس، غذا ہر چیز میں سادگی نمایاں تھی۔ معمولی چپل اور سادہ کپڑے پہنے ہوئے یونی ورسٹی کے جملہ مقامات پر نظر آتے تھے۔

تواضع وخاک ساری

تواضع وخاک ساری موصوف کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بڑوں کا ادب واحترام ہمیشہ ملحوظ

رکھتے۔علمی اعتبار سے ایک بلند پایہ ادیب اور مشہور انشاپرداز تھے۔لیکن علمی غرور پندار کبھی آپ کولاحق نہ ہوا کیوں کہ آپ صحیح علم اور سچے ایمان سے بہرہ ور تھے اور سچا ایمان اور صحیح علم انسان کوادب وتہذیب سکھا تا اور متواضع بنا تا ہے۔اہل علم وایمان جس قدر کمالات ومراتب میں ترقی کرتے ہیں اسی قدر جھکتے اور اپنے کوناچیز سمجھتے ہیں۔اسی لیے اللہ تعالیٰ ان کے درجات اورزیادہ بلند کرتا ہے۔

اسلامی تہذیب وتمدن سے وابستگی

موصوف اسلام کوایک مکمل نظریۂ حیات مانتے تھے۔جوعقائد،عبادات،احکام،عدلیہ،حدود وتعزیرات، اخلاق وادب اوراخلاص وتزکیہ سب کواپنے اندرسموئے ہوئے ہے۔چنانچہ اسلامی تہذیب اوراسلامی لباس سے وابستگی تاحیات برقرار رہی۔مغربی لباس سے ہمیشہ اجتناب کرتے رہے کیوں کہ آپ کوخوب معلوم تھا کہ اس کو اختیار کرنا غلامانہ ذہنیت کی علامت ہے۔اورانسان خارج میں کسی شے کواس وقت تک اختیار نہیں کرتا جب تک داخل میں دل کی دنیا میں اس کو پسند نہ کرے۔پھر دل کی پسند کا معاملہ عجیب ہوتا ہے۔وہ کسی ایک مقام پرنہیں ٹھہرتی۔بلکہ مسلسل پیش قدمی جاری رہتی ہے۔لیلیٰ جب پیاری ہوتی ہے لیلیٰ کا کتا بھی پیارا ہوتا ہےاور پھراس معاملہ میں وہ کسی شخص کی ڈانٹ ڈپٹ اورزجروتوبیخ کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔وہ آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

تقویٰ اورللّٰہیت

مرحوم کی پوری زندگی اخلاص وللّٰہیت سے عبارت تھی۔صوم وصلوۃ کی پابندی،اسلامی شعائر کا احترام اور اسلامی احکام کی بجاآوری میں آپ ضرب المثل تھے۔سفر وحضر ہرجگہ اللہ کو یاد کرتے رہتے۔مختصراًاگر یہ کہا جائے کہ آپ اس حدیث:''**لا یزال لسانک رطبا بذکر الله**'' کے مکمل مصداق تھے تو بے جانہ ہوگا۔

موصوف نحیف دبلے پتلے تھے۔رنگ گورااور قد لمبا تھا۔چہرے پر گھنی اور لمبی داڑھی تھی۔چلتے تیز قدم تھے۔چوڑا پاجامہ کرتا اورٹوپی عام لباس تھا۔موسم کے لحاظ سے شیروانی بھی پہنتے تھے۔خط نفیس اورعمدہ تھا۔ گفتگو کا انداز انتہائی شیریں اور دل کش تھا۔انداز تدریس اشتراجی اور محاضراتی تھا۔مرحوم کا تعلق بہار کے مردم خیز علاقہ پیپرالطیف(کھگڑیا) کےایک معروف گھرانے سے تھا۔آپ نے کی۔سب سے مشہور کتاب 'مولوی چراغ علی حیات وخدمات' ہے۔جسے خدابخش اورینٹل لائبریری پٹنہ نے شائع کیا ہے۔

(ماہ نامہ حیات نو،اکتوبر۲۰۰۰ء)

تعزیتی قرارداد شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر منور حسین کا ۱۷/۱۸ستمبر ۲۰۰۰ء کی درمیان شب میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ چند روز قبل انہیں بخار آیا تھا اور حالت اتنی خراب ہوگئی کہ میڈیکل کالج کے اسپتال میں داخل ہونا پڑا لیکن ابھی صحیح طور سے مرض کی تشخیص بھی نہ ہونے پائی تھی کہ پیغام اجل آ پہنچا۔

ڈاکٹر منور حسین کی ولادت یکم جولائی ۱۹۵۹ء کو کھگڑیا (بہار) کے قصبہ پیپرالطیف میں ایک علمی اور مذہبی گھرانے میں ہوئی تھی۔ جامعۃ الفلاح سے انہوں نے ۱۹۷۴ء میں عالمیت اور ۱۹۷۶ء میں فضیلت کی اسناد حاصل کیں۔ پھر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ۱۹۸۴ء میں بی اے (آنرز) فرسٹ ڈویژن میں اور ۱۹۸۶ء میں امتیازی نمبروں کے ساتھ اردو میں ایم اے کیا۔ اس دوران انہیں پوسٹ گریجویٹ میرٹ اسکالرشپ ملی اور وہ علی گڑھ میگزین (اردو) کے مدیر بھی رہے۔ ۱۹۸۶ء میں ہی انہوں نے بی ٹی اے کا امتحان بھی فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ اس کے بعد 'مولوی چراغ علی کی علمی خدمات' پر مقالہ لکھ کر ۱۹۸۸ء میں ایم فل (اردو) کی سند حاصل کی۔ ۱۹۹۷ء میں یہ مقالہ خدابخش لائبریری پٹنہ سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ منور صاحب نے ۱۹۸۶ء میں یو جی سی NET میں کامیابی حاصل کی اور ۱۹۹۰ء میں انہی جونیر فیلوشپ حاصل ہوئی۔

'اردو میں علمی نثر (۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک)' کے موضوع پر انہوں نے نہایت جامع اور وقیع مقالہ لکھ کر ۱۹۹۲ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

ڈاکٹر منور حسین ۱۹/دسمبر ۱۹۹۴ء سے شعبۂ اردو میں بحیثیت لکچرر درس وتدریس پر مامور تھے۔ وہ ایک لائق اور محنتی استاد تھے، اپنی ذمہ داریوں کو نہایت خوش دلی، لگن اور سلیقے سے انجام دینے کے قائل تھے۔ کلاسیکی ادب، تاریخ اور مذہبیات پر ان کا مطالعہ کافی وسیع تھا اور شعرفہمی وادب فہمی کی غیر معمولی استعداد رکھتے تھے۔ تحقیق وتنقید سے بھی انہیں خاصا شغف تھا اور ان میں اس سلسلے کے کافی امکانات تھے۔

ڈاکٹر منور حسین کو ادبی صحافت میں بھی گہری دل چسپی تھی۔ دہلی کے رسالہ 'رفیق منزل' کے وہ عرصے

تک مدیر رہے۔ ۹۷۔۱۹۹۶ء سے شعبۂ اردو کا علمی ادبی خبر نامہ 'رفتار' ان کی ادارت میں نہایت سلیقے سے مرتب اور شائع ہو رہا تھا۔ وہ ماہنامہ 'اردو بک ریویو' (دہلی) کی مجلس ادارت سے بھی وابستہ تھے اور اپنے مشوروں اور قلمی معاونت سے اس رسالہ کی افادیت میں اضافہ کر دیا تھا۔

ڈاکٹر منور حسین تہذیب وشائستگی، سادگی وشرافت اور محبت واخلاص کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ وہ اپنے عمدہ اخلاق اور اپنی خدمات کی بنا پر تادیر یاد رکھے جائیں گے۔

[شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا خبر نامہ رفتار، زیر ہدایت: پروفیسر اصغر عباس (صدر شعبہ) پروفیسر قیصر جہاں (نگراں)، مرتب: ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب، اشاعت: جون ۲۰۰۲ء]

خطوط و تأثرات

(۱)

ادارہ الحسنات

رام پور

۱۱/۴/۱۹۷۶ء برادر محترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ مورخہ ۶/مارچ پیش نظر ہے۔ اگر چہ ان دنوں آپ امتحان میں پوری طرح مشغول ہوں گے لیکن پھر بھی امکان ہے کہ میرے خط کا آپ کو انتظار ہو، تاخیر کے اسباب بیان کرنا لا حاصل معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ اندیشہ بھی ہے کہ یہ بات کہیں محض رسم نہ بن کر رہ جائے۔

آج سے بہت پہلے جب میں نے آپ کے خط کا جواب دینا چاہا تھا تو ذہنی طور پر حسبِ عادت ایک خاکہ بنالیا تھا لیکن وہ کاغذ پر نہ آسکا، آج جب لکھنے بیٹھا ہوں تو ان باتوں کے تذکرہ پر طبیعت بالکل آمادہ نہیں ہے جو پہلے ذہن میں آئی تھیں اور یہ خط پہلے کے مقابلہ خاصا مختصر رہے گا۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ میرے پچھلے خط کی مختلف عبارتوں کو نشان زد کر کے جو زبان وانشا کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی ہے اس کے لیے میں آپ کا احسان مند ہوں۔ خدا کرے آپ اسی طرح آئندہ بھی یہ توجہ قائم رکھیں۔ خدا کرے کہ آپ کی توجہ سے دماغ کی اور دماغ کے ساتھ قلم کی بھی آزادی اور لاپرواہی دور ہو جائے۔ وَاللّٰهُ فِي عَونِ عَبْدِهِ مَا فِي عَونِ اَخِيهِ۔

میں نے آپ سے فراغت کے بعد کے ارادوں کے بارے میں دریافت کیا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ کے بقول میں کوئی مشورہ دے سکتا ہوں یا رہ نمائی کر سکتا ہوں، بھلا میں کہاں اور مشورہ ورہنمائی کا مقام کہاں! اور اگر مشورہ دینا بھی ہوتا تو یہ اس وقت مناسب ہوتا جب میں نے خود بھی فراغت سے پہلے اپنی کوئی راہ متعین کر لی ہوتی، جب کہ حال یہ تھا کہ دماغ آخرِ سال تک کبھی اس موضوع پر نہ جانے کیوں سوچنے کے لیے تیار ہی نہ ہوتا تھا، بارہا ساتھیوں نے پوچھا، گھر پہ والد صاحب نے پوچھا، مگر میں کسی کو کوئی جواب نہ دے سکا کہ فراغت کے بعد مجھے کیا کرنا ہے۔ ایک شوق رہ رہ کے ضرور ابھرتا ہے کہ اگر حالات نے یاوری کی تو کچھ مزید کسی ادارہ سے بحیثیت طالب علم منسلک رہوں گا۔ مگر اس شوق کا کیا حشر ہوا آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ فراغت کے وقت اگر لے دے کے کوئی سرمایہ میرے پاس تھا تو وہ یہ اطمینان کہ میں نے اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے وہ دنیا کی عظیم ترین نعمت ہے اور اللہ تعالیٰ ان شاء اللہ مجھے اس نعمت سے کما حقہ فائدہ

اٹھانے کا موقع ضرور دے گا، یہ اطمینان اب تک بحال ہے اور آگے کا حال اللہ کو معلوم ہے۔ بھلا جب میری حالت یہ رہی ہے تو آپ کو کیا مشورہ دوں، آپ ان دنوں جن مصروفیات میں گھرے ہوئے ہیں وہ بڑھتی ہی رہیں گی اور کچھ سوچنے کا موقع نہیں ملے گا اور اب سے پہلے جس ذہنی انتشار میں مبتلا رہنے کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ لائق افسوس ہے۔

بقیہ سب خیریت ہے۔ والدین کی طرف سے شدت سے گھر آنے کا مطالبہ ہو رہا ہے لیکن افسوس کہ اب وہ پرانی آزادیاں نہیں رہ گئیں، کچھ خبر نہیں کہ گھر جاؤں یا نہ جاؤں، اور کب جاؤں۔ آپ تو غالباً آخری پرچہ حل کرنے کے بعد روانہ ہو جائیں گے۔ میں یہاں بیٹھا ایک ایک دن گن رہا ہوں، ایک بے پناہ شوق ہے کہ فراغت کے وقت آپ لوگوں سے ملاقات ہو جاتی مگر شاید حسرتِ تکمیل ہی قسمت میں ہے۔ آپ ہی کچھ بتائیں **هل الى لقائكم من سبيل**۔

تحریر کی ناہمواری گراں ضرور گزرے گی مگر طبیعت بھی ہموار نہیں ہے۔ امید ہے آپ بخیر وعافیت ہوں گے آپ کی کامیابی کے لیے اللہ سے دعا کرتا ہوں اور اپنے لیے دعا کی درخواست۔

والسلام

محمد عبدالحی

(نوٹ: یہ خط انتر دیسی میں جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ کے پتے پر روانہ کیا گیا تھا۔)

---

(۲)

چتلی قبر، دہلی

۱۲رفروری (اتوار) ۱۹۷۸ء

برادر عزیز من

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

آپ کا مکتوب مؤرخہ ۸رفروری -۱۱رفروری کو ٹھیک اس وقت پہنچا جب کہ میں آپ کو یاد کر رہا تھا۔ خدا ایسا اتفاق بار بار نصیب کرے۔

تین دن پہلے والدین کے خطوط آئے ہیں لیکن ان کا جواب نہیں لکھ سکا ہوں، آپ کا خط ملا ہے اور پہلے

آپ ہی کے خط کا خواب لکھ رہا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ آپ نے جلد ہی گھر جانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ دوسری طرف میری مصروفیات نیز تساہلی سے کچھ بعید نہیں کہ جواب اس مرتبہ بھی کافی موخر ہو جائے اور ایسے وقت 'تعمیر ملت' پہنچے جب آپ موجود نہ ہوں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ آج چھٹی کے دن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کو یہ خط لکھ دوں۔

یہ سلسلہ بڑا دلچسپ ہے کہ آپ میرے ہر خط کے جواب میں میرے کچھ جملوں کو نقل کر کے مجھ سے ان کا مطلب دریافت کیا کریں یا کم از کم 'مطلب نہ سمجھ پانے' کا شکوہ کیا کریں۔

میں نے یہ جملہ لکھا تھا کہ 'آپ اتنی دور پہنچ جائیں گے اس کا اندیشہ نہیں تھا' تو اطلاعاً عرض ہے کہ لفظ ''اندیشہ'' میں نے قصداً استعمال کیا تھا۔ تاہم اگر آپ کے نزدیک اس کے استعمال کا یہ محل نہ تھا تو مجھے نظر ثانی کی تاکید فرمانے کے ساتھ ساتھ کوئی برمحل لفظ لکھ دینے کی زحمت بھی فرماتے تو بہتر ہوتا۔

دوسرا جملہ جو آپ کی سمجھ میں نہ آسکا اور جس کا جواب آپ نے محض اندازے سے دیا ہے وہ ہے ''یہ جان کر خوشی ہوئی کہ دیوبند میں اگر آپ کا داخلہ نہیں ہوسکا تھا تو آپ اب 'تعمیر ملت' میں آگئے ہیں۔' آپ نے لکھا ہے کہ اس جملہ میں صحیح طور پر بات سمجھ میں نہ آئی کہ ایا آپ کو خوشی میرے تعمیر ملت آنے سے ہوئی یا دیوبند میں داخلہ نہ ہونے سے۔ جواباً عرض ہے کہ دیوبند میں قیام نہ کر سکنے پر مجھے خوشی نہیں ہوئی ہے بلکہ خوشی اس بات پر ہوئی کہ آپ نے اپنے آپ کو علمی و دینی ماحول سے وابستہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ 'جامعہ تعمیر ملت' کے نام سے ایسے ہی ماحول کا پتہ چلتا ہے۔

شاید پچھلے خط میں بھی میں نے شکریہ ادا کیا تھا اور اس بار پھر سے اصلاح و تصحیح کا شکریہ قبول کیجیے۔ میرے خیال میں میرے خط کی عبارت کے اکثر جملے اپنی غلطیوں اور بھونڈے پن کی وجہ سے آپ کی ادبی حس کے لیے گرانی کا سبب بنتے ہوں گے، اور تفصیل کی زحمت سے بچنے کے لیے انھیں نظر انداز کرنا پڑتا ہوگا۔ میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ ویسے اگر آپ اپنے خطوط میں تصحیح اغلاط کا سلسلہ جاری رکھیں گے تو یہ ہماری مراسلت کا مفید پہلو ہوگا، اور خط و کتابت میں عموماً حکایت کے اختصار کا جو شکوہ ہو جاتا ہے اس کی گنجائش بھی نہ رہے گی۔

دیوبند کے جشن سے متعلق اب تک کچھ سوچ نہیں سکا ہوں کہ اس میں شریک ہونا ہے یا نہیں۔ بحیثیت

تماشائی وہاں جا بھی سکتا تھا لیکن یہ ماہ اور اگلے دو ماہ میرے لیے شدید مصروفیت کے ہیں اس لیے وہاں کی شرکت تقریباً ناممکن ہے۔

میں نے آپ کے فراغت سے جامعہ تعمیر ملت پہنچنے تک کے حالات اس لیے دریافت کیے تھے کہ آپ کے تذکرہ کے مطابق یہ دور آپ کے لیے کافی تکلیف دہ رہا ہے۔ میرے دریافت کرنے کا مقصد آپ کا شریک غم ہونے کے سوا کچھ بھی نہ تھا، لیکن جب ان حالات کے تذکرہ سے آپ اپنے قریب الاندمال زخموں کے ہرا ہونے کا خطرہ محسوس کر رہے ہیں تو مجھے کوئی اصرار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مکمل ذہنی سکون عطا فرمائے۔

امید ہے آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔

والسلام
محمد عبدالحی
12.2.78

یہ خط اس پتے پر ارسال کردہ ہے:

Mr. M. Husain Falahi
Jamia Tameer-e-Millat
Market Road, PO. Sagar.
Distt. Shimoga (Karnataka) Pin:577401

---

(۳)

۹/نومبر ۱۹۷۷ء

برادر عزیز!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ تمہیں خیر وعافیت سے رکھے۔ میرے سلسلے میں اس قسم کی بدگمانیوں سے ہمیشہ پرہیز کرو۔ میں اس قدر تنگ مزاج اور سریع الغضب نہیں ہوں۔ حیرت ہے کہ اتنے سال تم ساتھ رہے، لیکن پھر بھی میرے مزاج کا تجزیہ نہ کر سکے۔ تم سے ناراضگی کی کیا بات؟ اللہ نہ کرے کہ ایسا کوئی لمحہ آئے کہ ہم دونوں کے دل ایک

دوسرے سے پھر جائیں۔ میں بحمداللہ تمہارے سلسلے میں بڑا حسن ظن رکھتا ہوں۔ اور تم سے اتنی توقعات رکھتا ہوں جتنی توقعات میں نے شاید ہی اپنے کسی شاگرد سے رکھی ہوں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ وہ توقعات کہاں تک پوری ہو پاتی ہیں۔ اسی لیے میں تمہارے سلسلے میں شروع سے ہی فکر مند رہا ہوں۔ اور اب بھی رہتا ہوں اور اس بات کا آرزو مند رہتا ہوں کہ تم کسی اچھی جگہ پر ست ہو جاؤ، جہاں تمہاری صلاحیتیں ابھر سکیں۔

میں نے تم کو جو خط لکھا تھا، اس میں ناراضگی کی کوئی بات نہیں تھی۔ میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ دوسرے اگر تمہاری حوصلہ افزائی نہ کریں، تو اتنی جلدی دل شکستہ نہ ہو جاؤ۔ اور اپنی کوششیں برابر جاری رکھو۔ میرا اشارہ جامعۃ الفلاح کی طرف تھا کہ اگر ایک بار یہاں سے مایوس کن جواب چلا گیا، تو اس سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم برابر کوشش کرتے رہو۔ اسی لیے میں نے اس خط میں اشارہ کیا تھا کہ یہاں عربی میں دو جگہیں خالی ہو رہی ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ اس موقع سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔ اب یہ الگ بات ہے کہ میں اپنے مدعا کو ٹھیک سے واضح نہ کر سکا ہوں۔ یا ٹھیک سے واضح کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اب یہاں صدارت بھی تبدیل ہو گئی ہے۔ یعنی مولانا عبدالحسیب صاحب پھر صدر ہو گئے ہیں۔ ان سے بھی تم رابطہ قائم کر سکتے ہو۔ میرا خیال یہی ہے کہ وہ تمہیں خوش آمدید کہیں گے۔ رحمت صاحب وغیرہ کے پاس ابھی تک رسمی طور سے اطلاع نہیں آسکی ہے۔ بہر کیف اس طور سے بات کر سکتے ہو کہ اگر وہ جگہ خالی ہو جائے تو مجھ کو ان کی جگہ کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ فلاحیوں کے اجتماع میں اتنی دور سے آنے کی میرے خیال میں ضرورت نہیں ہے۔ یہ کوئی اتنا اہم اجتماع نہیں ہے کہ اس کے لیے سیکڑوں کا خرچ کیا جائے۔ اور سفر کی صعوبتیں الگ برداشت کرنی پڑیں۔ جب کہ شاید بہت زیادہ فلاحیوں کے آنے کی توقع بھی نہیں ہے۔ ابھی تک صرف چار پانچ کے خطوط آسکے ہیں۔

امید ہے اب تمہاری غلط فہمی رفع ہو گئی ہوگی۔ ''مولوی'' اور ''مولانا'' میں یا ''آپ'' اور ''تم'' میں اتنا فرق تو نہیں ہے کہ تم نے اسے میری ناراضگی پر استدلال کر لیا۔ تم جہاں کہیں بھی رہو، پھلو پھولو، خوش وخرم رہو، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں تم پر سایہ فگن ہوں۔ تمہارا دل ہمیشہ پاکیزہ جذبات اور بلند عزائم سے معمور رہے۔ میرا دل تم سے بہت خوش ہے اور بار ہا جی چاہتا ہے کہ کس طرح تمہیں اپنے پاس بلا لوں۔ اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔

اس ناچیز کو بھی دعاؤں میں یاد رکھنا۔

والسلام

دعا گو

محمد عنایت اللہ

نوٹ: خط کے اندر تاریخ کا اندراج نہیں ہے۔ ۱۹۷۷ء/۱۱/ ۹ کی تاریخ انتر دیسی کی سرکاری مہر سے حاصل کی گئی ہے۔ اس خط کے اخیر میں مُرسل گرامی کے دستخط میں محمد عنایت اللہ رقم ہے۔ یہ خط استاذ اور شاگرد کے حقیقی رشتے کا عکاس ہے۔ مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی حفظہ اللہ کو منور حسین فلاحی مرحوم سے کافی امیدیں وابستہ تھیں۔ (ادارہ)

---

(۴)

جامعۃ الفلاح

۱۴ر رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ

۳۰ر اگست ۱۹۷۷ء بروز شنبہ

انتہائی لائق شاگرد! **زادہ اللّٰہ علماً نافعاً وعملاً صالحاً**

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اچانک تمہارا خط پا کر بے حد خوشی ہوئی اور بہت سی پُرانی یادیں نقشۂ ذہن پر ابھر ابھر کر آنے لگیں۔ میں ۲۲ر جولائی کو گھر پہنچ گیا تھا اور ان شاء اللہ ۵ر اکتوبر کو بمبئی سے پرواز کروں گا۔ یہاں سے ۱۰؍۱۲ر شوال تک روانہ ہونے کا ارادہ ہے۔

تم نے جامعہ اسلامیہ جانے کی خواہش ظاہر کی ہے اس سے اچھی بات کیا ہوسکتی ہے کہ آدمی حصول علم کے لیے مدینہ منورہ جانے کا قصد رکھتا ہو، جو سرزمین کہ بذات خود اپنے اندر نا قابلِ بیان کشش رکھتی ہو جب اس میں علم کی کشش بھی شامل ہو جائے تو اس کی کشش کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس سال تو تم رہ گئے اب آئندہ سال مت چوکنا، کوشش اور پیہم کوشش کے بعد ہی کامیابی قدم چومتی ہے، اگر خدانخواستہ ابتدائی سالوں میں کامیابی نہ ہو سکے تو مایوسی کو قریب مت آنے دینا اور اپنی مشغولیات کے ساتھ ساتھ ہر سال ہی درخواست

بھیجتے رہنا،تمہیں سن کر حیرت ہوگی کہ بعض لوگوں کو پیہم دس سالوں تک کوشش کرنے کے بعد کامیابی کا منھ دیکھنا نصیب ہوا۔اب تمہارے سوالات کا بہ ترتیب جواب لکھ رہا ہوں۔

۱-سند کی فوٹو کی ایک ہی مصدقہ کاپی بھیجی جاتی ہے۔

۲-سند کے فوٹو پر سفارت خانہ سعودی سے تصدیق کرانی پڑتی ہے جس کی فیس غالباً 12.50 (بارہ روپے پچاس پیسے) ہے۔لیکن سفارت خانہ والے براہ راست تصدیق نہیں کرتے بلکہ پہلے نوٹری والوں سے تصدیق کرائی جاتی ہے پھر وزارت خارجہ سے،اس کے بعد سعودی سفارت خانہ سے۔یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے بیسیوں آدمیوں نے یہ کام کرایا ہے اس لیے بس اس کا راستہ معلوم کرنے کی ضرورت پڑے گی اور دو ایک روز میں تصدیق ہو جائے گی۔

۳-ہیلتھ سرٹیفکیٹ میں اس بات کی صراحت ہونی چاہیے کہ صاحب سرٹیفکیٹ چھوت والے (الامراض الساریہ والعاہات) امراض سے محفوظ ہے۔اس کی تصدیق وزیر صحت نہیں بلکہ وزارت صحت سے ضروری ہے جس کا شعبہ غالباً ہر ضلع میں ہوتا ہے۔ویسے اگر زحمت ہو تو کسی سرکاری اسپتال کے ڈاکٹر سے اس کی مہر کے ساتھ سرکاری پیڈ پر سرٹیفکیٹ حاصل کر لینا کافی ہوگا

۴- وزیر خارجہ یا وزیر تعلیم سے کوئی سروکار نہیں۔

درخواستیں آخر جمادی الآخر یعنی ابتداء رجب تک ضرور پہنچ جانی چاہئیں۔بھیجنے کے دو طریقے ہیں،ایک تو یہ کہ ہم لوگوں میں سے کسی کے پاس بھیج دو وہاں پر جمع کر دی جائے گی،دوسرا طریقہ یہ ہے کہ براہ راست نائب رئیس کے نام بھیج دو۔

میرا پتہ یہ ہے:محمد سلامت اللہ،ص ب:۸۴۸،المدینۃ المنورہ

دوسرا پتہ:فضیلۃ الشیخ عبدالمحسن بن حمد العباد،نائب رئیس الجامعۃ الاسلامیہ،ص ب:۱۷۰،المدینۃ المنورہ

اور شرطیں تو معلوم ہی ہوں گی۔یعنی (۱) اپنا تین عدد فوٹو، (۲) شہادۃ حسن السیرۃ والسلوک، (۳) شہادۃ تاریخ المیلاد۔ان شہادتوں کی اصل بھیجنا یا سعودی سفارت خانہ سے مصدقہ فوٹو۔

مولانا ابواللیث صاحب قاسمی وہاں پر ہیں ان سے برابر ملاقات رہی ہے،گہرے تعلقات ہیں۔یٰسین رانچوی کے بارے میں کس نے بتا دیا۔وہ بیچارے تو ابھی تک کوشش ہی میں لگے ہوئے ہیں۔شاید اس سال کامیابی ہو جائے گی۔جلد ہی ایک طالب علم کو یہاں داخل کرنے کے لیے آئے تھے۔ان تمام باتوں کے ساتھ اگر کسی اہم شخصیت کی سفارش بھی حاصل ہو سکے تو بہت اچھا ہوتا۔ویسے یہ بڑا مشکل کام ہے معلوم نہیں تمہیں

آسانی ہوگی یا نہیں۔ بہر حال کوشش کرنا۔ اگر کامیابی ہوجائے تو فبہا ورنہ جملہ کاغذات مکمل کر کے ایک درخواست کے ساتھ روانہ کر دینا۔ جہاں تک کلیات کا سوال ہے تو کلیۃ القرآن میں تو حافظہ شرط ہے، اسی وجہ سے اس میں طلبہ کی تعداد اور کلیوں کے بہ نسبت کم ہے اور اس میں داخلہ کی گنجائش زیادہ رہتی ہے۔ کلیۃ الحدیث نیا ہی کھلا ہے ویسے اس میں بھی اس سال کافی طلبہ رہے۔ ابواللیث صاحب وغیرہ اسی میں ہیں۔ کلیہ کی تعیین کرنے کی ضرورت نہیں ہے کسی بھی کلیہ میں داخلہ مل جائے تو آئندہ دوسرے کلیوں میں حسب منشا تحویل ہوسکتی ہے۔ اصل کام کسی طرح سے بھی وہاں پہنچ جانے کا ہے۔ بقیہ مراحل خود بخود طے ہوجائیں گے۔

امید ہے کہ اتنی تفصیلات کافی ہوں گی۔ اگر کوئی تشنگی محسوس ہو تو میں ہمیشہ حاضر ہوں۔ خدا سے دعا ہے کہ تم سبھوں کو دین و دنیا کی سعادتوں سے پورے طور سے بہرہ مند کرے اور دیرینہ آرزو پوری ہو۔ پرسان حال کو سلام کہو خاص طور سے والدین کو۔ ہاں! ریاض میں چندسال پیشتر ایک یونیورسٹی کھلی ہے جس کا نام ہے جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ۔ ابھی تک جامعۃ الفلاح کا اس سے معادلہ نہیں ہوسکا ہے اس وجہ سے یہاں کا کوئی آدمی اس میں نہیں جاسکا ہے۔ جامعۃ الفلاح کے ذمہ داروں کو کیا کہا جائے ذرا سی دوڑ دھوپ سے یہ کام ہوسکتا ہے۔ بہر حال قسمت آزمائی کے لیے مذکورہ شرطوں کے ساتھ وہاں پر بھی درخواست بھیجی جاسکتی ہے اس کا پتا بھی آسان ہی ہے:

فضیلۃ الشیخ عبدالمحسن الترکی/ نائب رئیس الجامعہ

جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ، الریاض

والسلام

محمد سلامت اللہ

نوٹ: یہ خط پیر الطیف مونگیر بہار کے پتے پر روانہ کیا گیا تھا۔ انگریزی کے ساتھ اردو میں بھی ضروری تفصیل انتر دیسی کے پتے والے کالم میں موجود ہے۔ غالبًا ایسا بہار میں اردو کی قدر افزائی کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ اسے جامعۃ الفلاح سے پوسٹ کیا گیا تھا۔ مولانا سلامت اللہ اصلاحی حفظہ اللہ کے خوبصورت انگریزی میں لکھے گئے پتے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدرسۃ الاصلاح میں مولانا کی انگریزی اچھی رہی ہوگی۔ [ادارہ]

(۵)

انجمن طلبہ قدیم، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

۱۸/مارچ ۱۹۷۸ء   برادر عزیز!   سلام مسنون

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آپ کا خط ۱۵/مارچ کو ملا 'حیاتِ نو' کتابت وطباعت کے مرحلہ میں تھا لہٰذا یہ چند دن کی تاخیر اسی وجہ سے ہوئی۔ بہت تعجب ہوا کہ ابھی تک آپ کو اپنے مرکزی دفتر کا پتہ نہیں معلوم ہوسکا۔ جب کہ اس سے قبل ہم آپ کی خدمت میں تجاویز دستور اور حیاتِ نو کا پہلا شمارہ روانہ کر چکے ہیں اور یہ تمام کی تمام چیزیں آپ کو مل بھی چکی ہیں، پھر ان کی پشت پر ہمارا پتا بھی موجود ہے۔ اس سے بھی زیادہ تعجب اس بات پر ہوا کہ ابھی تک آپ کو اپنے مخاطب کا بھی پتا نہیں لگ سکا۔ جب کہ تجاویز و دستور کے ساتھ ایک خط منسلک تھا۔ حیاتِ نو میں بھی ایک خط اسی نام سے شائع ہوا ہے۔ آپ کو اپنا مخاطب سمجھنے کے لیے یہ دونوں خطوط کافی تھے بہر حال اب یہ خط آپ کی دونوں الجھنوں کو دور کر دے گا۔ ان شاءاللہ۔

آپ نے اپنے خط میں حیات نو کے لیے چند مشورے بھی روانہ کیے ہیں جن کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی برابر اپنے مفید مشورے ارسال کرتے رہیں گے۔ یہ دوسرا شمارہ روانہ خدمت ہے۔ چوں کہ ابھی تک باوجود مطالبہ کے فلاحی احباب کے مضامین نہیں مل رہے ہیں لہٰذا ہم پُرانے مواد ہی دینے پر مجبور ہیں۔ جو ہمیں خود کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اس سلسلے میں آپ سے گزارش ہے کہ آپ اپنے اس آرگن کے لیے برابر کچھ نہ کچھ ارسال کرتے رہیں، چاہے وہ مقالہ کی شکل میں ہو یا ترجمہ کی شکل میں یا افسانے اور کہانیوں کی شکل میں۔ اس سلسلے میں دیگر احباب کے پاس بھی خط لکھ رہا ہوں امید ہے کہ توجہ کریں گے۔ بقیہ سب خیریت ہے۔ دیگر فلاحی حضرات آپ کو سلام عرض کر رہے ہیں۔

والسلام

انصار اللہ فلاحی

سکریٹری، انجمن طلبہ قدیم (کی مہر)

جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

نوٹ: یہ خط انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ یوپی (الہند) کے لیٹر پیڈ پر بھیجا گیا تھا۔ ریفرنس نمبر درج نہیں ہے۔ البتہ ۱۸/مارچ ۱۹۷۹ء کی تاریخ درج ہے۔ (ادارہ)

(۲)

مدرسۃ الاصلاح
سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی (الہند)
۱۶ر مئی ۱۹۷۸ء

مکرمی ومحترمی! سلام مسنون

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گا۔

ہمیں اس وقت کتب خانہ کے لیے ایک لائق ترین آدمی کی ضرورت ہے جو کتب خانہ کی تہذیب وتدوین اوراس کے نظم وانتظام کی مکمل ذمہ داریاں سنبھال سکے۔ساتھ ہی بہت ممکن ہے کہ حالات وضرورت کے تحت دوایک تعلیمی پیریڈ کا فریضہ بھی انجام دینا ہو۔اس ذیل میں آں جناب کی نشان دہی مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب نے فرمائی ہے جو ہمارے یہاں استاذ ہیں اورانھیں سے یہ معلوم ہوا کہ آپ غالبًا اس وقت فارغ ہیں۔اگرآپ یہ ذمہ داریاں قبول فرماسکیں تو ہمیں بے حد خوشی ہوگی۔بہتر ہو کہ آپ فوراً تشریف لاکر موجودہ ذمہ داریاں سنبھال لیں اوررمضان تک اس حیثیت سے اس فریضہ کوانجام دیں کہ یہ ہمارے اورآپ کے لیے ایک تجرباتی دور ہوگا جس میں ہمیں آپ کی صلاحیتوں اور کارکردگی کا جائزہ لینے اورخودآپ کوموجودہ نظام اور یہاں کے حالات سے ہم آہنگ کرنے اوراس کے امکانات کا اندازہ کرنے کا موقع مل سکے گا اورکسی نتیجہ تک پہنچ سکیں گے۔بہت ممکن ہے کہ اس سلسلے میں خود سبحانی صاحب نے آپ کولکھا ہو۔

والسلام
خیراندیش
احمد محمود اصلاحی
نائب ناظم مدرسۃ الاصلاح

نوٹ: یہ خط مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی (الہند) کے لیٹر پیڈ پر ہے۔افسوس کہ منور حسین فلاحی مرحوم نے جو جواب دیا وہ ہنوز حاصل نہیں ہوسکا۔(ادارہ)

---

(۷)

۹/جولائی ۱۹۸۳ء علی گڑھ

محترم بھائی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

میں آج کل علی گڑھ میں ہوں۔ ۱۷/جون کو یہاں چلا آیا تھا۔ چھٹیاں کم تھیں نا۔ یہاں آکر بیمار ہو گیا تھا، ۵-۶ روزے چھوڑنے پڑے۔ اب بخیر ہوں۔ آج گھر جا رہا ہوں، ۱۷/کو ان شاءاللہ واپسی ہوگی۔

آپ اپنی سنائیے بہت دن ہو گئے ملاقات ہوئے، کب آرہے ہیں؟ خدا کرے آپ کے گھر کے مسائل حل ہو گئے ہوں۔

ایک خوش خبری یہ ہے کہ آپ (ITT) یوپی کی مشاورت میں آگئے ہیں۔ علی گڑھ سے چار رفقاء ہیں۔ صباح الدین صاحب، آپ، اسرار صاحب اور ارشد اجمل صاحب۔ تین دوسرے لوگ باہر کے ہیں جن کے نام بتانے والے کو یاد نہیں رہے۔ ۳۱/جولائی اور یکم اگست کو دہلی میں مرکزی مشاورتی کونسل کا اجلاس ہوگا جس میں آپ صدر کا چناؤ وغیرہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی ذمہ داریاں بحسن وخوبی ادا کرنے کی توفیق دے۔ آمین

یہاں دوستوں میں نور اللہ، اسرار صاحب، مظہر صاحب وغیرہ ہیں۔ صباح الدین صاحب جو بیچ سیشن میں آگئے تھے کل گھر جا رہے ہیں۔ شفیق الرحمٰن اور ادارے کے دوسرے لوگ گھر جا چکے ہیں۔

آپ کے وہاں کیا مشاغل ہیں؟ گھر پر والدین کو سلام کہیے گا، بچوں کو دعائیں۔ عید کی مبارکباد قبول کریں۔

طالب دعا

جاوید علی

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

نوٹ: یہ خط ایس آئی او کی تاسیس کے بالکل ابتدائی زمانہ کا ہے، جب کہ اس کا نام اسلامی طلبہ تنظیم (ITT) تھا۔ یہ تنظیم ۱۵/ستمبر ۱۹۸۲ء میں قائم ہوئی تھی۔ ایک ہی سال کے اندر اس کا نام 'اسلامی طلبہ تنظیم (ITT) کے بجائے اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن (SIO) کر دیا گیا۔ (ادارہ)

(۸)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مشروع التراث الاسلامی	Project Legacy of Islam
معہدالدراسات الموضوعیۃ	Institute of Objectives Studies
مکتب علیگرا	(Aligarh Chapter)
مؤرخہ ۱۲؍نومبر ۱۹۹۴ء	Sir Syed Nagar, Post Box. No.61
	Aligarh-202002

محترم ومکرم مولانا منور حسین فلاحی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز نئی دہلی نے اپنی علی گڑھ شاخ کے سپرد ایک اہم تحقیقی اور علمی منصوبہ کیا ہے، جس کا عنوان ہے 'اسلام کا علمی ثقافتی ورثہ۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام اسلامی علوم وفنون اور سائنسی موضوعات پر جو بنیادی کام اب تک کیا گیا ہے ان کی ایک مشروح کتابیات (Annototed Bibliography) تیار کی جائے اس کے دو موضوعاتی حصے مقرر کیے گئے۔ ایک صاحبِ تصنیف کا سوانحی خاکہ ہو اور دوسرا تصنیف کے اہم اور بنیادی مضامین کا اشاریہ ہو۔

الحمدللہ اس علمی اور تحقیقی منصوبہ کی کافی پذیرائی ہوئی۔ علی گڑھ اور دوسرے علمی مراکز کے علماء اور دانشوروں نے اپنے تعاون کا یقین دلایا اور اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر کام کا آغاز کر دیا گیا۔ اب تک حدیث، سیرت نبوی اور تصوف کی اہم ترین کتابوں اور ان کے مؤلفوں پر کام پورا ہو چکا ہے۔ فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، تفسیر، طب، تاریخ، کلام اور جغرافیہ وغیرہ پر مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ سائنسی موضوعات پر ابھی تک کام نہیں شروع ہو سکا ہے۔

ادارہ کے کارکنوں نے محسوس کیا کہ کام میں تیز رفتاری اور وسعت لانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ۳۱؍دسمبر ۱۹۹۴ء بروز ہفتہ ایک روزہ ورکشاپ علی گڑھ میں منعقد کی جائے اور مختلف موضوعات کے ماہروں اور مقالہ نگاروں کو ایک جگہ جمع کیا جائے تاکہ بحث ومباحثہ اور مذاکرہ سے اس علمی منصوبہ کو مزید وقیع بنایا جائے۔

آپ سے مخلصانہ التماس ہے کہ اس ورکشاپ میں شرکت فرمائیں اور اپنے قیمتی وقت اور وسیع معلومات سے ہمیں بھی کچھ حصہ عنایت فرمائیں۔ یقین واثق ہے کہ آپ کے تعاون اور رہ نمائی سے ہمارے اور آپ کے اس علمی منصوبہ کی تکمیل میں سہولت بھی ہوگی اور اس کی وقعت بھی بڑھے گی۔

نیازکیش

محمد یٰسین مظہر صدیقی

(پروجیکٹ کوآرڈینیٹر)

اس مکتوب کا منسلکہ جو عمومی اشتہار و تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔ افادیت کے پیش نظر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے کہ یہ بھی اس خط کا لازمی حصہ ہے۔ (ادارہ)

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مارچ ۱۹۸۶ء میں ادارہ مطالعات معروضی (آئی او ایس) کی داغ بیل نئی دہلی میں اس مقصد جلیل کے حصول کی خاطر ڈالی گئی کہ اسلامی علوم وفنون کے فروغ واشاعت اور ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے کام میں ہندی مسلمان اپنا کردار ادا کریں۔ منجملہ دوسرے منصوبوں اور پروگراموں کے ادارہ نے بعض بہت اہم تحقیقاتی منصوبوں کا ایک جامع لائحہ عمل مرتب کیا۔ ان میں سے ایک 'وراثت اسلامی' کا جرأت آزما منصوبہ ہے۔ اور یہاں اسی کا مختصر تعارف کرانا مقصود ہے۔

اسلام نے اپنی آفاقیت اور ہمہ گیریت کے سبب انسانی تہذیبوں میں ایک نیا رنگ وآہنگ بھرا اور مختلف تمدنوں کی مقامی صالح روایات کے جذب وانجذاب اور غیر صالح عناصر کی قطع وبرید کے ارتقائی مرحلے سے گزر کر ایک خالص اسلامی تہذیب وتمدن کے اصول وضع کیے اور ان پر کلاسیکی دور میں عمل کر کے مختلف علاقوں میں اسلامی تہذیب وتمدن کو برپا کر کے بھی دکھا دیا۔ اسلامی ریاستوں کے سیاسی زوال، مسلمانوں کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے انحطاط اور یوروپی اقوام کے عروج اور بعض دوسرے عوامل ومحرکات کی خیرہ کن کارفرمائی کے نتیجہ میں غیر اسلامی قوتوں نے اکثر دانستہ اور کبھی نادانستہ محض اپنی ناواقفیت کی بنا پر اسلامی تہذیب وتمدن کو نہیں سمجھا حالاں کہ دُنیا کے مسلم معاشروں میں آج بھی اس کے بنیادی خدوخال نظر آتے ہیں۔ اور اسلامی علوم وفنون کے اصل مراجع اور بنیادی ماخذ میں اس کے تمام اصول وجزئیات پنہاں ہیں۔ اسلامی تہذیب وتمدن کی

شناخت اس کے اصل مراجع ومصادر کی تفہیم وتفسیر پر منحصر ہے۔اس لیے ادارہ نے اپنے پروگراموں میں اسلامی وراثت کے منصوبہ کو اولیت دی اور ایک تحقیقی لائحہ عمل بنایا کہ اسلامی تہذیب وتمدن کے بنیادی مراجع اور ان کے مصنّفین کا ایک جامع تعارف پیش کیا جائے تا کہ اس ضمن میں موجود غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے اور طالبان حق اور محققین علم کو ضروری مواد یکجا مل سکے۔

ہمارے پیش نظر فی الحال یہ کام ہے کہ تمام اسلامی علوم وفنون (خواہ ان کا تعلق حدیث وفقہ سے ہو یا دوسرے سماجی تمدنی اور سائنسی علوم وفنون سے) کی ایک ہزار کتابوں کو منتخب کیا جائے، پھر ان کے بنیادی مباحث اور مشمولات کا تجزیہ اس طرح پیش کیا جائے کہ قارئین کو ہر کتاب کے مواد کا علم ہو جائے اور محققین کو اپنی دلچسپی کا مواد یکجا مل جائے۔کتاب کی تلخیص ہرگز مقصود نہیں بلکہ مباحث کا مفصل اور جامع تعارف مقصود ہے۔ہر ماخذ کے مشمولات ومباحث کے تعارف سے قبل اس کے مصنف کے سوانح حیات، علمی کمالات، ذہنی رجحانات، مسلکی میلانات اور دوسرے تمام ضروری پہلوؤں کو جو شخصیت کی تفہیم کے لیے ناگزیر ہیں اس کے معاصر عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر میں اس طرح اجاگر کیا جائے کہ شخصیت اور عہد کی اس کی تصنیف پر چھاپ کو سمجھنا ممکن ہو، ماخذ کا تعارف نامہ بیس یا پچاس صفحات پر مشتمل ہوگا اور ادارہ ہر منظور شدہ مضمون کے لیے ایک مناسب معاوضہ پیش کرے گا

ظاہر ہے کہ یہ ایک عظیم الشان منصوبہ ہے اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین بالخصوص علماء کرام کے مخلصانہ اور فعال تعاون کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔اس لیے آپ کے جذبہ علم پروری اور حب خدمت اسلامی سے ہمیں بجا طور سے اُمید ہے کہ آپ، اس کارِ خیر وعلم میں اپنا دستِ تعاون بڑھائیں گے اور منصوبہ ''وراثت اسلامی'' کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ہماری بھرپور مدد کریں گے۔

آپ سے درخواست ہے کہ منسلکہ فارم بھر کر جلد از جلد روانہ فرمائیں اور اس میں مندرج ضروری ہدایات کے مطابق معلومات فراہم کریں۔اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے گا۔

آپ کے تعاون وامداد کا متمنی
محمد یٰسین مظہر صدیقی

---

(۹)

مکرمی ومحترمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔

مجھ پر 'لوحِ ایام' کا نزول اسی طرح نعمت غیر مترقبہ کے بطور ہوا جس طرح 'الواح توریت' کا نزول حضرت موسیٰ پر۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ مجھے اس تحفہ پر اس قدر مسرت ہوئی کہ اب تک کے تعلیمی سفر میں کسی واقعہ پر نہ ہوئی۔ اس مسرت میں بڑا حصہ اس بات کا بھی تھا کہ آپ کی نظروں میں میری تحریر کس قدر قابلِ توجہ ٹھہری، اس تحفہ کی شکل میں آپ کی ہمت افزائی کا میں بے حد ممنون ہوں۔

اس تعارفی تحریر کے بعد میں اہل علم کے تبصروں کا منتظر ہی تھا کہ دہلی اور بمبئی سے میرے دوشناساؤں نے مجھ سے اس کتاب کے مطالبہ پر خطوط لکھے اور میں انھیں یہی جواب دیتا رہا کہ اب تک ہندوستان میں اس کی اشاعت نہیں ہوئی، اس لیے فراہمی کا سوال ہی نہیں اور میرے شعبہ کا نسخہ میرے علم کی حد تک علی گڑھ میں اکیلا نسخہ تھا اس لیے کہیں بھیجا بھی نہیں جا سکتا۔ اسی اثنا میں اس کتاب کی شکل میں آپ کا ردعمل ظاہر ہوا۔ گزشتہ دنوں دہلی جانا ہوا تو وہاں اس کتاب سے دلچسپی کا یہ عالم دیکھا کہ دوستوں نے اس کتاب کی زیروکس کاپیاں کرالی ہیں اور اس طرح اپنا ایک نسخہ بنا لینے کی حسرت پوری کرلی۔ میرے علم کی حد تک اردو کی سنجیدہ تحریروں میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو مقبولیت عطا فرمائی وہ وہ کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہے۔

والسلام

بملاحظہ جناب مختار مسعود صاحب

منور حسین

نوٹ: اس خط پر کوئی تاریخ مرقوم نہیں ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اصل خط کی یہ دستی زیراکس ہے۔

(۱۰)

ایک نمائندہ دعوتی خط از ڈاکٹر منور حسین فلاحیؒ

مکرمی ومحترمی! سلام مسنون

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

مسلمان اقلیت کی جان ومال، عزت وآبرو کی بے تحفظی کا جو عالم ہے وہ شاید آپ زیادہ بہتر جانتے ہوں، لیکن مختلف شہروں اور دیہاتوں میں خطرات کی Intensity جتنی زیادہ ہے اسے اس پیمانہ پر آپ نہیں محسوس کرسکتے جتنا وہاں کے عوام محسوس کررہے ہیں۔ آپ نے اس طرح کے فسادات کے بعد ایسے مقامات کے دورے یقیناً کیے ہوں گے اور آپ کی واقفیت بھی زیادہ ہوگی لیکن ایک مرتبہ ان اضلاع کا دورہ کریں تو کیفیت کی شدت کا احساس بخوبی ہوسکتا ہے۔ اس صورت حال میں معلوم یہ کرنا ہے کہ آپ لوگ کیا سوچ رہے ہیں؟ ہوسکتا ہے بڑی سرگرمی سے صورت حال پر غور وفکر بھی جاری ہو، مگر مسلم اقلیتیں مختلف جگہوں پر سفر اور حضر میں جس طرح کی یکتائی، غیر محفوظیت اور لاچاری وبے بسی کے عالم میں ہیں۔ آپ حضرات کی سرگرمیوں سے اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہورہی ہے اس لیے کہ آپ سے ان کا رابطہ ہی برائے نام ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ موجودہ صورت حال کے خاتمہ کے لیے کیا تجاویز مرتب ہوئی ہیں؟ کیا تدابیر سوچی گئی ہیں یا عمل میں لائی جارہی ہیں؟ اگر قصور زیادہ مسلمانوں کا ہے تو کیا انھیں قصور کرنے، لُٹنے اور مرنے دیا جائے یا انھیں ہوش میں لانے کے لیے جہاد کی ضرورت ہے؟ اگر قصور غیروں کی زہرافشانیوں اور اشتعال انگیز اقدامات کا ہے تو کیا ان پر قدغن لگنے کی کوئی امید ہے یا امکان ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر حکومت سے اس معاملہ میں صاف صاف بات کرلینے میں کیا حرج ہے کہ وہ اپنی ناکامی کا اعتراف کرے یا اعلان کردے کہ وہ اقلیتوں کا تحفظ نہیں کرسکتی؟ تاکہ اقلیتیں خود ہی اپنے بارے میں جو فیصلہ چاہیں کرلیں۔ یہ بات بالکل طے ہوجانی چاہیے کہ حکومت کے اس اعتراف کے بعد پولیس بیرکوں میں جائے گی اور وہ کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔

فسادات کے بعد لٹے پٹے لوگوں کی مدد، معذور لوگوں کو زندہ رکھنے کی کوشش اور اس طرح کے رفاہی اقدامات یقیناً اہم کام ہیں جن کی اہمیت مسلم اداروں پر اتنی واضح ہے کہ وہ اس سلسلے میں مسابقت کی روش پر گامزن ہیں لیکن کام سے زیادہ اپنے کارناموں کا چرچا کرنا بھی ضروری سمجھتی ہیں۔ مگر اصل کام یہ نہیں ہے۔ اصل کام ایسے اقدامات ہیں جن کی بنا پر ایسی صورت حال رونما ہی نہ ہو یا اس کی تعداد میں خاطر خواہ کمی

ہوسکے۔اس کے لیے منافست کرنے والے کہاں ہیں،اس کا اشتہار کہیں نظر نہیں آتا۔جن اداروں یا جماعتوں کے پاس اس سلسلہ کا کوئی ٹھوس پروگرام یا نقشہ کار نہ ہوان کو اس کا اعتراف کرنا چاہیے اور جو لوگ کوئی عملی پروگرام رکھتے ہوں انھیں سامنے آنا چاہیے اور تمام اداروں اور جماعتوں کو اس اہم مسئلہ میں اجتماعی غور وفکر اور اجتماعی جدوجہد کی دعوت دینی چاہیے۔نقشہ کار یقیناً کمروں میں بنیں گے مگر ان کا عملی روپ میدانوں میں سامنے آئے گا۔صرف اخبارات وسرکلرس کے ذریعہ اعلان واشتہار دے دینا کسی مرض کا مداوا نہیں ہے!

ایک زمانہ میں اینٹی رائٹس فورس کی تشکیل، آبادیوں کے تناسب سے پولیس فورس میں نمائندگی، انتخابات کے طریقے میں تبدیلی کی تجاویز بڑے زور وشور سے اٹھی تھیں۔وہ کیا ہوگئیں؟ کیا یہ تجاویز ناقابل عمل ہیں؟ یا حکومت کی خیانت یا نفاق اس راہ کی رکاوٹ ہے۔یا اور کوئی بات ہے؟ اسے واضح ہو جانا چاہیے۔کیا مسلم عوام کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ سنجیدگی سے اپنی بقا وتحفظ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، اپنے چھوٹے چھوٹے ذاتی خاندانی وگروہی اختلافات کو نظر انداز کردیں، کفر وگمراہی کے فتوؤں سے توبہ کریں اور ایسے قائدین کی قیادت کو ٹھکرادیں جو مذہب کے نام پر انتشار وافتراق کو ہوا دیں۔اتحاد کے راستہ میں رخنہ اندازی کریں۔

یادرکھیے اس کائنات کی سب سے بڑی طاقت وقوت اللہ کے پاس ہے۔اس کی منشا کے بغیر اس دنیا کا ایک پتا بھی نہیں ہلتا۔کیا ممکن نہیں کہ ہماری ذلت وتباہی کی یہ حالت ہماری اجتماعی بدعملی، بےحسی اور اپنے مالک سے بےتعلقی کا نتیجہ ہو اور اللہ ان ٹھوکروں سے ہمیں متنبہ کر رہا ہو کہ اب بھی سنبھلنے کا وقت ہے، اگر ہم اب بھی اس زبردست قوت کی مالک ذات سے اپنا رشتہ جوڑ لیں، اپنی بےحسی اور بداعمالی سے توبہ کریں اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا آغاز کردیں تو کیا ہماری یہ بےبسی، ناطاقتی اور لاچاری کی حالت بدل نہیں سکتی؟

اگر ہم اپنی خواہشاتِ نفس کی بندگی اور دنیا کے نام نہاد لیڈروں کی خوشامد وچاپلوسی کے حصار سے نکل کر اللہ کے بندے بن جائیں اور زندگی کے مختلف معاملات میں اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگیں تو دنیا کی کوئی طاقت ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی اور ہمیں عزت وکامرانی کی منزل تک پہنچنے سے روک بھی نہیں سکتی۔

حالات کی تبدیلی کے لیے صرف اپنی ذات کو نیک بنالینا کافی نہیں ہے۔تباہی خباثت کی کثرت سے آتی ہے، خیر وصلاح کی جب کثرت ہوگی تباہی کا خاتمہ یقیناً ہوجائے گا اس کے لیے اپنے گھر، اپنے خاندان اور اپنے سماج کو صالح بنانا ضروری ہے۔اس کی عملی شکل یہ ہے کہ ہر گھر کا ایک فرد یا کم از کم ہر سماج کے چند باشعور افراد سارے حجاب کو توڑ کر اصلاح احوال کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔اسی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیں

اور پوری تن دہی، اخلاص اور جذبۂ ہمدردی سے لوگوں اور گھروں کی حالتوں کو سدھارنے، مسائل کو حل کرنے کی فکر کریں۔ کام کا آغاز کردیں اللہ راستہ کھولے گا، تمام مشکل مسائل میں رہ نمائی فرمادے گا۔ نامساعد حالات میں مناسب اقدامات کی راہ سجھائے گا۔ اپنی خصوصی مدد، مہربانی، کرم اور رحمت شامل حال کردے گا۔

اس وقت کا انتظار کرنا جب مصیبت آپ کے گھر پر دستک دے گی تب اس کی فکر کی جائے گی انتہائی نادانی اور حماقت ہوگی۔ مصیبت کے آنے سے پہلے اس کی مدافعت کا مناسب بندوبست کرلینا ضروری ہے۔

نوٹ: اس دستی خط کا مکتوب الیہ واضح نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ایس آئی او کے نوجوانوں کے لیے ایک جامع خط ہے جو ہر کارکن تک پہنچانے کی فکر تھی۔ موصوف کے اداریوں کی روح اس میں نظر آتی ہے جب وہ رفیق منزل کے مدیر اعلیٰ تھے۔ ان اداریوں پر چند مقالات اس نمبر میں شامل کیے گئے ہیں اور چند نمائندہ اداریے بھی۔ (ادارہ)

●●

''آج ملت اسلامیہ جن حالات سے دوچار ہے وہ بہت واضح ہیں۔ ملت کا درد رکھنے والوں کی بھرپور کوشش ہونی چاہیے کہ اس کے اندر ٹھوس بنیادوں پر مستقل مزاجی کے ساتھ تعمیری کام انجام دینے کا رجحان پیدا ہو۔ وہ اسلام کے احکام کے نفاذ کی اجتماعی جدوجہد کریں۔ مسلمان اسلام کے قولی وعملی گواہ بن جائیں۔ ان کا سماج اسلامی سماج کا نمونہ ہو۔ پھر ان میں ایسا اتحاد پیدا ہو جسے فروعی اختلافات اور ذاتی اغراض ومفادات پارہ پارہ نہ کرسکیں۔ ان کی قیادت اسلامی اصولوں کی علم برداری کا قولی وعملی مظہر ہو۔ اگر یہ باتیں مسلم سماج میں پیدا ہوجائیں تو انہیں ان بے شمار مسائل سے بڑی حد تک خلاصی نصیب ہوجائے گی جن میں وہ آج گھرے ہوئے ہیں۔''

(**ڈاکٹر منور حسین فلاحی**، اداریہ ماہ نامہ رفیق منزل، جون ۱۹۸۸ء]

منتخبات

(نگارشات ڈاکٹر منور حسین فلاحی کے چند نمونے)

انسان کی حقیقت

ماضی اور حال کے مختلف فلسفوں میں انسان کو ایک خاص قسم کا حیوان کہا گیا ہے۔ منطقیوں کے نزدیک وہ ایک حیوان ناطق ہے تو معاشیات وسماجیات کے ماہرین اسے معاشی یا سماجی حیوان قرار دیتے ہیں۔ سیاسیات کا عالم اسے سیاسی حیوان بھی کہہ سکتا ہے۔ ان تعریفوں میں صداقت صرف یہاں تک ہے کہ انسان وحیوان دونوں سانس لینے اور بعض دوسرے اعمال میں کسی حدتک مماثلت رکھتے ہیں۔

قرآن نے ایک مقام پر انسانوں کی خصوصیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (التین:۴)

(ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔)

ظاہری خلقت کے اعتبار سے انسانوں اور حیوانوں میں بڑی مماثلت ہونے کے باوجود انسانوں کی ساخت کو جو فضیلت اور حسن حاصل ہے اسے ایک ظاہر بیں شخص بھی تسلیم کرتا ہے۔ جس طرح اس کی ساخت کا یہ حسن بے نظیر ہے اسی طرح متعدد خصوصی قوتوں اور صلاحیتوں کی بنیاد پر بھی اس کی فضیلت وبرتری عام طور پر تسلیم کی گئی ہے۔ ایک دوسرے مقام پر قرآن اسے یوں بیان کرتا ہے:

خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (التغابن:۳)

اس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا اور تمہاری صورت گری کی تو کیا ہی حسین صورت گری کی۔

کائنات میں انسانوں کی ساخت کو بہتر قرار دینا اور اسے تمام مخلوقات سے افضل قرار دینے کا ذکر اس آیت میں بھی ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِيْ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (الاسراء:۷۰)

اور ہم نے بنی آدم کو مکرم بنایا ہے اور انہیں خشکی وتری میں سفر کا سلیقہ عطا کیا اور ان کو پاکیزہ چیزیں عطا کیں اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں برتری بخشی۔

قرآن نے یہاں جس تکریم کی بات کہی ہے وہ ہر اس انسان کو حاصل ہے جو اپنے خالق کی معرفت سے

بہرہ ور ہو اور اس کی معرفت کا اثر اس کی زندگی میں نمایاں ہو۔ ان صفات سے متصف طبقہ کے علاوہ دیگر انسانوں کو وہ اس کرامت کا مستحق قرار نہیں دیتا چاہے وہ مال و دولت حکومت و سیادت اور اس جیسی ظاہری کرامتوں سے آراستہ ہوں۔ اسی حقیقت کو قرآن انسان کی پست ترین حالت سے تعبیر کرتا ہے:

ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْنَ (التین:۵)

پھر ہم نے اسے (اس کے رویوں کی بدولت) پست ترین حالت کی طرف لوٹا دیا۔

قرآن کی نگاہ میں جو طبقہ مکرم ہے اس میں بھی درجہ بندی ہے۔ سب ایک ہی سطح اور حیثیت کے مالک نہیں ہیں۔ اس لیے کہ خدا کی معرفت اور اس کے اثر کے ظہور کے معاملہ میں سب یکساں نہیں ہو سکتے۔ اس درجہ بندی کو اس آیت میں کھولا گیا ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات:۱۳)

تم میں سب سے مکرم اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے متقی ہے۔

قرآن اس دنیا کی زندگی کو انسان کے لیے عرصۂ امتحان قرار دیتا ہے۔ اس نے اس بات کا نظم کیا ہے کہ انسانوں کو اس کے حقیقی خالق و مالک کی معرفت حاصل ہو، ساتھ ہی ایسے سامان بھی کر دیے گئے ہیں کہ انسان اس معرفت کے حصول سے خود کو محروم کر سکے۔ اس کا امتحان یہ ہے کہ کیا وہ مکرم بننے کی راہ اختیار کرتا ہے یا اس راہ کو اختیار کرنے کی اسے فکر نہیں ہے۔

الَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً (الملک:۲)

وہی ہے جس نے موت و حیات کی تخلیق کی ہے تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔

اس امتحان میں انسان کو کامیاب کرنے کے لیے تمام ضروری وسائل عطا کیے گئے ہیں۔ اگر وہ صحیح انتخاب سے کام لیتا ہے تو پھر اس کا عمل حسین و خوب صورت بنتا ہے اور ظاہر ہے جس کا عمل حسین ہوگا وہی معزز و مکرم بھی ہوگا۔ لیکن اگر کوئی غلط انتخاب کے ذریعہ اپنے مالک کے فراہم کردہ وسائل سے فائدہ نہیں اٹھاتا ہے تو وہ برے عمل کا مرتکب ہوتا ہے اور اپنے مالک کی نگاہ میں ذلیل و پست قرار پاتا ہے۔ ایسے افراد کے بارے میں قرآن کا تبصرہ یہ ہے:

لَهُمْ قُلُوبٌ لاَّ يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لاَّ يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لاَّ يَسْمَعُونَ بِهَا

(الاعراف:۱۷۹)

ان کے پاس دل ہیں مگر اس سے سمجھتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، ان

کے پاس کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔

یہی حقیقت دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لاَ يَعْقِلُونَ (البقرہ:۱۷۱)

(وہ) گونگے، بہرے، اندھے ہیں عقل نہیں رکھتے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے انسانوں اور جانوروں کی دنیائیں الگ ہوتی ہیں۔ گویا قرآن کی نگاہ میں جانور اپنی زبان، اپنی آنکھ اور کان اور دل سے وہ کام نہیں لیتے جو انسان لیتا یا لے سکتا ہے۔ اسی لیے جو انسان اپنے ان اعضاء کا اس طرح انسانی استعمال نہیں کرتے جو اس کے مالک نے بتایا ہے تو وہ اپنے مالک کی نگاہ میں جانور ہیں۔ بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں:

أُوْلَـئِكَ كَالأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (الاعراف:۱۷۹)

وہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

انسان اپنی صحیح حیثیت نہ پہچاننے کے سبب جانوروں سے بدتر اس لیے قرار پاتا ہے کہ جانور ہمیشہ اپنی سرشت پر قائم رہتے ہیں وہ اپنی سرشت سے انحراف و بغاوت نہیں کرتے۔

قرآن کی نگاہ میں اصولی طور پر سارے انسان یکساں ہیں۔ اس لیے کہ وہ سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ ان میں ذات و قبائل وجہ تفریق و تکریم نہیں سبب شناخت ہیں۔ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا

(الحجرات:۱۳)

لوگو ہم نے تمہیں ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قبیلوں اور کنبوں میں بانٹ دیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان سکو۔

وہ انسانوں کی جان و مال کی حرمت کا اعلان ان الفاظ میں کرتا ہے:

وَلاَ تَأْكُلُواْ أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ (البقرة:۱۸۸)

اپنے مال کو آپس میں غلط طریقوں سے مت کھاؤ۔

وَلاَ تَقْتُلُواْ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّهُ إِلاَّ بِالحَقِّ (الاسراء:۳۳)

اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے ناحق قتل نہ کرو۔

اسی طرح عزت وعصمت وغیرہ کی حرمت کا بیان قرآن کی ایک معروف حقیقت ہے، ناحق کسی کی جان لینا اس کی نگاہ میں سارے انسانوں کی جان لینے کے مترادف ہے:

مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِيْ الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً (المائدہ:۳۲)

جو کسی کو قتل کردے بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان لی ہو یا زمین میں فساد پھیلانے کا مرتکب ہوا ہو۔ وہ اتنا بڑا مجرم ہے گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کردیا ہو۔

اسی طرح ایک انسان کی جان بچالی جائے تو ساری انسانیت کو زندگی بخشنے کا کارنامہ قرار پاتا ہے۔

وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعاً (المائدہ:۳۲)

جو اسے زندہ کرے گا وہ سارے انسانوں کو زندہ کرنے والا قرار پائے گا۔

اوپر کی آیت میں قران دو ایسے جرائم کا ذکر کرتا ہے جن کی بنیاد پر انسانوں کا قتل جائز قرار پاتا ہے۔ وہ کسی کا قاتل ہو یا زمین میں فساد پھیلانے والا ہو۔ ایسا شخص قرآن کی نگاہ میں زندہ رہنے کا حق کھودیتا ہے اور وہ اس لائق ہے کہ اس کے وجود سے یہ سرزمین پاک کردی جائے۔

اس دنیا میں انسان کے قتل کا سبب معاشی ناہمواری بھی رہا ہے۔ فقر وفاقہ محتاجی ونا داری بھی قتل انسان کا سبب بنی ہے۔ قرآن اس سبب سے بھی انسانوں کے قتل کو جائز نہیں کہتا:

وَلاَ تَقْتُلُواْ أَوْلادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلاقٍ (الاسراء:۳۱)

فقر وفاقہ کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔

اس لیے کہ رزق دینا رازق کا کام ہے۔ انسانوں کا نہیں۔ دنیا کا مالک جس طرح ایک انسان کو رزق دیتا ہے۔ وہ کروڑوں اور اربوں انسانوں کو بھی رزق دے سکتا ہے۔ وہ تو اس دنیا میں موجود بے شمار مخلوقات کو رزق دیتا ہے۔ جن مخلوقات کا پورے طور پر علم آج کے ترقی یافتہ انسانوں کو نہیں ہوسکا ہے قرآن کے اس حکم کی روشنی میں آج کی مہذب دنیا میں معاشی بحران کی بنیاد پر چلائی جانے والی خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیموں کے بارے میں اسلامی مزاج کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اس خاص سبب سے قطع نسل کی حرمت کے اعلان کے باوجود اسلام کا عمومی مزاج اس حق میں جاتا ہے کہ صحت یا تعلیم وتربیت کے معقول وسائل کے فقدان کی بنیاد پر عارضی طور پر ایسی تدابیر عمل میں لائی جاسکتی ہیں جن سے تحدید نسل ممکن ہو۔ یعنی طرفین میں سے کسی کی صحت کے خراب ہوجانے کا اندیشہ ہو یا بچوں کی معقول تعلیم وتربیت کا وہ نظم نہ کرسکتا ہو۔ اس لیے کہ اگر کسی کی صحت ہی

ضائع ہو جائے تو ایسی زندگی بے معنی ہے اور اگر ایسی تعلیم و تربیت کا موقع میسر نہ ہو جو انسان کو اپنی اصل حقیقت سے واقف کرا سکے تو ایسے انسانوں کا وجود اور عدم وجود برابر ہے۔ خدا تعالیٰ کو اس سرزمین پر انسان نما جانوروں کے اضافہ سے کوئی دل چسپی تو ہے نہیں۔ یہیں سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ خدا کی نگاہ میں انسانوں کے لیے اس کی مادی و معاشی احتیاج سے زیادہ اہم اس کی اخلاقی وروحانی احتیاج ہے۔ اس لیے کہ مادی و معاشی ضروریات میں تو وہ اس دنیا کے تمام زندہ مخلوقات میں مشترک ہے۔ البتہ اخلاقی وروحانی ضرورتیں صرف اسی کے لیے خاص ہیں۔ اور یہی ان کا امتیاز بھی ہیں۔

یہاں ایک قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اسلام انسان کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ معاشی بنیاد پر قطع نسل کرے لیکن اگر اس کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ وہ جانوروں کو کھلا سکے تو اسے جانوروں کو باندھ کر رکھنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ وہ اتنے جانور نہیں پال سکتا جتنے کو کھلانے کی استطاعت اس کے پاس نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں اور جانوروں کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے معاشی ضابطے جدا جدا ہیں۔

اسی طرح انسانوں اور جانوروں کے مابین قتل کے حکم کے بارے میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ قرآن کی نگاہ میں انسانوں میں سے وہ لوگ جو غیر صالح (عادی مجرم اور فسادی) ہوں وہ قتل کے مستحق ہیں:

> إِنَّمَا جَزَاء الَّذِيْنَ يُحَارِبُونَ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِيُ الأَرْضِ فَسَاداً أَن يُقَتَّلُواْ أَوْ يُصَلَّبُواْ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيْهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلافٍ أَوْ يُنفَوْاْ مِنَ الأَرْضِ (المائدہ:۳۳)
>
> وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں ان کا بدلہ یہ ہے کہ انہیں بری طرح قتل کیا جائے یا سولی دے دی جائے یا ہاتھ پاؤں الٹی سمت سے کاٹ دیے جائیں یا زمین سے اچک لیا جائے۔

جب کہ جانوروں کے قتل (ذبح) کے سلسلہ میں اسلام کا ضابطہ یہ ہے کہ انہیں صالح حالت میں ذبح کیا جائے۔ اللہ کے نزدیک اس جانور کی قربانی زیادہ پسندیدہ ہے جو اصلح (خوب فربہ و تیار ہو۔ قربانی کے احکام میں اس کی صراحت ملتی ہے کہ کن کٹا، سینگ ٹوٹا ہوا، لنگڑے یا اور کسی نقص کے حامل جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔ اس فرق سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ جانور جب کسی کام کے لائق نہ رہ جائے اس وقت اسے ذبح کر کے اس کو استعمال کرنا کراہت سے قریب ہے۔

ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن البراء بن عازبؓ ان رسول الله ﷺ سئل ماذا تيقى من الضحايا فاشار به فقال اربعا العرجاء البين ظلعها والعوراء البين عورها والمريضة البين مرضها والعجفاء التى لا تنقى. (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

حضرت براء بن عازب سے مروی ہے کہ اللہ کے رسولؐ سے ایک مرتبہ سوال کیا گیا کہ کس قسم کے جانوروں کی قربانی نہیں کرنی چاہیے تو آپ نے اپنے دست مبارک سے چار کا اشارہ فرمایا اور بتایا کہ ایسا لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن واضح ہو، اندھا، جس کا اندھا پن واضح ہو، بیمار جس کا مرض ظاہر ہو، اور وہ دبلا جانور جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو صلاحیتیں بخشی ہیں ان کا اصل استعمال یہ ہے کہ ان سے احسان شناسی پر مبنی زندگی گزاری جائے۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالأَبْصَارَ وَالأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (النحل:۷۸)

اس نے تمہیں کان، آنکھ اور دل دیے ہیں تا کہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

سورۃ المومنون ۷۸۔ سورۃ السجدۃ ۹ اور سورۃ الملک ۲۳ میں ان صلاحیتوں کو پانے کے باوجود بھی احسان شناس نہ بننے کا ذکر ہے۔ گویا ایک دوسرے اسلوب میں ان صلاحیتوں کے صحیح استعمال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اس نے یہ بھی جتلا دیا ہے کہ وہ تمہاری شکر گزاری کا مستحق تو ہے محتاج نہیں ہے:

وَمَن شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ (النمل:۴۰)

جو شکر کرے گا وہ اپنے ہی لیے شکر کرے گا۔

سورہ لقمان (آیت ۱۲) میں ومن یشکر کے الفاظ کے ساتھ یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

إِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنكُمْ وَلَا يَرْضَى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ (الزمر:۷)

اگر تم کفر کرو گے تو اللہ تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں سے کفر کو پسند نہیں کرتا۔

انسانوں کے اندر سننے دیکھنے اور بولنے وغیرہ کی جو صلاحیتیں ہیں ان میں تو کسی حد تک دوسرے چوپائے اور جانور بھی شریک ہیں لیکن ان کا امتیاز یہ ہے کہ انسانوں کے ان اعضاء کو ان کا قلب کنٹرول کرتا ہے اور قلب ہی کا صالح ہونا ان اعضاء کے استعمال کو صالح بناتا ہے اور قلب کا فساد اعضاء کے اعمال میں فساد پیدا کر دیتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وھی القلب.

جسم میں گوشت کا ایک حصہ ایسا ہے کہ جب وہ صالح ہوتا ہے تو سارا جسم صالح ہوتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا جسم بگاڑ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو وہ حصہ دل ہے۔

یہی قلب ایمان، تقویٰ، اخلاص جیسی اہم دینی کیفیات کا مسکن ہے۔ اس کے معطل ہو جانے کے بعد سارا جسم بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید نے بہت بلیغ انداز میں ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے:

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (الحج:۴۶)

آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں موجود رہتے ہیں۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعضاءِ انسانی کا معذور ہو جانا اتنا زیادہ قابل لحاظ نہیں ہے جتنا کہ دل کا معطل ہو جانا۔ قرآنی اسلوب کو مستعار لیتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جو لوگ حق کو جان کر اس کی گواہی نہیں دیتے اور حق بات سننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے وہ دل کے گونگے اور بہرے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے دل کی وہ صلاحیت ہی ختم ہوگئی ہے جو ان کے کان کو حق سننے اور زبان کو حق کی شہادت دینے کے لیے آمادہ کر سکتی۔

قرآن نے واضح طور پر یہ اعلان کیا ہے کہ کسی مذہب کا ماننے والا شخص اگر کفر کا مرتکب ہوگا تو وہ بدترین خلائق قرار پائے گا۔ اسی طرح ہر وہ شخص جو اللہ پر ایمان لائے اور عمل صالح سے اپنی زندگی مزین کرے تو وہ بہترین خلائق ہوگا۔ (البینۃ: ۶،۷) قرآن کی یہ تفریق خالص صفاتی بنیادوں پر ہے۔ اسے کسی خاص فرقہ یا نسلی یا لسانی گروہ سے کوئی محبت یا خصومت نہیں ہے۔

تہذیب جدید کا یہ المیہ ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے مختلف فلسفے تراشے اور سب کی ناکامی دیکھی اس کے باوجود انسانی قدروں کی پاسداری کا کھوکھلا اعلان ہیومنزم اور سیکولرزم جیسے نعروں کے ذریعے کیا جا رہا ہے۔ گزشتہ دو عالم گیر جنگوں نے انسانی بے حرمتی کی جو مثالیں پیش کی ہیں۔ آج کی مزید ترقی یافتہ دنیا ایسی مثالیں دنیا کے مختلف حصوں میں پیش کر رہی ہے تہذیب حاضر کے اصولوں اور ان کے اطلاقات یا عملی مظاہر میں آج جیسا کھلا تضاد سامنے آیا ہے شاید اس سے قبل نہ دیکھا گیا ہو۔

(شائع شدہ، زندگی نو اکتوبر ۱۹۹۲ء)

رشید احمد صدیقی کی تنقیدِ اقبال

[یہ مقالہ فکر ونظر علی گڑھ کے علاوہ اقبالیات (اردو) اقبال اکادمی لاہور، جنوری۔ مارچ۔ جولائی۔ ستمبر ۱۹۹۸ء میں بھی اسی عنوان سے شائع ہوا۔ (ادارہ)]

رشید احمد صدیقی کے نظام نقد میں جن شاعروں کو بطور خاص پایہ اعتبار حاصل ہے، ان میں غالب، حالی، اکبر اور اقبال خصوصی امتیاز کے حامل ہیں۔ اکبر اور اقبال خصوصی امتیاز کے حامل ہیں۔[۱] یہ عناصر اربعہ ان کے نزدیک اردو شاعری کے محافظ، پاسبان اور آبرو ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ غالب، حالی اکبر اور اقبال نے اردو شعر وادب کے حسب ونسب اور معیار وموقف کو پورے طور پر مستحکم نہ کر دیا ہوتا تو اس دور رسوائی وشکست وریخت میں جب پچھلی تمام قدریں ٹھکرائی جارہی ہیں، شعر وادب کے ہر روز نئے تجربے اور تحریکیں اردو شاعری کو معلوم نہیں کس ناگفتنی تک پہنچا دیتیں''۔[۲]

رشید احمد صدیقی کی تحریروں کے مطالعے سے اس امر کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ جدید شعراء میں اقبال نے انھیں سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ جدید اردو شاعری کا جہاں بھی ذکر آئے گا، خواہ وہ فنی نزاکت کا مسئلہ ہو یا فکری اور موضوعی عظمت کا معاملہ، ہر جگہ کسی نہ کسی عنوان سے اقبال انھیں ضرور یاد کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''غالب اور اقبال، دونوں مشیت کی اصلاح کے درپے تھے یا اس سے بغاوت کرتے تھے''۔[۳]

واضح رہے کہ رشید صاحب کے نزدیک شاعری کی عظمت کا ایک پیمانہ خدا سے گستاخی اور عورت سے احتیاط بھی ہے۔

''اقبال اور حالی کے کلام کا سنجیدگی اور احترام سے مطالعہ کیے بغیر ملت اور ملت کے بخشے ہوئے فضائل کا ادراک واحساس آسان نہیں ہے۔ یہ فیضان ہے عشق رسول کا جس نے ان شعراء کے کلام کو گراں مایہ اور لازوال بنا دیا ہے''۔[۴]

''اکبر اور اقبال نے اپنی اپنی شاعری میں جن خاص الفاظ کو جن معنوں میں استعمال کر دیا ہے، کوئی دوسرا ان کو اس طرح استعمال نہیں کر سکا، اور کوئی ایسا کرتا بھی ہے تو صاف ظاہر ہونے لگتا ہے کہ وہ نقال اور بے بضاعت ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دونوں کی شاعری اور شخصیت کی جڑیں ان مصلحات کی آب وگل میں پیوست ہیں''۔[۵]

نگارشات ڈاکٹر منور حسین فلاحی کے چند نمونے

''ہر بڑی تہذیب کے کھنڈر پر کوئی نہ کوئی حالی یا اقبال ضرور نمودار ہوتا ہے۔ اگر نہ ہو تو اس تہذیب پر فاتحہ پڑھ لینے کے سوا چارہ نہیں''۔۶

رشید صاحب اپنی اکثر تحریروں میں ایک سے زائد ادیبوں میں مماثلتیں بھی تلاش کرتے ہیں اور ان کے امتیاز پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ انھوں نے اپنے متعدد مضامین میں اقبال کا موازنہ بھی دوسرے شعراء سے کیا ہے۔ مثال کے طور پر ''اکبر پر ایک نظر'' میں فرماتے ہیں:

''اکبر جو بات ہریجن الفاظ، ہریجن انداز، اور ہریجن ماحول میں آج سے پہلے کہہ گئے، اقبال نے وہی باتیں حکیمانہ انداز، شاعرانہ حسن اور شاہانہ جلال سے پچیس تیس سال بعد کہیں''۔۷

الفاظ، انداز اور ماحول کے لیے لفظ ''ہریجن'' کے استعمال وانتخاب سے قطع نظر فکر وموضوع کی مماثلت کو ذہن میں رکھئے اور یہ دیکھئے کہ اسی مضمون میں دونوں شاعروں کے مقصد ومنہاج میں اختلاف کو کس طرح واضح کرتے ہیں:

''غالب اور اقبال، دونوں مشیت کی اصلاح کے درپے تھے یا اس سے بغاوت کرتے تھے۔ اکبر ہماری آپ کی اصلاح کے درپے تھے اور سوسائٹی سے برسرِ پیکار تھے''۔۸

کوئی بھی صاحب نظر سرسری مطالعے میں اسے نکتے کی بات تو تصور کرسکتا ہے مگر درحقیقت مذکورہ بالا بیان اور اقبال سے متعلق دیگر بیانات میں جو تضاد ہے، اس کا ذکر محتاج تفصیل نہیں ہے، البتہ موضوع کا تقاضا اور موقع ومحل کی رعایت کا مقتضا یہ ہے کہ اسے ایک وقتی جذبہ ہمدردی کے تحت دیئے گئے فیصلے سے زیادہ اور کچھ نہ سمجھا جائے۔

غزل گوئی اور کسی اعلیٰ وبرتر نصب العین کی تبلیغ دو متضاد عمل معلوم ہوتے ہیں۔ رشید صاحب نے اقبال کی عظمت اس میں تلاش کی ہے کہ وہ کس طرح ان دو متضاد رویوں کو باہم دِگر مربوط کردیتے ہیں جس سے گویا ایک طرف اس مقصد کو ایک حسین طرز اظہار میسر آجائے اور دوسری طرف شاعری کی ایک صنف اپنی مریضانہ ذہنیت کے حصار سے باہر آجائے۔ لکھتے ہیں:

''اقبال نے اپنی غزلوں میں ہم کو یہ محسوس کرایا کہ عشق ومحبت دل ہی کا ماجرا نہیں بلکہ ذہن کا بھی ہے۔ نئی غزل گوئی کا یہی سنگ بنیاد ہے۔ غالب کے یہاں بھی دل وذہن کا یہ ماجرا ملتا ہے، لیکن انھیں یہ سہولت حاصل تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو کسی مخصوص مقصد یا نقطہ نظر کا پابند نہیں رکھا تھا۔ وہ جو چاہتے تھے، کہہ سکتے تھے۔ اقبال اپنے سامنے ایک مقصد رکھتے تھے

جس سے وہ ہم کو آشنا کرانا چاہتے تھے۔ یہ مقصد تھا اسلامی عقائد کی برتری اور اسلامی اعمال کی برگزیدگی کا۔ اپنی شاعری میں اقبال نے انہی دو پر سب سے زیادہ زور دیا ہے‘‘۔۹

اپنے ایک خطبے میں وہ اقبال کا غالب سے یوں موازنہ کرتے ہیں:

’’جہاں تک مسائل علمیہ وفکریہ کو شعر میں ڈھال کر دلنشیں اور فکر انگیز بنانے کا تعلق ہے، غالب کی زبان سے اقبال کی زبان زیادہ متوازن اور شگفتہ ہے‘‘۔۱۰

رشید صاحب نے کسی شاعر سے موازنے میں جہاں اقبال کے امتیازات کا ذکر کیا ہے، وہیں مجموعی حیثیت سے تمام شعراء کے مقابلے میں ان کی انفرادیت، خصوصیت اور عظمت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کا سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ رشید صاحب اردو شاعری کی پوری تاریخ میں اقبال کو سب سے زیادہ صاحب علم و دانش انسان سمجھتے ہیں۔ اور علم کی فضیلت تو ہر میدان میں تسلیم شدہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’اقبال سے پہلے کوئی شاعر ایسا نہیں گزرا جس نے قوموں کی تقدیر اور انسانیت کے تقاضوں کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہو جتنا اقبال نے۔ وہ ہمارے تمام شعراء سے زیادہ لکھے پڑھے شاعر تھے۔ ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ علوم وفنون ہی کا نہیں، یزداں، انسان اور شیطان سبھی کا۔ ان کی نظر میں وہ تمام تہلکے اور تحریکیں تھیں جن سے زندگی دوچار تھی، اور انسانیت معرض خطر میں۔ ایسے وقت میں یا تو پیغمبر پیدا ہوتے ہیں یا شاعر‘‘۔۱۱

اس اقتباس کا ایک قابل غور پہلو یہ بھی ہے کہ رشید صاحب پیغمبر کی طرح گویا شاعر کی بعثت کے بھی قائل ہیں۔ جس طرح پیغمبری میں قصد و ارادہ کو دخل نہیں ہوتا، اسی طرح شاعری بھی کسب و اکتساب سے الگ ماورائی اور الہامی ملکہ ہے، بالخصوص عظیم شاعری جس کی مذہبی یا ماورائی بنیاد کی طرف رشید صاحب یوں اشارہ کرتے ہیں:

’’مذہب کا حقیقی تصور حیات و کائنات کا بڑا تصور ہے، اور ہر بڑی شاعری کا سوتا کسی نہ کسی عظیم تصور حیات کائنات سے پھوٹتا ہے۔ یہ عظیم تصور اسلامی بھی ہوسکتا ہے، عیسوی بھی اور ہندو بھی...... بڑی شاعری کا ماخذ بیشتر مذہبی یا ماورائی رہا ہے‘‘۔۱۲

اپنے اسی مضمون میں وہ شاعری کے سلسلہ بعثت کا اظہار بھی مختلف پیرایوں میں کرتے ہیں:

’’مجھے اکثر یہ محسوس ہوا ہے کہ بیسویں صدی میں شاعری نے مشرق کی پیغمبری اقبال اور ٹیگور کو تفویض کی، اور مشرق کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اس کا حق اس خلوص اور خوبصورتی سے ادا کیا ہو جتنا ان دونوں نے۔ میرا خیال ہے کہ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے، کم سے کم اس صدی کے بقیہ نصف میں شاید اقبال سے بڑا شاعر پیدا نہ ہوگا‘‘۔۱۳

اقبال کے فنی ریاض کے حوالے سے رشید صاحب اپنے اسی خیال کا اعادہ ان لفظوں میں بھی کرتے ہیں:

''اقبال کی شاعری اور ان کے افکار کے سمت و رفتار کے مطالعے سے ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال نے فن کے رموز، زبان کی اہمیت اور شاعری میں فکر جذبے اور تخیل کے مقامات پہچاننے میں کتنا ریاض کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعری نے اقبال کو اقبال بنانے میں اپنی ساری آزمائشیں ختم کر دی ہوں، اور اس کے بعد ان پر ساری نعمتیں بھی تمام کر دی ہوں جیسے اردو شاعری کا دین اقبال پر مکمل ہو گیا ہو'' ۔۱۴

اردو زبان کی شاعری سے الگ، پوری دنیا کی شاعری میں مسلمانوں کا جو حصہ ہے، ان سب کے مقابلے میں اقبال کے وجوہ امتیاز کا ذکر ایک خطبے میں یوں ملتا ہے:

''شاعر، مفکر اور رہبر کی حیثیت سے اقبال کو ہمارے ادب زندگی میں جو درجہ حاصل ہے، وہ آج تک کسی مسلمان شاعر، مفکر یا ادیب کو حاصل نہیں ہوا'' ۔۱۵

رشید صاحب کی تنقید ادب کا ایک نمایاں رخ یہ ہے کہ وہ فن کار یا تخلیق کی علمی، تہذیبی یا سماجی حیثیت وافادیت پر بطور خاص نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دیگر ادیبوں اور شاعروں کی طرح اقبال پر لکھتے وقت بھی انھوں نے جابجا اس کی صراحت کی ہے کہ اس کی شاعری سے علم و ادب اور تہذیب و سماج کو کس طرح فائدہ پہنچا ہے یا ان میں کیا قابل لحاظ تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اسلوب احمد انصاری کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اقبال نے جن مسائل پر جو بات جس بلاغت اور خوبصورتی سے کہہ دی ہے، غالباً سعدی کے بعد اب تک کسی نے نہیں کہی۔ مسائل حاضرہ یا وقتی مسائل پر چند ایک شعر اس طور پر کہہ دیا ہے کہ وہ شعر زندگی کے حقائق کا ترجمان بن گیا ہے'' ۔۱۶

اقبال کی شاعری میں فکر و فلسفہ کی جو کارفرمائی ہے، اس کے امتیازی پہلو پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''تنوع یا تضاد شاعری کا حسن یا مزاج ہے اور فلسفے کا نقص یا نارسائی۔ اقبال نے فلسفے کو شاعری کا منافی نہیں بتایا ہے، بلکہ ان کو ایک دوسرے کو محرمی و مشاطگی پر مامور کیا ہے۔ فلسفے کی اہمیت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے، لیکن بحیثیت مجموعی، اور آخر کار فلسفے کو گوارا اور فعال شاعر اور اس کی شاعری ہی بناتی ہے'' ۔۱۷

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''جس طرح مسائل کی توضیح میں تدبر کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہی تدبر حکیم یا فلسفی کی بڑائی اور کامیابی کی دلیل ہے، اس طور پر جذبات کا احتساب کرتا اور اس کو مناسب و موزوں

اسالیب میں ڈھالنا شاعری کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اقبال کی شاعری، شاعری کی معراج ہے۔ انھوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دیا ہے اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشا۔ دونوں صورتوں میں اقبال کا آرٹ اور اعتقاد دوش بدوش کار فرما ملتے ہیں۔ اقبال نے ملکات فطری کو بشری ریاضتوں اور ماورائی بصیرتوں سے ایک نئی حسین اور لازوال صورت بخشی'' ۔۱۸

کلام اقبال کے فنی پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس کی خوبیوں کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''اقبال کا کلام حشو وزوائد سے یکسر پاک ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا ذوق کتنا انتخابی اور ذہن کتنا اختراعی تھا--- ہیئت، موضوع اور مواد اور حسن زبان و بیان کے اعتبار سے ان کا کلام نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا نمونہ جس تک پہنچنا ناممکن نہیں تو نہایت درجہ دشوار ہونے میں شک نہیں'' ۔۱۹

رشید صاحب کی تحریروں میں مختلف اصناف سخن کے حوالے سے بھی اقبال کے اجتہادات و امتیازات کا ذکر ملتا ہے جن کی بنا پر وہ اصناف نئی جہتوں سے روشناس ہوئیں اور ان میں انقلاب آفریں اور پُر تاثیر تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ نعت اور مرثیے کی روایات ہمارے ادب میں خاصی قدیم ہیں اور ان کے متضمنات سے بھی ہم آگاہ ہیں۔ رشید صاحب کی یہ عبارت دیکھیے:

''عشق رسولؐ کا تصور ہمارے ذہنوں میں میلادناموں اور میلادخانوں کا دیا ہوا تھا۔ حالی اور اقبال نے اس کو وہاں سے نکال کر مذہب و ملت کے اعلیٰ اقدار و روایات کو سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کا حوصلہ دیا'' ۔۲۰

مرثیے سے متعلق رقم طراز ہیں:

''نعت شہ کونین کی طرح شہادت سید الشہداء اور سانحہ کربلا کو اقبال نے جو نئی جہت، وسعت اور رفعت دی ہے، وہ بھی اردو شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ مرثیہ خوانی اور مرثیہ نگاری کو جو اہمیت ہمارے ادب و زندگی میں ہے، اس کو اقبال نے ایک نئے تصور اور تجربے سے آشنا کیا۔ اس طور پر اردو شاعری اور ادب میں مقام شبیری کی ایک نئی معنویت، دعوت یا علامت ظہور میں آئی اور مقبول ہوئی'' ۔۲۱

غزل گوئی کی مروجہ روایت، اسلوب اور زبان کے پس منظر میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اقبال کی غزل کی زبان اردو کے دوسرے غزل گویوں کی زبان سے مختلف بھی ہے اور مشکل بھی۔ اقبال کو غزل کے لیے نئے انداز کی ایک زبان وضع کرنی پڑی۔ ایسی زبان اور ایسا لہجہ

جس سے غزل نا آشنا تھی۔اس زبان کو غزل سے سے منوالینا بہت بڑا کارنامہ ہے'' ۔۲۲؎

غزل میں اقبال کے تصرفات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے امتیازی تجربے کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:

''اقبال نے اپنی غزلوں میں عام غزل گو شعراء کی طرح نہ زبان رکھی نہ موضوع نہ لہجہ، بلکہ ایسی زبان، موضوع اور لہجہ اختیار کیا جن کا غزل سے ایسا کوئی رشتہ نہ تھا۔اس کے باوجود ان کی غزلوں میں، تنوع، تاثیر، شیرینی، شائستگی، نزاکت و نغمگی کے علاوہ، جو اچھی غزل کے لوازم ہیں، وہ فر و فرزانگی اور قاہری و دلبری ملتی ہے جو بعض مناظر فطرت اور صحف سماوی میں ملتی ہے۔ اقبال کی غزلوں کے سامنے ہم بے ادب یا بے تکلف ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے'' ۔۲۳؎

انسانی سماج اور اس کے مختلف طبقات پر کلام اقبال کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں، ان کا بھی ایک اجمالی خاکہ رشید صاحب کی تحریروں سے مرتب ہوسکتا ہے۔ وہ اپنے ایک خطبہ میں اقبال کو اپنی صدی کا ذہنی قائد قرار دیتے ہیں:

''آج کل سیاسی قیادت بہت آسان ہے۔ ذہنی قیادت بہت مشکل ہے۔ ذہنی قیادت ہر صدی میں صرف چند ایک کے حصے میں آئی ہے۔ یہ سعادت و برگزیدگی اس صدی میں اقبال کو نصیب ہوئی'' ۔۲۴؎

اقبال کی شاعری رشید احمد صدیقی کے نزدیک موجودہ صدی کا علم کلام ہے۔نقوش اقبال کے مقدمے میں اس پہلو پر ایک سے زائد جگہ مختلف انداز سے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اقبال کا کلام ہمارے لیے اس صدی کا علم کلام ہے جو ایک نامعلوم اور طویل مدت تک تازہ کار رہے گا، اس لیے کہ وہ ایک عظیم شاعری میں ڈھل چکا ہے۔ اسلامی عقائد، شعائر اور روایات کی جس عالمانہ، عارفانہ اور شاعرانہ انداز سے اپنے بے مثل کلام میں اقبال نے وکالت کی ہے، اس سے مسلم معاشرہ حیرت انگیز طور پر متاثر ہوا ہے۔ ایسی صحت مند اور با مقصد بیداری کا امتیاز شاید ہی کسی اور عہد کے علم کلام کے حصے میں آیا ہو'' ۔۲۵؎

اقبال کے تصور خودی و بے خودی پر مختلف شارحین اقبال نے متعدد جہتوں سے روشنی ڈالی ہے۔ ترجیح خودی کے اسباب بھی بتائے گئے ہیں اور خودی و بے خودی کے مابین تطبیق کی کوششیں بھی ہوئی ہیں۔اس نکتے کی ایک سے زیادہ قابل قبول توجیہیں بھی ہوسکتی ہیں۔ رشید صاحب کی درج ذیل تحریر بغیر کسی حوالے کے ان افکار کی کیسی جامع اور دلنشیں توجیہہ پیش کرتی ہے:

''جب تک فرد و جماعت بڑے مقصد کے لیے فکر و عمل، دونوں طرح سے مربوط و متحد نہ ہوں

گے، سوسائٹی مستحکم، صالح اور صحت مند نہیں رہ سکتی۔ شائستگی، دانشوری اور آرزومندی جس پر سوسائٹی کے قیام وترقی کا مدار ہے، شروع فرد سے ہوتی ہے، ختم جماعت پر ہوتی ہے۔ دونوں کی تربیت ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کے لیے نہیں بلکہ ان کو ہم خیال، ہم مقصد اور ہم آہنگ رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ فرد کی ہدایت اور قیادت کے بغیر جماعت بڑی قابل رحم ہوتی ہے، اتنی ہی خطرناک بھی۔ فرد کی تربیت اس لیے کی جاتی ہے، اور اس کا فرض ہے کہ وہ جماعت کو صراط مستقیم پر چلائے اور رکھے نہ یہ کہ اپنی غرض اور ہوس کا آلہ کار بنائے۔ اقبال کا بتایا ہوا فرد اور جماعت کا رشتہ ایسا ہے جس سے دونوں ایک دوسرے کے باہر نہ ہوسکیں اور ایک دوسرے کا جبر قبول نہ کرسکیں''۔[۲۶]

شاعری کو ریاضیاتی یا سائنسی منطق سے جانچنا درست ہے نہ مناسب۔ اس طریقے سے اس کی صحیح تفہیم ممکن ہے نہ اس کی موزوں تحسین۔ اقبال کے عہد سے لے کر آج تک، ہر دور میں، اقبال کی شاعری پر ایسی غلط انداز نظر سے تنقید بھی ہوتی رہی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اقبال کی شاعری فکری تضادات سے پُر ہے تو کسی کے نزدیک وہ فرقہ پرست شاعر ہے، وہ سمندر تھے کوشش کر کے دریا میں تبدیل ہوگئے، قومی شاعری سے ملی شاعری کی طرف مراجعت ان کی تنگ نظری کی دلیل ہے۔ ایک طبقہ یہ خیال کرتا ہے کہ ان کی شاعری حیات اجتماعی کے لیے مضرت رساں اور خطرناک ہے۔ اسی لیے کہ وہ شاہینی مسلک کے علم بردار ہیں اور سفا کی وخوں ریزی کی تعلیم دیتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے اس قسم کے تمام اعتراضات کا بہت ہی محکم اور دلنشیں جواب دیا ہے۔ اسی ذیل میں وہ شاعر کے منصب اور وظیفہ شاعری سے بھی بحث کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ظاہر بیں نظروں کو اقبال کے ہاں تضاد ملتا ہے۔ لیکن اقبال مسائل حیات کا حل خانوں میں نہیں تلاش کرتے تھے، ایک عالم گیر عقیدہ رحمت میں سوچتے تھے''۔[۲۷]

رشید صاحب کے نزدیک عظیم شاعری کی پہچان یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی عظیم حقیقت اور کسی نہ کسی عظیم شخصیت سے مربوط ہوتی ہے۔ اور وہ حقیقت یا شخصیت جتنی عظیم ہوگی، اسی اعتبار سے شاعری رفعت اور بلندی حاصل کرے گی۔ اقبال کی شاعری کے ماورائی اور لافانی ہونے کا راز ہی یہ ہے کہ اس کا رشتہ خدا تعالیٰ جیسی عظیم ترین حقیقت، حضرت محمد جیسی عظیم شخصیت سے ہے۔ ان کے خیال میں بڑی شاعری کی سرحدیں فرقہ پرستی سے نہیں، انسانیت سے ملی ہوتی ہیں۔ اقبال پر فرقہ پرستی کا اتہام رکھنے والوں کی یہ تنگ نظری ہے کہ وہ کسی شاعری کو جو ماورائی وآفاقی ہے، کسی مخصوص خطے یا قوم کے لیے محدود کردینا چاہتے ہیں جس طرح انسانیت ایک عالمگیر حقیقت ہے، وہ کسی طبقے یا خطے میں محصور نہیں، اسی طرح وہی شاعری عظیم ہوسکتی ہے جو چین وعرب،

دہلی وصفاہان، سمرقند و بخارا، مصر و حجاز، فارس و شام اور کوفہ و بغداد کی حدود میں مقید نہ ہو۔

سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاقی

رشید صاحب فرماتے ہیں:

''کسی شاعر یا شاعری میں منطق، فلسفے، ریاضی اور سائنس کا ربط ڈھونڈنا اور نہ پانا تعجب کی بات نہیں۔ شاعری علم نہیں ہے بلکہ شاعر کے فکر، تخیل، تاثر یا تجربے کا انفرادی جمالیاتی اظہار ہے جو مختلف حالات میں مختلف ہوسکتا ہے۔ ان میں منطقی ربط ہونا عیب نہیں، قرین فطرت ہے'' ۔[۲۸]

اقبال کے یہاں عقیدہ و فلسفہ میں جو ربط ہے، اس پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''اقبال نے اپنے عقیدہ کی بنیاد فلسفے پر نہیں رکھی بلکہ اپنے عقیدے کو فلسفے کا جامہ پہنایا۔ اگر یہ جامہ عقیدے کے جسم پر جہاں تہاں چست نظر نہیں آتا تو اس سے اقبال کے عقیدے پر حرف نہیں آتا۔ عقیدہ یوں بھی فلسفے کا دست نگر نہیں ہوتا'' ۔[۲۹]

نقوش اقبال کے مقدمے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اقبال پر ایک اعتراض یہ ہے کہ وہ عقابی یا شاہینی مسلک کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ خوں ریزی وسفا کی کے مبلغ ہیں۔ خوں ریزی وسفا کی کا مبلغ وہ شخص کیسے ہوسکتا ہے جو رحمۃ للعالمین کی صف اول کے عاشقوں میں ہو:

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

زندگی اور زمانہ جیسا کچھ ہے، اس میں عزت، عاقبت اور فراغت کے ساتھ زندہ رہنے اور کارآمد رہنے کا اس سے زیادہ معتبر اور کیا فارمولا ہوسکتا ہے۔ تواضع بغیر طاقت خوئے گداگری ہے۔ طاقتور ہونا فرائض میں سے ہے، اس کا بے جا استعمال بزدلی یعنی شقاوت ہے۔ اسی طرح کلیمی بغیر عصا کے فعل عبث ہے'' ۔[۳۰]

ایک دوسرے مقام پر اقبال کی آفاقیت کا دفاع رسول اکرمؐ سے ان کی نسبتِ خاص کے حوالے سے ہی کرتے ہیں:

''اقبال کو میں مسلمان شاعر انہی معنوں میں مانتا ہوں جن معنوں میں اسلام کو سارے جہاں کا مذہب سمجھتا ہوں۔ اگر رحمۃ للعالمین سارے جہاں کے لیے باعث رحمت ہیں تو ان کا نام لیوا خواہ شاعر ہو یا لیڈر سارے جہاں کے لیے شاعر اور لیڈر رہوگا'' ۔[۳۱]

اقبال پر اس انداز تنقید کے جو متعدد وجوہ واسباب ہو سکتے ہیں،۳۲؎ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اقبال اور رشید صاحب، دونوں کے فلسفہ حیات میں بڑی حد تک یکسانیت ومماثلت ہے۔ جن تہذیبی اقدار اور روایات پر اقبال کا ایمان واذعان ہے، رشید صاحب بھی ان کے موید ومعترف ہیں۔ مناسب ہوگا کہ ان کی فکری مماثلتوں کے بعض نمونے بھی دیکھ لیے جائیں۔

اقبال نے مارکسزم کے بعض مفید پہلوؤں کی تحسین کے ساتھ اس کی نارسائیوں اور تضادات پر بھی تنقید کی ہے۔ ان کا مشہور شعر:

تری کتابوں میں اے حکیمِ معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش حریز و کجدار کی نمائش!

انہی تضادات سے عبارت ہے۔ انسانی زندگی کے متوازن ترقی صرف اسی وقت ممکن ہے جب اس کے ہمہ جہت ارتقاء کا سامان فراہم کیا جائے۔ زندگی کا کوئی پہلو اس طرح مرکز توجہ بن جائے جس سے دوسرے جائز تقاضے بھی دب کر رہ جائیں تو ایسی زندگی ناہموار اور غیر متوازن ہوگی۔ اور اس سے بے شمار مفسدات جنم لیں گے۔

رشید صاحب لکھتے ہیں:

''جب سے اشتراکی طریق فکر وعمل کا آغاز ہوا، فرد، سماج، ادارے، مذہب وحکومت، شعروادب، فنون لطیفہ، اقدار عالیہ میں ایسا عالم گیر ہیجان، فساد وفتور آیا کہ اب تک کوئی دوسری طاقت اس کو صحت واعتدال پر لانے میں کامیاب نہیں ہوئی''۔۳۳؎

عصر حاضر حریت نسواں اور مساوات مرد وزن کے نعروں کے لیے بھی جانا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال اور رشید احمد صدیقی دونوں ہی اپنے مخصوص تہذیبی تناظر میں اس طرح کی آوازوں کے منطقی نتائج سے باخبر تھے اور انسانی سماج کے ان ناگزیر عناصر کی مخصوص صنفی تقاضوں اور حدود کار کے احترام کو سماجی فلاح وبہبود کے لیے لازمی اور قطعی گردانتے تھے۔ اقبال نے اپنے اشعار میں متعدد پیرایوں میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر:

نہ پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پُرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

ان کے اسی نقطہ نظر کی بھرپور ترجمانی ہے۔ اب اس مسئلے میں رشید احمد صدیقی کی یہ تحریر دیکھیے:

''عورت اور مرد کے مساوی حقوق یا عورت کی آزادی کا کچھ دنوں سے عالم گیر چرچا ہے۔
اس تحریک یا تفریح کے صحیح یا غلط ہونے سے قطع نظر اس دشواری کو نظر میں رکھنا پڑے گا کہ
جب تک عورت کی جنس اور فطری وظائف یا معذوریوں کو دور یا رفع نہ کیا جائے گا وہ مرد کی
محافظت سے مستغنی نہیں ہوسکتی''۔۳۴

رشید صاحب کو اقبال سے جو عقیدت تھی، وہ ان کی تحریروں سے جا بجا متشرح ہوتی ہے۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ وہ اقبال کے ایک شیدائی کو لکھتے ہیں کہ آپ کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ اقبال کی بعض نظمیں وقتی قدر و قیمت رکھتی ہیں یا یہ کہ اسرار و رموز کو آپ نے کم اہمیت دی ہے۔۳۵

اس صدی کے سب سے عظیم شاعر کے اعتراف کے باوجود وہ ان کے تمام افکار کو من وعن قبول کرنے پر آمادہ بھی نظر نہیں آتے۔ مغربی نشاۃ ثانیہ کے جلو میں جو افکار بہت عام ہوئے، ان میں سے ایک دین وسیاست کی علیحدگی کا نظریہ بھی تھا۔ اقبال نے اپنی شاعری میں اس تصور پر زبردست تنقید کی ہے۔ ان کا ایک شعر ہے:

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ایسا خیال گزرتا ہے کہ رشید صاحب، اقبال کی اس فکر سے کلیتاً متفق نہیں تھے۔ فرماتے ہیں:

''سوچتا ہوں کہ دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے پر جس چنگیزی سے سابقہ
ہوگا، وہ قابل قبول ہے یا دین کو سیاست سے جوڑنے میں جس چنگیزی سے سابقہ ہوگا، وہ
قابل ترجیح ہے''۔۳۶

غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ رشید صاحب اصولی طور پر اس فکر کے مخالف تھے کہ دین وسیاست دو جداگانہ حقیقتیں ہیں اور ان کی علیحدگی ناگزیر ہے، تاہم ان کے سامنے دین وسیاست کے امتزاج پر مبنی تاریخ چنگیزی بھی تھی جس سے یورپ نشاۃ ثانیہ کے نتیجے میں باہر نکل آیا تھا۔ رشید صاحب کی خواہش یہ معلوم ہوتی ہے کہ دین کے پردے میں چنگیزی کا وہ عمل اب مزید نہ دہرایا جائے جسے مسیحیت نے اپنے دور ظلمت میں بطور خاص روا رکھا تھا، اور نشاۃ ثانیہ کے سورج کے طلوع ہونے تک جس کا سلسلہ دراز رہا۔ اس چنگیزی سے سیاست کی بدنامی اتنی قابل تشویش نہیں ہے جتنی دین کی بدنامی ورسوائی۔ آج کا افغانستان اس کی عبرتناک مثال ہے۔

حواشی و مراجع

ا۔ اس فہرست میں اضافہ بھی ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے: ''حسرت، اقبال، اصغر، فانی، جگر اور

فراق اس پچاس سال کو اردو غزل گوئی کا عہد زریں سمجھتا ہوں''۔(جدید غزل،علی گڑھ،۱۹۵۵ء،ص:۱۴)

۲۔ ابوالحسن علی ندوی،''نقوش اقبال'' مترجم شمس تبریز خاں،لکھنؤ طبع دوم،۱۹۷۲ء،(مقدمہ)

۳۔ ''اکبر پر ایک نظر''،مشمولہ''علی گڑھ میگزین''،اکبر نمبر،۱۹۵۰ء

۴۔ ابوالحسن علی ندوی،''نقوش اقبال'' ۵۔اکبر پر ایک نظر،حوالہ بالا

۶۔ جدید غزل،ص:۱۵ ۷۔اکبر پر ایک نظر،حوالہ بالا

۸۔ ایضاً ۹۔جدید غزل،صفحات نمبر۳۴-۳۵

۱۰۔ خطبہ صدارت یوم اقبال،۱۹۴۵ء،(رامپور)،مشمولہ''خطبات رشید احمد صدیقی''مرتبہ:مہر الٰہی ندیم ولطیف الزماں خاں،کراچی،۱۹۹۱ء

۱۱۔ جدید غزل،ص:۳۷ ۱۲۔ایضاً،صفحات:۳۶-۳۷ ۱۳۔ ایضاً،صفحہ:۳۹

۱۴۔ایضاً،صفحات:۳۷-۳۸ ۱۵۔ خطبہ صدارت،یوم اقبال،حوالہ بالا

۱۶۔ اصغر عباس،ڈاکٹر،رشید احمد صدیقی:آثار واقدار،شعبہ اردو،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ،۱۹۸۴،ص:۱۸۹

۱۷۔ نقوش اقبال،(مقدمہ)،حوالہ بالا ۱۸۔رشید احمد صدیقی،''گنجہائے گراں مایہ''

۱۹۔ نقوش اقبال،حوالہ بالا ۲۰۔ایضاً،ص:۲۱ ۲۱۔ایضاً،ص:۲۱ ۲۲۔ایضاً،ص:۳۸

۲۳۔ جدید غزل،ص:۳۴ ۲۴۔خطبہ صدارت،یوم اقبال،حوالہ بالا

۲۵۔ نقوش اقبال،حوالہ بالا ۲۶۔ایضاً ۲۷۔ جدید غزل،ص:۳۷ ۲۸۔ایضاً

۲۹۔ ایضاً،ص:۳۵ ۳۰۔نقوش اقبال،حوالہ بالا ۳۱۔خطبہ صدارت یوم اقبال،حوالہ بالا

۳۲۔ یہ معلوم ہے کہ اقبال،رشید صاحب کی ادبی صلاحیت کے بہت معترف تھے جیسا کہ رشید صاحب کی ریڈر شپ کے عمل میں اقبال کے سفارشی کلمات سے واضح ہے۔ممکن ہے اس علم واطلاع کے بعد اقبال سے رشید صاحب کی محبت وعقیدت میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہو۔

۳۳۔ مضمون'عزیزان علی گڑھ'،مشمولہ'فکر ونظر،علی گڑھ،۱۹۷۲ء،ص:۱۶۵

۳۴۔ ایضاً،ص:۱۵۰ ۳۵۔رشید احمد صدیقی،آثار واقدار،ص:۱۸۹

۳۶۔ رشید احمد صدیقی،آشفتہ بیانی میری،مکتبہ جامعہ نئی دہلی،۱۹۷۷ء،صفحات:۸۳-۸۴

(بشکریہ فکر ونظر علی گڑھ،جنوری۔مارچ ۱۹۹۶ء)

اداریہ ماہ نامہ رفیق منزل، اگست ۱۹۸۸ء

دنیا کا ہر نظریہ اپنے ماننے والوں سے قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور بغیر قربانیوں کے کسی نظریہ کی اشاعت کی امید بھی نہیں کی جاسکتی۔ اسلام بھی جو اس سرزمین پر سب سے مستحکم نظام فکر و عمل ہے۔ اپنی اشاعت کے لیے اپنے فرزندوں سے قربانیوں کا طالب ہے۔ قرآن مجید میں جان اور مال کے ذریعہ جس جہاد کا مطالبہ بارہا کیا گیا ہے وہ اپنی اصل میں انسان کی بدنی اور مالی سرمایوں اور صلاحیتوں کو کھپانے ہی کا دوسرا نام ہے۔ جو شخص اس راہ میں قربانیوں کی جتنی مقدار پیش کرے گا وہ اللہ کی نگاہ میں اتنا ہی عزیز اور بلند مرتبہ قرار پائے گا۔ دنیا میں محبوبیت اور مرتبہ کی بلندی بھی اللہ کی بارگاہ میں مرتبہ کے تعین ہی سے قرار پاتی ہے۔ قربانیوں کی جو مقدار مطلوب ہے وہ فرد کی اپنی وسعتوں اور صلاحیتوں کے اعتبار سے ہے یہاں مقدار اور تعداد سے زیادہ اہمیت جذبہ و کیفیت کی ہے۔ سنہ ہجری کی ابتدا جس ماہ سے ہوتی ہے وہ ہمیں دو عظیم ہجرتوں کی یاد دلاتی ہے۔ ایک موسیٰ و بنی اسرائیل کی ہجرت جس کی یاد میں عاشورہ کے روزہ رکھنے کی تاکید آپؐ نے فرمائی دوسری خود حضرت محمدؐ اور مومنین کی مکہ سے مدینہ کو ہجرت۔ یہ ہجرت بھی راہ خدا کی عظیم ترین قربانیوں میں سے ایک ہے۔ جو شخص یہ مرحلہ طے کرلیتا ہے۔ اس سے ہر قسم کی قربانی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس لیے کبھی کبھی یہ ایمان و نفاق کے درمیان حد فاصل بھی بن جایا کرتی ہے۔ ہجرت کا عمل اس بات کا بھی حتمی ثبوت فراہم کردیتا ہے کہ مومنین و کافرین میں وکہ عناد و مخالفت صرف اللہ کا دین یا بالفاظ دیگر وہ دعوت ہے جسے مومنین پیش کرتے ہیں کوئی مادی، علاقائی یا معاشی مفادات کا ٹکراؤ یا اشتراک اس خصومت کی بنیاد نہیں ہے اسی لیے ہجرت قتال فی سبیل اللہ کے لیے ایک اہم موڑ بھی ثابت ہوتی ہے اور حق و باطل میں امتیاز کا ایک واضح اعلان بھی۔ دعوت دین کی ہر کوشش کے لیے اس مرحلہ کا آنا ناگزیر ہے۔

اس طرح اسلامی سال کی انتہا ایک ایسے ماہ پر ہوتی ہے جو تسلیم و رضا کی راہ میں قربانیوں کی ایک عظیم الشان یادگار ہے۔ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام اور ان کے خاندان کی قربانیوں کا یہ مہینہ ہے۔ جس کی یاد اگر صحیح روح کے ساتھ منائی جائے تو امت مسلمہ میں نئی زندگی پیدا کردینے اور اسے امامت و قیادت کے منصب اصلی پر فائز کردینے کے لیے کافی ہے۔ (بشکریہ ماہ نامہ رفیق منزل، اگست ۱۹۸۸)

تبصرے

لوحِ ایام: مختار مسعود

لوح ایام، آواز دوست اور سفر نصیب کے بعد مختار مسعود کی ادبی و علمی دشت نوردی کا تیسرا پڑاؤ ہے۔ تصنیف کی مقبولیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ ایک ماہ کے عرصے میں دوسرا ایڈیشن فروری ۱۹۹۶ء) شائع ہوا۔

یہ کتاب اپنے خالص اصطلاحی معنوں میں نہ آپ بیتی ہے نہ سفر نامہ اور نہ تاریخ۔ اپنے مشتملات کے اعتبار سے اسے ایک جہاں معنی اور مجموعہ اصناف کہا جا سکتا ہے۔ گرچہ یہ ہمارے عہد کی داستان ہے۔ یعنی بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے ایران کے حوالے سے اپنے اپنے کثیر النوع مشاہدات و تجربات کا بیان ہے، مگر اس میں ڈھائی ہزار سالہ تاریخ ایران کے مختلف ابواب بھی محفوظ ہو گئے ہیں اور نہ صرف تاریخ ایران بلکہ تاریخ عالم کے متعدد مماثل اور مخالف واقعات و کیفیات بھی مختلف حوالوں سے مرقوم ہیں۔

سترہ ابواب پر مشتمل اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ شاہنامہ، آمدنامہ، منظر نامہ۔ آٹھ ابواب شاہنامہ کے حصے میں آئے اور منظر نامہ کو پانچ ابواب ملے۔ شاہنامہ ایرانی شہنشاہیت اور آخری شاہ ایران کے احوال، اس کے خلاف روز بروز بڑھتے ہوئے طوفان کا بیان ہے تو آمدنامہ انقلاب ایران کے بعد کا احوال ہے۔ جس کے عناوین ہیں بازگشت، خانہ جنگی، خوف و خوں اور فرد جرم اور منظر نامہ ایران کے فکری و تخلیقی سرمایوں کا مطالعہ ہے۔

مختار مسعود اپنے اسلوب بیان کی طرح عناوین و انتساب میں بھی جدت و ندرت پیدا کرتے ہیں۔ کتاب کا انتساب چراغ اور دریچے کے نام ہے۔ وہ چراغ جس سے اندھیرے چھٹ جائیں گے اور بے سمت سفر کو سمت میسر آئے گی اور وہ دریچہ جو روشن مستقبل کی جانب کھلتا ہے جس سے تازہ ہوا آئے گی اور جہان تازہ کی خبر لائے گی۔ انتساب کے یہ دو بنیادی الفاظ ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد کی ایک نظم ص ۴۷۱ سے ماخوذ ہیں جس کا تعارف برہنہ حرف نگفتن کی بہت عمدہ مثال ہے۔ وہ شبستان میں صرف کیے ہوئے لمحات کا راز فاش کرنے میں منہمک ہے۔ یہ خاتون شاعرہ پہلے کپڑے تو پہن لے پھر اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں گے۔ (ص ۴۶۷)

وجہ تصنیف دیباچے کی یہ عبارت بتاتی ہے:

> ''انقلاب خواہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو اس کی داستان ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔ امید اور عمل، بیداری اور خود شناسی، جنوں اور لہو کی داستان بھی کہیں پرانی ہو سکتی ہے۔ زمانہ بار بار اس کو

دہراتا ہے۔فرق صرف نام، مقام اور وقت کا ہوتا ہے۔''

اس انقلاب کا مشاہدہ مصنف جس بالغ نظری سے کرتے ہیں اور یہ مشاہدہ جس طرح ان کے تجربے کا حصہ بنا ہے، اس کی گواہی اس کتاب کا ہر ہر صفحہ اور ہر ہر سطر دیتی ہے۔ اس انقلابی عمل میں مصنف کا رویہ کیسا تھا، یہ عبارت اس کی بھرپور عکاسی کرتی ہے:

''انقلاب اگر اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ تمہارے سامنے ہو تو پھر سکون کی خواہش کے کیا معنی۔ انقلاب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالو، اس کے خطرات کے ساتھ زندگی بسر کرو، اس کی رفتار پر نظر رکھو، حساب طلبہ اور سخت گیری کا تماشا دیکھو، انار کی کا نظارہ کرو۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر کوئی استاد میسر آ جائے تو انقلاب کے فلسفے سے بھی واقفیت حاصل کرو میں اس کوشش میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ شاگرد میں ہوں، استاد کا نام مطہری ہے۔ عقیدے کا فرق شاگردی اور استادی میں حائل نہیں ہوتا، اس میں کچھ کمال شاگرد کا بھی ہے۔'' (ص ۴۴۱)

مصنف کے اسلوب کا سب سے نمایاں وصف واقعات پر نگاہ عبرت ڈالنا اور اسرار و حکم کو سلیقے سے پیش کرنا ہے۔ عبرت و حکمت کے کتنے ہی انمول موتی اس کتاب کا حصہ بن گئے ہیں۔

ایرانی انقلاب کی قیادت اور پاکستانی سیاست میں مصروف علماء کا فرق ان الفاظ میں ظاہر ہوا ہے۔

''ایک ہوم ورک کیے بغیر عوامی سطح پر بولنے کا عادی ہے دوسرا پہلے نظریہ سازی اور منصوبہ بندی کرتا ہے پھر منہ کھولتا ہے۔'' (ص ۴۴۵)

اسی طرح دونوں ممالک کے جلوس کا فرق دیکھیے:

''تہران کا بادشاہ ہٹاؤ جلوس لاہور کے حکومت گراؤ جلوس سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ نہ وہاں ٹریفک جام ہوتی ہے اور نہ اسٹریٹ لائٹ یا منی بس توڑی اور جلائی جاتی ہے۔ اور نہ ہی جلوس میں شریک عورتوں پر کوئی بری نظر ڈالتا ہے۔''

شاہ کے اسباب زوال کے ضمن میں یہ بیان بڑا عبرت خیز ہے کہ کس طرح یحییٰ خاں کی عیاشی و بلانوشی پاکستان کو دو نیم کر دینے کا سبب بنی۔ (ص ۳۶۹-۷۰)

مشرقی ممالک کی پس ماندگی کی متعدد وجوہ ہیں۔ ان میں ایک اہم وجہ حکمرانوں کا عدم احتساب ہے۔ لکھتے ہیں:

''جہاں یہ سوال کرنے کی روایت ترک کر دی جائے کہ سربراہ ریاست کے پاس دوسری چادر کہاں سے آئی تو پھر حکمرانوں کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں وہ دوسری چادر کے بجائے

کپڑا بنانے کے کارخانے اور انہیں سرمایہ فراہم کرنے والے بنکوں پر قابض ہو جاتے ہیں۔'' (ص ۱۶۹۔۱۶۸)

شاہ کے خلاف مظاہروں میں شدت آئی تو شاہ پرستوں اور عافیت پسندوں نے ہجرت شروع کر دی۔ مرگ برشاہ، کے نعرے نے امریکہ تک ان کا تعاقب کیا۔ مصنف نے سفر امریکہ میں اس نعرے کو سنا تھا۔ لکھتے ہیں: نعرہ گلے سے نکلے تو آواز کی رفتار سے سفر کرتا ہے اور دل سے نکلے تو خیال کی رفتار سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔''

بعض معروف حقائق کو مصنف کا منفرد اسلوب دلکش پیرائے میں ظاہر کرتا ہے اور اپنی منفرد قبائے تعریف انہیں اٹھنا ہے: مچلا جب لوگ بیٹھنے سے انکار کر دیں تو اس عمل کو جلوس کہتے ہیں، جب عوام اپنی گردن پر سوار ہونے والوں کو نیچے پٹک دیں تو اس عمل کو انقلاب کہتے ہیں۔

آداب کلام کے سلسلے میں یہ جملہ کتنا معنی خیز موثر اور پرکشش ہے ''بحث ومباحثہ میں جس کا موقف کمزور ہو اس کا چہرہ سرخ اور آواز بلند ہوتی ہے۔''

مصنف کے اسلوب کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ جس خیال ونظریے کی وہ پوری ذمہ داری نہیں لینا چاہتے وہ حدیث دیگراں کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ ایرانی انقلاب کا آغاز رضامندی سے ہوا، ونگ کمانڈر افضل کی زبانی نقل ہوا ہے:

''جس ملک میں چڑیا پر مارنے سے پہلے امریکی اجازت حاصل کرے وہاں یہ کیسے ممکن ہے کہ لوگ مہینوں کی دھوپ میں مارے مارے پھریں اور ان کے سر پر امریکہ کی نیک خواہشات کا سایہ نہ ہو۔ ایران کی افغانستان ترقی سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ حالت ماتحتی سے نکل کر خود انحصاری کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ جب کوئی ترقی پزیر ملک اس منزل کو پہنچنے والا ہو تو اسے سو سال پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے۔'' (ص ۳۶۲)

شاہ کے خفیہ محکمہ تعذیب (ساواک) کے ظلم وستم کی کہانی ایک شاعر کی زبانی (ص ۲۴۷) پر بیان ہوئی ہے۔ شہنشاہیت کے خلاف جدوجہد کی آخری منزل کا بیان یوں ہے: ''عوام اس میدان میں شاہنامہ کا آخری باب تحریر کر رہے ہیں۔ آج شام تک اس باب کے کئی مصنف بہشت زہرا کے حق دار ہو چکے ہوں گے۔'' (ص ۲۲۱)

ایران کے ذہن ساز انقلابی دانش وروں کی طویل فہرست میں چار افراد مصنف کے نزدیک نمایاں ترین ہیں۔ شریعتی مطہری، صادق ہدایت اور جلال آل احمد ان میں سے اولا لذکر دو افراد کے افکار مصنف کے لیے زیادہ دامن کش ثابت ہوئے۔ ایرانی انقلاب میں جس واحد شخص کی فکر نے بالاتفاق سب سے زیادہ اثر ڈالا

ہے وہ ڈاکٹر علی شریعتی کی شخصیت ہے۔ ان کی صرف تین سالہ خطابی و عملی جدو جہد نے ایران کی قسمت بدل دی۔ شریعتی کی ایک فکر انگیز تقریر کا خلاصہ چار صفحات میں درج ہے۔ جس کی ہر سطر چشم کشا اور فکر انگیز ہے۔

(ص ۴۳۱۔۴۲۸)

انقلاب کے مثبت اور تعمیری پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تاریخ حصوں پر بھی بڑے خوب صورت اشارے ہیں۔ آمد نامہ کے عناوین خود اس کی بہترین شہادت ہیں اور آخری باب (آخر کار) میں ایک نوجوان انقلابی کے سامنے کی گئی تقریر اس کا راست بیان ہے۔ (ص ۴۸۷۔۴۸۵)

فارسی زبان پر مصنف کی غیر معمولی قدرت کا اندازہ فارسی نظموں اور بیانات کے کوب صورت ترجموں سے ہوتا ہے۔ اس کے لیے منظر نامہ کے ابواب اشعار وافکار بطور خاص لائق مطالعہ ہیں۔ انگریزی زبان کے مفرد و مرکب الفاظ فارسی مترادفات لطف دے جاتے ہیں اور یہی حال اردو عبارت میں فارسی اصطلاحات وتراکیب کی پیوند کاری کا ہے۔ قدیم وجدید ادبی رویوں تخلیقی موضوعات واسالیب پر مصنف کی گہری نظر ہے۔ فارسی کی کلاسیکی شاعری اور جدید شاعری کے فرق کو یوں واضح کرتے ہیں:

> پرانا شعر روایت کے قلعہ میں بند ہے۔ نیا شعر آزاد اور کھلی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ وہاں عشق کا روگ چشم بیمار اور گاہے بیمار ذہنیت ہے۔ یہاں خیال تازہ، مضامین نو اور جہان دیگر......غزل کی جگہ نظم نے لے لی ہے۔ رخصت ہوتے وقت غزل، ردیف اور قافیہ کو بھی اپنے ہمراہ لے گئی۔ اب شاعر اپنی عمر اور صلاحیت اس چھوٹے سے حوض میں جسے بحر کہتے ہیں......غوطے لگا کر ضائع نہیں کرتا...... پرانی شاعری دربار کے آس پاس رہتی تھی۔ نئی شاعری کا ٹھکانہ اندرون شہر کے گنجان محلّہ میں واقع ہے۔ جس کے کچھ حصے کچی آبادی پر مشتمل ہے۔ وہ شاعری خیال کی دنیا میں رہتی تھی، یہ حقیقت سے بہت قریب ہے۔ خیالی محبوب کی جگہ عوام، کوچۂ محبوب کی جگہ وطن، قطرۂ اشک کی جگہ لہو کی بوند، نالۂ فراق کی جگہ اعلان جنگ وصال کی جگہ آزادی شعر اس کے لیے عورتوں سے باتیں کرنے کا نام نہیں بلکہ مفاد پرستوں سے اپنے حق کے لیے لڑنے والے دلیر اور دلآور عوام کا قصیدہ ہے۔ شعر محفلِ مشاعرہ کو لوٹ لینے والا شعر نہیں بلکہ رزم گاہ حیات کا رجز، رزمیہ اور حماسہ ہے۔ شاعر کا لہجہ اور تیور دونوں بدل گئے ہیں۔''

ایک جدید ادبی رجحان پر مصنف کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

جو تحریر، تصویر یا عمل نفس مضمون کے لحاظ سے کلاسیک کا مقابلہ نہ کر سکے، اسے جدیدیت کا لیبل لگا کر فضیلت دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ادھر نو کا یہ عالم ہے کہ جس لفظ کے ساتھ لگا دیجیے اس کی تازگی اور توانائی میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ خواہ وہ جوانی ہو بہار ہو مولود ہو کہ مسلم۔'' (ص ۴۱۳)

مختار مسعود کی نظروں سے اکثر سفر نامۂ حج گزرے ہیں۔ وہ انہیں ایسے والہانہ ذوق وشوق اور محویت واستغراق کے عالم میں پڑھتے ہیں کہ اختتام پر حج بدل کی سی آسودگی نصیب ہوتی ہے۔ مگر تمام سفر ناموں سے یہ کیفیت حاصل نہیں ہوتی۔ ممتاز مفتی کے سفر نامہ پر یہ بلیغ تبصرہ دیکھیے:

''خیال تھا کہ مصنف ایک انگلی میری طرف بڑھائیں گے کہیں گے لو اسے پکڑ لو اور پھر سفر میں مجھے ساتھ ساتھ رکھیں گے لیکن مصنف نے میری طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں کی۔ ایک بار اچٹتی نظر بھی نہ ڈالی۔ اتنا کہنہ مشق ادیب اور میرے جیسے دوست اور قاری کے ساتھ یہ بے اعتنائی۔ لبیک ختم ہوئی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ مصنف کے ہاتھ خالی نہ تھے وہ مجھے کیا دیتے۔ انہوں نے خود دونوں ہاتھوں سے قدرت اللہ شہاب کا احرام تھاما ہوا تھا اور وہ بھی اتنی مضبوطی سے کہ شہاب صاحب کا احرام کھل کھل جاتا تھا۔'' (ص ۴۵۷)

مصنف کی رفیقانہ مروت دوست کو خالی ہاتھ کہنے میں مانع ہے۔ وہ ہاتھوں کو احرام شہاب میں مصروف رکھ کر اپنی تہی دامنی کے لیے وجہ جواز تلاش کر لیتے ہیں۔

اس کتاب میں کیا کچھ ہے اب تک محض اس کی چند مثالیں بیان ہوئی ہیں ورنہ امیر وغریب ممالک کے رویے، غربت وپسماندگی کی وجوہ، دعوتوں اور ضیافتوں کی قسمیں، ان میں شرکت کرنے والوں کی نوعیت، آداب طعام وکلام پر دلچسپ نکتے، وزیروں اور سفیروں سے لے کر فنکاروں اور ادیبوں کے تذکرے مختلف حکمرانوں کی تصویریں، جمہوریت وخطابت کے بارے میں کارآمد باتیں، انقلاب کے بعد آنے والی تبدیلیاں، انقلابات عالم کی حشر سامانیاں، ضد انقلاب کے ساتھ کارروائیاں اور ان سب کی بے شمار زیریں لہریں اس میں موجود ہیں۔

بعض مقامات پر ارادی سنسر شپ کی دس درازیاں تکلیف دہ ہو گئی ہیں۔ کاش مصنف کو اس راز داری کی مجبوری نہ ہوتی، اس طرح کے واقعات میں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کا ذکر بھی ہے جس میں اپنے نامکمل جملہ کی تکمیل کا کام تاریخ کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

مسائل کا بصیرت افروز تجزیہ، واقعات میں عبرت کی تلاش لطیف پیرایے میں درس حکمت، تاریخ کے رازہائے سربستہ کا انکشاف، ناگفتنی کو گفتنی بنادینے کا بلیغ اسلوب اس تصنیف کو بے حد پرکشش بنادیتے ہیں۔
(بشکریہ تہذیب الاخلاق: فروری ۱۹۹۷ء)

●▣●

''سیاست تو دراصل انسان کے اجتماعی امور کی تنظیم ہی کا نام ہے۔ یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ انسانی زندگی ایک کل ہے، اس کے حصے بخرے نہیں کیے جاسکتے۔ اس کا ہر شعبہ دوسرے سے تعلق اور واسطہ رکھتا ہے۔ مذہب اور سیاست اس کی زندگی کے اگر دوخانے ہیں تو ان دونوں کے درمیان تال میل اور تعلق ناگزیر ہے۔ عملی طور پر یہ تصور اس طرح غلط ثابت ہوتا ہے کہ اس نعرے کی دہائی دینے والے وزیراعظم پارلیمنٹ اور دیگر ایوانوں میں تو اسی نظریہ کی تکرار کرتے ہیں، لیکن موقع آنے پر قشقہ بھی کھینچا جاتا ہے۔ مندروں میں پوجا بھی کی جاتی ہے اور پنڈتوں کے آشیرواد بھی حاصل کیے جاتے ہیں۔ الیکشنی مقاصد جو سراسر سیاسی مقاصد ہیں، ان کے حصول کے لیے خالص مذہبی جذبات کا استحصال بھی کیا جاتا ہے۔ ایسے حکم رانوں کو تو یہ زیب بھی نہیں دیتا کہ وہ مذہب وسیاست کی علیحدگی کی بات بھی زبان پر لائیں۔

مذہب وسیاست میں تفریق کا یہ تصور کلیسائی نظام کے جابرانہ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوا، لیکن آج کل حقیقت پسندی کی بنیاد پر یہ تصور مضمحل ہو چکا ہے۔ بڑے پیمانے پر مختلف ممالک اس تصور کے غلط ہونے کا اعلان کر چکے ہیں۔ اس صورت حال میں بھی اگر اس فرسودہ تصور کو ہمارے یہاں بار بار دہرایا جاتا ہے تو یہ ہماری نظریاتی پس ماندگی اور مسائل کا مقابلہ کرنے میں ہماری بے بسی کی دلیل تو بن سکتا ہے کسی مسئلہ کا حل اور کسی درد کا مداوا ہرگز نہیں ہوسکتا۔''

(ڈاکٹر منور حسین فلاحی، اداریہ ماہ نامہ رفیق منزل ستمبر ۱۹۸۹ء]

مجھے ہے حکمِ اذاں

[مصنف مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی، ناشر: الفرقان بک ڈپو نظیر آباد لکھنؤ۔ صفحات: ۲۶۴، قیمت ۵۵ روپے۔]

یہ کتاب مولانا سنبھلی کے منتخب علمی، دینی تنقیدی و تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل مضامین کے لیے خارج سے تحریک فراہم ہوئی ہے۔ تاثرات کا تعلق قلب سے ہے۔ اس طرح کے مضامین تنقید و تبصرے سے بالاتر ہوتے ہیں۔ البتہ تنقیدی مضامین زیر تبصرہ آ سکتے ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کی اشاعت کے وقت مضامین پر نظر ثانی کا یا انہیں بغور دیکھنے کا غالباً موقع میسر نہیں آیا اس لیے ''دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو'' ص ۱۴۷ اور تجدد پسندوں کا اقبال ص ۱۵۳ جیسے مضامین بھی اس مجموعہ کی زینت بن گئے ہیں۔ فاطمہ جناح ایوب خاں کے مقابلہ میں صدارتی امیدوار بنیں۔ ان کی حمایت ایک طبقہ نے کی اور اپنے اس اقدام کو شرعی اعتبار سے جائز ٹھہرایا۔ کیا یہ مسئلہ آج بھی زندہ رکھنے کا ہے۔ اس سے ملت کو کون سا فائدہ پہنچے گا؟ یہی حال غلاف کعبہ کے مسئلہ کا ہے یہ وہ مسائل ہیں جن پر اس عہد کے بہت سے اہل علم و قلم نے اظہار خیال کیا تھا لیکن آج اس کی تکرار کی کوئی خاص افادیت سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ عورت کی سربراہی کے عنوان سے جو تحریر ہے وہ دراصل دارالعلوم دیوبند کے ایک فتویٰ کی اصلاح میں اپنے رول کی صراحت ہے۔ دیگر مضامین کے عنوان یہ ہیں: با محمد ہوشیار۔ میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے۔ ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد، عید الاضحیٰ میں قربانی، زفرق تا بقدم، تہذیبِ نو کو عقیدے کی تلاش، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلق کا مسئلہ، سیرت کا جلسہ اور وحدت ادیان کی دعوت، کون سا مسیح بہتر انجیل کا یا قرآن کا؟ کیا شراب حرام ہے؟ قرآن میں تسخیر کائنات کا مطلب، خلائی پروازیں اور قرآن، اسلامی معاشرہ کی رہنمائی میں انفرادی ضمیر کا مقام اور حدیث پرویز۔

اس مجموعہ میں بعض مضامین مفید ہیں اور ہر مضمون کے تحت کوئی نہ کوئی بات ضرور ہی اہم اور قابل توجہ ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود مضمون نگار کے نزدیک ان مضامین کی قدر و قیمت وقتی ہے اسی لیے صرف مقدمہ ہی میں ان کے تعارف پر بس نہیں کرتے بلکہ مضمون کے بعد بھی اس قسم کے اتذار یہ جملے شامل ہو گئے ہیں کہ ''مندرجہ

بالا مضمون میں مذکور...... تجزیہ ۱۵ سال پہلے کے حالات کے مطابق ہے۔ آج اس تجزیہ کی مطابقت میں کہیں کہیں کچھ فرق ضرور محسوس کیا جا سکتا ہے مگر یہ فرق ڈگری کا ہے اصل حال کا نہیں۔ (ص ۹۸) مضمون: ''سیرت کے جلسے اور وحدتِ ادیان کی دعوت'' کے تحت یہ نوٹ ہے۔ اس مضمون کے عنوان کی طرح اس کی تمہید کا تعلق بھی ایک وقتی نوعیت کے مسئلہ سے ہے۔ مگر اصل مضمون اور بحث کا موضوع ''نظریہ وحدت ادیان اور قرآن'' ہے۔ (ص۹۹)

تحریر کی زبان تقریر و خطابت کی زبان سے الگ ہوتی ہے۔ مضامین کا واعظانہ و خطیبانہ لہجہ آج کے علمی و تنقیدی نثر سے میل نہیں کھاتا۔ مناظرانہ اسلوب کی جھلک مزید برآں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ یہ ہے بخاری میں سقیفہ کی تقریروں کا رنگ ص ۲۱۱۔ اٹھایئے قرآن اور پڑھیے سورۂ نور ۲۱۴۔ کھولیے سورۂ المنافقون۔ (ص ۲۱۹) ان کے ماخذ کے عدم اعتماد کا فتویٰ صادر کر دیجیے ص ۲۱۰ سنیے! سننے کے لائق ہے ص ۲۲۵۔ دیکھیے! پھر دیکھیے! فرمایا جا رہا ہے۔ (ص ۲۱۷) ایک اور قابل توجہ پہلو ذیلی و ضمنی مباحث میں بھٹک جانا ہے، یہ کسی علمی تحریر کو زیب نہیں دیتا۔ خیر یہ بات تو بیچ میں سخن گسترانہ آ گئی۔ (ص ۱۶۷) بات کافی پھیل گئی نفس مدعا کو پھر سامنے رکھ لیجیے۔ (ص ۱۸۳) ذیل کے مضمون کا اصل نشانہ تو انکار حدیث کی ایک خاص منطق ہی ہے مگر ضمنی طور پر اس میں خلافت صدیقی کے سلسلہ میں صحابہ کرام کے اختلاف اور حدیث الائمۃ من قریش جیسے اہم مباحث کے سلسلہ میں بعض پہلوؤں سے کافی تفصیلی گفتگو آئی ہے۔ (ص ۱۹۹) ضمنی مباحث پر تفصیلی گفتگو اور ان کے اہم مباحث ہونے سے قطع نظر اس قسم کے اتذار یہ جملے اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ مضمون نگار انہیں اصل موضوع سے غیر متعلق ہی سمجھتے ہیں۔ ترتیب نو میں انہیں وہ الگ کر سکتے تھے۔

بعض مقامات پر انداز بیان غیر رسمی اور سطحی سا ہو گیا ہے۔

> ''یہ ان آیتوں میں سے چار ہیں جو فوری طور سے ذہن میں گھوم گئیں۔ تھوڑا سا وقت صرف کر کے قرآن پاک میں تلاش کی جائے تو اور بہت سی آیتیں اس مفہوم کی بآسانی مل جائیں گے (گی)'' (ص ۱۸۶۔)

گویا ایک علمی مضمون کے لیے قرآن سے مراجعت کی خاطر تھوڑا سا وقت بھی نہیں ہے۔ فوری طور پر ذہن میں گھوم جانے والی آیتوں سے کام چلایا جاتا ہے۔

اس مجموعہ کی ایک نمایاں کمی ہر مضمون کے ذیل میں محض جلد اور شمارہ کا حوالہ ہے جب کہ ماہ و سال کا تذکرہ زیادہ مناسب بلکہ ضروری تھا۔ کس کے پاس اتنی فرصت ہے کہ وہ کاغذ و قلم یا انگلیوں کا کلکولیٹر کی مدد سے مال و سال کا تعین کرے۔ کلام کی تفہیم میں زمانی پس منظر کا تعین بھی اہمیت رکھتا ہے۔ بالخصوص اس وقت جب

کہ مباحث خود اس کی قدامت کی طرف اشارہ کر رہے ہوں۔

آیات قرآنی اور عربی عبارتوں کی تصحیح کا بھی کما حقہ اہتمام ہوا ہے ملاحظہ ہوں صفحات: ۳۹، ۴۹، ۷۰، ۸۹،۱ اور ۹۳ وغیرہ۔

بعض مقامات پر الفاظ کے انگریزی مترادفات یا بعض انگریزی الفاظ کا استعمال بھی غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بعض ترجمے بھی محل نظر ہیں مثلاً لارجمنک کا ترجمہ سر پھوڑ دوں گا۔ قرآن مجید کے ترجمہ میں اتنی آزادی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے محاوراتی ترجمہ کو مستند اہل علم غیر معیاری اور صحت سے بعید قرار دے چکے ہیں۔

ان چند خامیوں سے قطع نظر اس مجموعہ میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں، موضوعات کے اعتبار سے بھی اور اظہار جذبات وتاثرات کے اعتبار سے بھی۔ با محمد ہوشیار اور اسلامی معاشرے کی رہنمائی میں انفرادی ضمیر کا مقام بطور خاص لائق مطالعہ ہیں۔ مناظراتی ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لیے اس مجموعہ میں دل چسپی کا سامان موجود ہے۔ (بشکریہ تحقیقات اسلامی، جنوری۔ مارچ ۱۹۹۲ء)

اطلاع

ادارہ حیات نو یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہے کہ ماہ نامہ حیات نو کا آئندہ شمارہ (جنوری ۲۰۲۱ء) ''**میڈیا اور مسلمان: اعتراضات کا جائزہ**'' کے عنوان سے خصوصی گوشے پر مشتمل ہوگا۔

جملہ فلاحی برادران اور وابستگانِ فلاح سے گزارش ہے کہ وہ مذکورہ عنوان پر اپنی نگارشات جلد از جلد ادارہ کو ارسال فرمائیں۔

[مدیر]

Email: jareedahayatenau@gmail.com

Mob:9927206518,8287025094

حیات نامہ ڈاکٹر منور حسین فلاحی

نام : ڈاکٹر منور حسین (یکم جولائی ۱۹۵۹ء-۱۸ر ستمبر ۲۰۰۰ء)

والد گرامی : جناب انور الحقؒ

والدہ : محترمہ سیدہ خاتون

اہلیہ : پروین کوثر

اولاد : ہاجرہ خاتون، زہرہ خاتون، نافعہ منور، معظم حسین، اعظم حسین

اساتذہ : **موجود:** مولانا سلامت اللہ اصلاحی، مولانا عنایت اللہ سبحانی، مولانا ظفر احمد الاثری، مولانا رحمت الاثری، مولانا نظام الدین، اصلاحی، مولانا عمران فلاحی، ماسٹر عبداللہ۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر ظفر عباس نقوی اور پروفیسر نادر علمی۔

وفات پاچکے: مولانا جلیل احسن ندوی، مولانا عبدالحسیب اصلاحی، مولانا صغیر الحسن اصلاحی، مولانا شبیر احمد اصلاحی، ماسٹر مناظر احسن (معاشیات)، ماسٹر اکرام الدین احمد (ایجوکیشن، پولیٹیکل سائنس)، ماسٹر افضال مشہدی (انگلش)۔

آبائی وطن : پیر الطیف، ضلع کھگڑیا، بہار-۸۵۱۲۱۲

لکچرار : شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹ر دسمبر ۱۹۹۲ء تا ۱۸ر ستمبر ۲۰۰۰ء

عالمیت : ۱۹۷۴ء، فرسٹ ڈویژن، فضیلت: ۱۹۷۶ء، فرسٹ ڈویژن، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

بی اے آنرز (اردو): ۱۹۸۴ء، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، فرسٹ ڈویژن

ایم اے اردو: ۱۹۸۶ء شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ڈسٹنکشن

بی۔ٹی۔اے۔: ۱۹۸۶ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ایم فل : ۱۹۸۸ء، عنوان مقالہ: مولوی چراغ علی کی علمی خدمات، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، زیر نگرانی: پروفیسر، منظر عباس نقوی

پی ایچ. ڈی.: ۱۹۹۲ء، عنوان مقالہ: اردو میں علمی نثر (۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک)، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، زیر نگرانی: پروفیسر منظر عباس نقوی

یو جی سی NET: ۱۹۸۶ء، اور ۱۹۹۰ء میں جونیر فیلوشپ، یو. جی سی، نئی دہلی

علمی وادبی سرگرمیاں

۱-ایڈیٹر، رفتار، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سالانہ میگزین، ۱۹۹۸ء-۱۹۹۷ء اور ۹۹-۱۹۹۸ء (دوبار)

۲-ممبر مجلس ادارت، اردو بک ریویو، نئی دہلی

۳-ایڈیٹر، علی گڑھ میگزین (اردو)، ۱۹۸۶ء-۱۹۸۵ء

۴-ایڈیٹر رفیق منزل، اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن کا ماہانہ ترجمان، نئی دہلی (دسمبر ۱۹۸۷ء-دسمبر ۱۹۹۰ء)

۵-معاون اسسٹنٹ ایڈیٹر تحقیقات اسلامی، علی گڑھ

دینی وتحریکی سرگرمیاں

۱-تاسیسی ممبر اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا

۲-زیڈ. اے. سی، ایس آئی او (۸۵-۱۹۸۳ء)

۳-سکریٹری ایس آئی او، حلقہ یوپی (۸۵-۱۹۸۳ء)

۴-صدر ایس آئی او حلقہ یوپی (۸۷-۱۹۸۵ء)

۵-رکن جماعت اسلامی ہند، (۱۵/جنوری ۱۹۸۹ء)

مطبوعہ کتب

۱-مولوی چراغ علی کی علمی خدمات، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۷ء

۲-اردو میں علمی نثر (۱۹۱۴ء-۱۸۵۷ء) (سماجی علوم کے حوالے سے)، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی

مطبوعہ مقالات

۱-جوش کی شاعری میں ترقی پسند عناصر، آہنگ سر سید، علی گڑھ، ۱۹۸۸ء

۲-گجرات میں اردو کا ارتقاء، علی گڑھ میگزین، ۱۹۸۹ء/ ۲۶۵-۲۷۶

۳-مغربی علوم سے اردو میں تراجم کا مسئلہ، ضیاء میگزین، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء

۴-شیو برت لال ورمن کے افکار کا جائزہ، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اپریل-جون ۱۹۹۲ء
۵-بیسویں صدی میں اردو نثر کے اہم رجحانات، قومی آواز، لکھنؤ، سنڈے ایڈیشن، ۲۴/اکتوبر ۱۹۹۳ء
۶-اردو زبان منفی رجحانات کے زیر سایہ، حیات نو، اعظم گڑھ، جون ۱۹۹۵ء
۷-اقبال کی نظم 'سرگزشت آدم'-ایک مطالعہ، فکر و نظر، علی گڑھ، جنوری-مارچ ۱۹۹۵ء/ ۷۵-۷۹
۸-تدریس کے بعض مسائل، علی گڑھ میگزین، ۸۵-۱۹۸۶ء/ ۶۷-۷۳
۹-نظیر اکبر آبادی نظم اردو کی روایت میں، پاسبان، چنڈی گڑھ، نومبر ۱۹۸۶ء
۱۰-فردوس بریں ایک مطالعہ، سرسید ہال، ریویو، ۱۹۸۷ء
۱۱-انشائیہ کیا ہے؟، ضیاء میگزین، علی گڑھ، ۱۹۸۸ء
۱۲-اقبال کی غزل گوئی، پاسبان، چنڈی گڑھ، جنوری ۱۹۹۰ء
۱۳-عصر حاضر میں سرسید کی معنویت، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، مارچ تا مئی ۱۹۹۶، ۳۳/۲، ۱۱۹-۱۳۰
۱۴-رشید احمد صدیقی کی تنقید اقبال، فکر و نظر، علی گڑھ، جنوری-مارچ ۱۹۹۶ء، نیز اقبالیات (اردو)
اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان، جنوری-مارچ، جولائی ستمبر ۱۹۸۸ء
۱۵-غالبؔ کا طرزِ تحریر، مرزا غالب کالج گیا کا یادگاری مجلّہ، ۱۹۹۵ء
۱۶-موجودہ نظام تعلیم-مقصد و منہاج، تہذیب الاخلاق، ستمبر ۱۹۹۶ء/ ۹-۱۲
۱۷-شعبہ اردو میں تحقیق کی صورت حال، قومی آواز، نئی دہلی سنڈے ایڈیشن، ۱۷، ۲۴/نومبر ۱۹۹۶ء
۱۸-اسلام کے عطا کردہ بنیادی حقوق اور صلاح الدین، تبصرہ: مترجمین: تہذیب الاخلاق، دسمبر ۱۹۹۶ء/ ۲۰-۲۶

مطبوعہ تبصرے

۱-سیرتِ حضرت زبیر بن عوامؓ، رفیق منزل، نئی دہلی، مئی ۱۹۸۸ء
۲-نظریہ ادب اور ادیب، رفیق منزل، نئی دہلی، جون ۱۹۸۸ء
۳-انٹرنیشنل انسائیکلو پیڈیا آف انڈین لٹریچر ج ۴، رفیق منزل، نئی دہلی
۴-عہد نبویؐ کا نظام حکومت، قومی آواز، نئی دہلی سنڈے ایڈیشن
۵-راستے کی تلاش، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۱۹۹۴ء
۶-ایرانی تصوف، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جنوری-مارچ ۱۹۹۵ء

۷- مجھے ہے حکم اذاں، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اکتوبر- دسمبر ۱۹۹۵ء
۸- تشنہ تشنہ (مجموعہ کلام)، اردو بک ریویو، نئی دہلی، جنوری، فروری ۱۹۹۶ء
۹- اشاریہ مصنّفین، علی گڑھ میگزین عالمی فکشن نمبر، ۴- ۱۹۹۵ء
۱۰- ایم فل/ پی ایچ ڈی مقالوں کا تعارف، رفتار، شعبہ اردو، اے. ایم. یو، ۴- ۱۹۹۵ء
۱۱- حسرت موہانی پر کچھ باتیں، قومی آواز، نئی دہلی، ۴ر اگست ۱۹۹۶ء
۱۲- لوحِ ایام، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، فروری ۱۹۹۷ء، ۱۵- ۱۸
۱۳- توضیحی اشاریہ شخصیات کلیات اقبال، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی

سمینار میں پیش کردہ مقالات

۱- علمی نثر، تعریف اور تقاضے، شعبہ کی ریسرچ ایسوسی ایشن کے اجلاس میں
۲- سرسید سے پہلے علمی نثر کی صورت حال، شعبہ کے ریسرچ ایسوسی ایشن کے اجلاس میں
۳- مقالات شبلی جلد اول- ایک مطالعہ، شبلی سمینار، منعقدہ علی گڑھ
۴- برصغیر اور نشاۃ ثانیہ، ادب اور نشاۃ ثانیہ پر منعقد سمینار، مارچ ۱۹۹۵ء
۵- جمیل مظہری کی نظمیں، جدید نظم سمینار، منعقدہ علی گڑھ، ۶، ۷ر جنوری ۱۹۹۷ء
۶- اردو میں بچوں کا ادب- ایک عمومی جائزہ، اسلامیہ کالج، وانم باڑی میں منعقد سمینار کے لیے
۷- عصر حاضر میں سرسید کی معنویت، شعبہ کی طرف سے منعقد اجلاس میں، ۱۶ر اکتوبر ۱۹۹۵ء
۸- اقبال کی شاعری میں قرآنی تشبیہات واستعارات، AIMSUS کی طرف سے کل ہند تحریری مقابلہ کے لیے
۹- اقبال اور مغربی تہذیب، AIMSUS کی طرف سے کل ہند تحریری مقابلہ کے لیے
۱۰- اردو میں بچوں کا ادب ایک عمومی جائزہ، وانم باڑی میں منعقد سمینار کا مجموعہ مقالات
۱۱- برصغیر اور نشاۃ ثانیہ، آج کل نئی دہلی

حیاتِ نو

خوش خبری

مقابلہ مضمون نویسی

جریدہ حیات نواپنے قارئین کو یہ خبر دیتے ہوئے خوشی محسوس کررہا ہے کہ فروری 2021 کا شمارہ ان شاء اللہ انعامی مقابلہ میں شامل معیاری مقالات پر مشتمل ہوگا۔

جامعۃ الفلاح، کلیۃ البنات، اوراس کے تمام ملحق اداروں میں زیر تعلیم عالمیت اور فضیلت کے طلبہ وطالبات اس میں حصہ لے سکیں گے۔ بشرطیکہ وہ 5/فروری 2021 تک مندرجہ ذیل دوعنوانات میں سے کسی ایک پر اپنے مقالے جمع کردیں۔

عنوانات

1۔ فقہی مسالک اور مسلم جماعتوں کے درمیان افہام وتفہیم

2۔ قرآن مجید پر غیر مسلموں کے اعتراضات اوران کے علمی وعقلی جوابات

انعامات

1۔ انعام اول دس ہزار (10000) روپے

2۔ انعام دوم آٹھ ہزار (8000) روپے

3۔ انعام سوم پانچ ہزار (5000) روپے

4۔ ایک ہزار (1000) روپے کے 3 تشجیعی انعامات

5۔ ایک سال کے لیے جریدہ حیات نو چھ (6) دیگر مقالہ نگاران کی خدمت میں پیش کیا جائے گا، جن کے مقالات معیاری ہوں گے

شرائط

1۔ انعام یافتہ مقالات ادارہ کی ملکیت ہوں گے۔

2۔ مقالہ اوریجنل ہونا چاہیے۔ بلا اجازت دوسری جگہ شایع کرنا اخلاقی جرم تصور کیا جائے گا۔

3۔ مقالہ A4 سایز، ان پیج میں 15 فونٹ پر، زیادہ سے زیادہ 8 صفحات میں ہو، جس کی پی ڈی ایف جمع کرنا لازمی ہے۔ ہاتھ کا تحریر کردہ مقالہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

4۔ جج صاحبان کا فیصلہ حتمی ہوگا۔

5۔ مقالہ کے ساتھ مکمل پتہ اور مادرِ علمی کا شناختی کارڈ یا مارک شیٹ منسلک کرنا لازمی ہے۔

مزید تفصیلات کے لیے رابطہ کریں

ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی، مدیر

موبائل: 9927206518 | 8287025094

ای میل: jareedahatatenau@gmail.com
ziauddin.malik.falahi@gmail.com

مڈل ایسٹ میں ملازمت کے خواہش مند حضرات کے لیے
ایک قابل اعتماد ادارہ

الھند فارن سروس ایجنسی

- اگر آپ میڈیکل لائن سے متعلق ہیں
- اگر آپ کوئی ہنر جانتے ہیں
- اگر آپ صرف پڑھے لکھے ہیں اور آپ کے پاس کوئی ہنر نہیں ہے
- اگر آپ کا کسی ہوٹل انڈسٹری سے تعلق ہے
- اگر آپ عام لیبر یا مزدور ہیں

تو آپ اپنے پاسپورٹ کی کاپی، فوٹو اور بائیوڈاٹا ہمیں بھیج دیجیے......اور
دیگر تفصیلات کے لیے ہماری اطلاع کا انتظار کیجیے۔

وكالة الهند للخدمات الأجنبية

AL-HIND FOREIGN SERVICE AGENCY

Registration No.: B-0376/DEL/PER/1000+/5/1263/1984

Head Off: No. 73, Main Road, Near SBI
Zakir Nagar, New Delhi-110 025 (India)
E-mail: info@al-hind.com

Ph : 0091 - 11 - 26983980, 26983981
0091 - 11 - 26988375 / 76
Fax: 0091 - 11 - 26983982

Web: www.al-hind.com

Branch Office: 38, G.F. Ashoka Shopping Complex, Near G.T. Hospital
L.T. Road, Mumbai - 400 001 (India)
Ph. : 0091-22-22652906 Fax: 0091 - 22 - 22652910

With best compliments from

ADHAM ALI
Managing Director

+91-9821 03 2562

Swaidan
MANPOWER CONSULTANTS

Regn. No. B0513/MUM/PER/1000+/10/8522/2009

Real Tech Park, 1013, 10th Floor, Sector 30/A
Near Vashi Railway Station, Vashi
New Mumbai-400703 (India)
Tel: +91-22-66441600, Fax: +91-22-66441688
E-mail: admin@swaidan.in
Website: www.swaidan.in

ISBN : 978-93-84354-42-8

Rs. 100/-

ایمانیات

عبادات

تزکیہ وتربیت

سیرت الانبیاء

اسلامی ثقافت

دعائیں

▪ Urdu ▪ English ▪ Kannada ▪ Telugu ▪ Gujrati ▪ Tamil

اسلامی معلومات

آپ کی ضرورت—آپ کی شناخت

آپ کی رہنمائی کے لئے

جس میں قران ومستند احادیث کے ذریعے

- احکام و شرائع - مواعظ و قصص
- عقائد و ایمانیات - آداب و اخلاق

کوانتہائی آسان اور منفرد اسلوب
میں بیان کیا گیا ہے۔

اسلامی علوم کا خزانہ بس
ایک کلک کی دوری پر

WWW.UZAIRFALAHI.COM